سندھ پنجاب

تضاد

تحریکِ پاکستان سے عہدِ حاضر تک

رشید جمال

بسم الله الرحمن الرحيم

سندھ پنجاب تضاد

تحریک پاکستان سے عہد حاضر تک

رشید جمال

ضابطہ

کتاب: سندھ پنجاب تضاد

تحریک پاکستان سے عہد حاضر تک

مصنف: رشید جمال

اشاعت اول: مارچ 2004ء

قیمت: 200 روپے

رابطے کیلئے

E.mail:sindhibook@yahoo.com

مہران پبلی کیشن : اسٹیشن روڈ، اخبار مارکیٹ، حیدرآباد، سندھ

انتساب

زبدة العارفین، قدوة السالکین، سرتاج الشعراء
حضرت سید شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ کے نام
جن کی ذات بابرکات کی بدولت ریگزار سندھ میں
تجلیات الٰہی اور انوار محمدی کی ضیاء پاشی ہوتی رہی
جن کی رشد و ہدایات، کشف و کرامات اور
علوم و فیوض کا سرچشمہ آج تک جاری و ساری ہے۔

شاہ صاحب ذوالمناقب سیدی عبداللطیف
آں کہ قطب وقت خود بو دست در مردان حق
چوں زجام ارجعی مخمور نوش وصل شد
گفت ملہم غیب سال رحلتش رضوان حق

سندھ پنجاب تضاد

تحریک پاکستان سے عہد حاضر تک

فہرست

باشعور قومیں کبھی حقائق سے نظر نہیں چراتیں

☆.................الطاف حسین

تاریخ، ماضی یعنی گزرے ہوئے وقت کے احوال کا نام ہے۔ ماضی کو بدلا نہیں جاسکتا لیکن ماضی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ماضی کو سمجھ کر حال کے معاملات کو بہتر انداز میں جانا جاسکتا ہے کیونکہ حال، ماضی کا ہی تسلسل ہوتا ہے۔ ماضی میں کیا کھویا کیا پایا، کیا غلطیاں کیں، کون کون سے اچھے کام کیے، ان کا بغور جائزہ لینے کے بعد حال کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی حکمت عملی اور منصوبہ بندی ترتیب دی جائے جس میں ماضی کی غلطیوں کا اعادہ نہ ہو اور ماضی کے اچھے مثبت کاموں کو سامنے رکھ کر جدید تقاضوں اور حقیقت پسندی وعملیت پسندی (Realism and Practicalism) کے فلسفے کے مطابق ایسی ٹھوس جامع بندی اور حکمت عملی ترتیب دی جاسکتی ہے جس سے مستقبل میں بہتر سے بہتر نتائج حاصل کیے جاسکیں۔

باشعور اور زندہ قومیں کبھی حقائق سے نظریں نہیں چراتیں چاہے وہ کتنے ہی تلخ اور تکلیف دہ کیوں نہ ہوں کیونکہ حقائق سے نظریں چرا کر انسان کسی اور کو نہیں بلکہ خود کو دھوکہ دیتا ہے اور خود کو دھوکہ دینے والی قومیں کبھی بھی ترقی وفلاح کی مضبوط اور بلند سیڑھیوں پر نہیں چڑھ سکتیں۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے یہاں حقائق کا سامنا کرنے کا نہ تو رواج ہے اور نہ ہی حوصلہ ہے۔ اگر کوئی سچائیاں بیان کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اسے پتھر مارے جاتے ہیں۔

حقائق کو جذباتی نعروں کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے اور جو بھی پردہ اٹھانے کیلئے آگے بڑھتا ہے اسے قابل گردن زنی قرار دے دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں تحقیق وجستجو کا عمل تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے اور دلائل کا جواب دلائل سے دینے کے بجائے گالی اور گولی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

حقیقت پسندی و عملیت پسندی (Realism and Practicalism) کا تقاضہ ہے کہ ہم ماضی کے تاریخی حقائق کا بے لاگ اور غیر جذباتی جائزہ لیں۔ حقائق خواہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں ان کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی روشنی میں نہ صرف حال کو سمجھیں بلکہ ان حقائق کی روشنی میں اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کیلئے عملی کوششیں بھی کریں۔ جن قوموں نے اس فلسفہ پر عمل کیا وہ آج دنیا میں ترقی کے عروج پر ہیں۔

نوجوان اور ہونہار مصنف رشید جمال صاحب نے اس کتاب میں ہمارے ماضی کے ٹھوس حقائق کو بہت جامع انداز میں ہمارے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے جو بے پناہ محنت اور تحقیق کی اس کا اندازہ کتاب پڑھ کر بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

یہ ایک علمی و تحقیقی بحث ہے۔ اس کتاب میں درج بہت سی باتوں سے لوگوں کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن علمی و تاریخی بحث اسی طرح آگے بڑھتی ہے کہ دلیل کا جواب دلیل اور تحقیق کا جواب مزید تحقیق سے دیا جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ دیگر اہل علم بھی اس موضوع پر اپنا قلم اٹھا کر مزید حقائق کو سامنے لائیں گے اور اس طرح چراغ سے چراغ جلے گا۔

میں رشید جمال صاحب کو ان کی محنت پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ان کا قلم ہمیشہ سچ ہی لکھتا رہے۔

دعا گو

الطاف حسین

لندن

بحث ومباحثہ کے بغیر معاشرہ جامد ومردہ ہوجاتا ہے

☆ ....ڈاکٹر عمران فاروق

آج کے پاکستان کی صورتحال کو سمجھنے کیلئے ہمیں اس خطہ کے ماضی کی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں کی صورتحال کیا تھی؟ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں کس کا کیا کردار تھا اور قیام پاکستان کے بعد ان کرداروں نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔ غرضیکہ پاکستان کی آج کی صورتحال کو سمجھنے کیلئے ماضی کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح کسی بیماری کی وجہ جاننے کیلئے مریض اور بیماری کی تاریخ جاننا ضروری ہوتا ہے۔

محترم رشید جمال صاحب، ہمارے ملک کے ایک معروف قلمکار اور مصنف ہیں جنہوں نے اس سے پہلے بھی بہت سی اچھی اچھی کتابیں تحریر کی ہیں لیکن زیرنظر کتاب واقعتاً ایک مختلف اور منفرد کتاب ہے۔ رشید جمال صاحب نے جس قدر محنت وجانفشانی سے بھرپور تحقیق کر کے حقائق ودستاویزات کو اس کتاب کی شکل میں جمع کیا اس کا اندازہ کتاب کو پڑھ کر بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

ہر کتاب کے مندرجات کی طرح اس کتاب میں تحریر شدہ باتوں سے اختلاف کرنا ہر کسی کا حق ہے لیکن اس کے باوجود مصنف کی محنت کی داد نہ دینا یقیناً زیادتی ہوگی۔ بحث ومباحثہ، تحقیق وتفتیش اور اختلاف واتفاق ہر زندہ اور جیتے جاگتے معاشرہ کیلئے دل کی دھڑکن کی

حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر معاشرہ جامد و مردہ ہو جاتا ہے۔ امید ہے رشید جمال صاحب کی یہ کتاب ایک ایسے صحت مند بحث و مباحثہ کو جنم دینے کا باعث بنے گی جس کا مقصد ماضی کو معروضی انداز میں سمجھ کر اپنے حال اور مستقبل کو بہتر بنانا ہو۔

آخر میں محترم رشید جمال صاحب کو ان کی تحقیق اور تحریر پر دلی مبارکباد

ڈاکٹر عمران فاروق

کنوینئر

متحدہ قومی موومنٹ

لندن

کچھ اس کتاب کے بارے میں

تاریخ ایک سائنس ہے۔ اس کا مطالعہ معروضیت اور حقائق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس میں ذاتی پسند یا ناپسند کا کوئی دخل نہیں اور نہ ہی ذاتی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر حقائق کو مٹایا اور بھلایا جا سکتا ہے۔ تاریخ وہ کڑوا سچ ہے جسے اس کی تمام تر سچائی اور حقیقت کے ساتھ قبول کر لینا ہی ملک اور قوم کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ وہ قومیں جو اپنے ماضی اور اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہیں وہ قومیں صفحہ ہستی سے ہی مٹ جاتی ہیں۔

تحریک پاکستان کی تاریخ خود پاکستان کے وجود کا جواز ہے۔ اسے ہم جس قدر دیانت اور تفصیل کے ساتھ محفوظ کریں گے' نئی نسلوں کے ذہنوں میں پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت اتنی ہی واضح ہوگی۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان میں ایک طبقہ نے غیر حقیقی تصورات ونظریات کو فروغ دے کر تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کی ایسی توجیہات بیان کی جو ان کے ذاتی اور سیاسی مفادات کے مطابق تھیں' اس طبقے نے تحریک پاکستان کی تاریخ کو مسخ کرتے ہوئے اصل حقائق کو ہی کہیں گم کر دیا۔ انہوں نے بانیان پاکستان کی تاریخ ساز اور انمٹ قربانیوں' جدوجہد اور خدمات کو فراموش کرتے ہوئے ان لوگوں کو تحریک پاکستان کا ہیرو بنا کر قوم کے سامنے پیش کیا جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہی طبقہ آج ''اسلامی نظام کا نفاذ'' ''نظریہ پاکستان'' ''اسلامی نظام کی تجربہ گاہ'' ''نظریاتی مملکت'' ''نظریاتی سرحدوں'' ''مستحکم اور مضبوط مرکز'' کی اصطلاحوں کا علمبردار بن کر پاکستان کا ٹھیکیدار بنا بیٹھا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا بنیادی مقصد تاریخ کے اوراق سے حقائق ڈھونڈ کر قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے اور ان شخصیات اور سیاسی کردار کو سامنے لانا ہے جو صبح و شام پاکستان کی مخالفت کیا

کرتے تھے' جنہوں نے عوامی امنگوں اور خواہشات کے برعکس انگریز سامراج کی ہر لحہ خدمت کی۔ جنہوں نے پاکستان میں فیوڈل سسٹم کی جڑیں مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد اس فیوڈل طبقہ نے اقتدار اور پارلیمنٹ میں بالا دست حیثیت حاصل کرلی۔ اس طبقہ کے بارے میں ممتاز شاعر محسن بھوپالی نے لکھا تھا۔

نیرنگئی سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

کتاب کے کسی بھی موضوع کو قلم بند کرنے سے قبل مستند کتابوں کے حوالوں' سرکاری دستاویزات' ریکارڈ اور رپورٹوں سے مدد لی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کا زیادہ تر حصہ تحقیق' تصدیق اور تالیف پر مشتمل ہے۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے' کسی شخصیت کی کردار کشی کرنے' کسی قسم کے تعصب اور عصبیت کی عینک لگانے کی بجائے پوری دیانت داری' ایمانداری اور سچائی کے ساتھ تحریف سے ہر ممکن احتیاط کرتے ہوئے حوالوں میں عبارت کو من وعن نقل کیا ہے تا کہ کسی قسم کی غلط فہمی' بدگمانی' ابہام یا بد نیتی کا شبہ نہ ہو۔ کتاب کے کسی بھی حصہ کو متنازعہ بنانے کی بجائے میرا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ماضی کے حقائق کو تاریخ کے سنجیدہ طالب علموں' دانشوروں' صحافیوں کے سامنے من وعن رکھ دیا جائے تا کہ وہ ماضی' حال اور مستقبل کے تاریخی حقائق سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے درست سمت کا تعین کر سکیں۔

تین سال کی شب وروز کی محنت و کاوش کے بعد زیر نظر کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں' میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔ اس کا فیصلہ یقیناً قارئین بہتر انداز میں کریں گے کیوں کہ وہ ہی سچے منصف اور نقاد ہوتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کی تکمیل کیلئے جن دوستوں اور احباب نے قدم قدم پر محبت اور شفقت سے میری رہنمائی اور معاونت فرمائی ہے ان کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں

رشید جمال

مارچ 2004ء

مقدمہ

قائد ملت لیاقت علی خان نے فرمایا تھا

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے پاکستان کیوں حاصل کیا تھا؟ ہم نے پاکستان کے حصول کی کیوں کوشش کی تھی؟ جس صورت میں کہ اس قدر جانیں قربان کی جا چکی ہیں اور لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو کرب واذیت کی پرہول وادیوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ سوال اور بھی اہم بن جاتا ہے کہ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض افراد قوت واختیار، دولت واقتدار کے خواہاں تھے؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک گروہ دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا اور فائدے اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتا تھا یا یہ کہ بے چارے عوام کی زندگی اسی پرانی مفلسی اور احتیاج کا شکار ہے اور ان غریبوں کو حد سے حد تک مکمل ناکامیوں اور نامرادیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر ایسا ہے تو یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ہم نے تمام قربانیاں بے کار اور عبث کی ہیں۔ لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

آزادی کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق بود و باش اور غور وفکر کی آزادی حاصل ہو۔ مذہبی، ثقافتی اور اقتصادی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی اور بے مصرف شے ہے۔ پاکستان اس لئے وجود میں آیا کہ ایک

ایسا نظام معیشت قائم کرنا چاہتے تھے جو انصاف' مساوات اور اخوت انسانی پر مبنی ہو۔ دیگر الفاظ میں ایسا نظام معیشت ہو جس میں کوئی اندرونی مناقشات موجود نہ ہو۔ جس میں مزدور کو اپنی محنت کا جائز صلہ مل سکے۔''

ان بنیادی مقصد کی تکمیل کے لئے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا قیام عمل میں آیا مگر دو فیصد مراعات یافتہ طبقہ نے نظریہ پاکستان اور حصول پاکستان کے مقصد سے انحراف کرتے ہوئے معاشی اور اقتصادی ناہمواری میں شدید اضافہ کیا۔ امیر' امیر تر بن گئے اور غریب پہلے سے بھی زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔ دولت کم سے کم ہاتھوں میں مرتکز ہوتی گئی۔ اس دولت سے اشرافیہ طبقہ نے جنم لیا جس کی گرفت ملکی معیشت پر مستحکم ہوگئی اور چند خاندانوں کا ملکی معیشت اور عوام پر اس قدر وسیع اختیار حاصل ہوگیا کہ سماجی انصاف کے اصولوں کی نفی ہونے لگی۔ پاکستان میں 5 کروڑ افراد غربت کی حد سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یعنی کہ پاکستان کا ہر تیسرا فرد اقتصادی بدحالی سے دوچار ہے ایک کروڑ بچے صرف پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر جبری مشقت کرنے پر مجبور ہیں۔ اسٹیٹ بینک نے اپنی سالانہ رپورٹ میں غربت کی سطح سے کم تر زندگی گزارنے والوں کی تعداد کا تخمینہ آبادی کا 33 فیصد بتایا ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں انسانی وسائل کے فروغ میں تیزی سے کمی واقع ہوئی ہے اور کل آبادی کا 19 فی صد ضروری غذائی اشیاء سے محروم ہیں۔ کل آبادی کے 56.6 فیصد لوگوں کی آمدنی صرف دو ڈالر یعنی 114 روپے روانہ سے کم ہے۔ 34 فیصد بچوں کو تعلیم کو سہولتیں دستیاب نہیں۔ پیدائش کے وقت موت سے ہمکنار ہونے والے بچوں کی اموات کی شرح ایک لاکھ میں 200 سے بڑھ کر 400 ہوگئی ہے۔ جبکہ پیدائش کے بعد مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار میں 84 ہو چکی ہے۔ نوجوانوں کی بے روزگاری کی شرح 13 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد مغربی پاکستان کے ماہر اقتصادیات اور معاشیات یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی معیشت پر بوجھ ہے۔ مشرقی پاکستان کو الگ کئے

بغیر مغربی پاکستان ترقی نہیں کر سکتا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بنگلہ دیش نے تعلیم، صحت، معیشت اور دفاع سمیت امور مملکت کے تمام ہی شعبوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس انقلابی تبدیلی اور ترقی کی پیچھے ایک ایسا میڈل کلاس طبقہ تھا جس نے قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان سے فیوڈل سسٹم کو جڑ سے ختم کر دیا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان میں فیوڈل سسٹم کی جڑیں آج بھی بہت مضبوط اور گہری ہیں۔ جس نے پاکستان کے معاشی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی نظام کو گھن کی طرح چاٹ لیا ہے۔ بنگلہ دیش سمیت وہ تمام ممالک جنہوں نے 1947ء کے بعد آزادی حاصل کی، ان میں سے بیشتر ممالک آج ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پاکستان کے حکمرانوں نے اس ملک کو اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں پاکستان کا نام کرپٹ ترین ممالک کی فہرست میں صف اول پر آتا رہا ہے۔ وطن عزیز کے حکمران ''سوئز بینک اور سرے محل'' کی وجہ سے خود بھی بدنام ہوئے اور ملک کی شہرت کو بھی داغ دار کیا۔ کئی حکمران قومی دولت کو بیرون ملک منتقل کر کے خود بھی امریکہ، برطانیہ، سعودی عرب میں عالی شان محلات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ جب کہ اس ملک میں کروڑوں افراد سرکاری اسپتالوں میں علاج کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ پاکستان کی 14 کروڑ عوام کے لئے ملک بھر میں صرف 865 اسپتال، 4523 ڈسپنسریاں اور 5121 بنیادی مرکزی صحت کے سینٹر ہیں۔ رجسٹرڈ ڈاکٹروں کی تعداد 78470، دانتوں کے ڈاکٹروں کی تعداد 3159 ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 824 افراد کے لئے ایک ڈاکٹر ہے۔ 2823 افراد کے لئے ایک دانتوں کا ڈاکٹر اور 5460 افراد کے لئے ایک نرس ہے۔ پاکستان میں بچوں کی شرح اموات دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے یعنی ایک ہزار میں سے 95 بچے پیدائش کے دوران مر جاتے ہیں۔ پانچ سال سے کم عمر بچوں کی اموات کی شرح بھی بہت زیادہ ہے۔ ہر ایک ہزار میں 136 بچے پانچ سال سے کم عمر میں مر جاتے ہیں۔ ہر 10 ہزار ماؤں میں سے 340 زچگی کے دوران مر جاتی ہیں۔ فوت ہونے والے بچوں میں 40 فیصد کی وجہ اموات ملاوٹ شدہ خوراک ہے۔

سرکاری تعلیمی اداروں کی حالت اس سے بدتر ہے۔ شہروں کے مقابلے میں دیہاتوں میں زیادہ ناگفتہ بہ حالت ہے۔ اگر اسکول کی عمارت ہے تو اسٹاف نہیں ہے۔ اسٹاف ہے تو بچوں اور کلاس ٹیچر کے بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ جاگیرداروں اور وڈیروں نے اپنے علاقوں میں تعلیمی اداروں کو پنپنے نہیں دیا۔ دیہاتوں میں آج بھی کئی سرکاری اسکول اصطبل کے طور پر استعمال ہورہے ہیں۔ دیہاتوں میں غریب آدمی بے روزگاری' معاشی بوجھ اور جاگیردار کے خوف سے اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں کرسکتا۔ جس ملک میں تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر ہوں' وہاں خواندگی بڑھانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ پاکستان میں اس وقت کل مڈل اسکول کی تعداد 15909 ہے۔ ہائی اسکول 10004' آرٹ اینڈ سائنس کالج 798' پروفیشنل کالج 294' میڈیکل کالج 26 اور انجینئر کالج صرف 14 ہے۔ دوسری جانب تمام سہولتوں سے آراستہ پرائیویٹ کالج اور یونیورسٹیاں ہیں جہاں مڈل کلاس کے بچے تعلیم حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ملک میں دوہرے معیار تعلیم کی وجہ سے جاگیرداروں' وڈیروں' بیوروکریسی اور بڑے سرمایہ داروں کے بچے پرائیویٹ تعلیمی اداروں سے ڈگریاں حاصل کرکے اہم سرکاری عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں جبکہ ملک کے 98 فیصد عوام کے نصیب میں کلرک اور چپراسی بننا لکھ دیا گیا ہے۔

غریب عوام کی تقدیر اس وجہ سے نہیں بدلی کہ یہاں کے سیاسی اور پارلیمانی نظام میں جاگیردار ہی مسلط رہے ہیں۔ جمہوریت ہو یا فوجی حکومت' پارلیمانی نظام جاگیرداروں کے ہاتھوں میں یلغمار بنا رہا۔ آئین ساز اداروں میں غالب اکثریت اسی طبقہ کی رہی ہے۔ جاگیرداروں اور وڈیروں نے ذاتی اور سیاسی مفادات کی خاطر وفاداری بدلتے وقت کسی اصول' کسی ضابطے' کسی اخلاق' کسی حجاب اور شرم کا پاس نہیں رکھا۔ پارلیمانی اداروں کا ستون وہ جاگیردار گھرانے ہیں جنہوں نے ذاتی اور سیاسی مفادات کی خاطر ''اپنے ضمیر وایمان کا گوشت اسمبلی کی محراب میں لٹکا رکھا ہے۔'' ان جاگیرداروں کا یہ وطیرہ اور اصول رہا ہے کہ وہ حزب

اختلاف کی بنچوں پر بیٹھنے کی بجائے اقتدار کے جھولے میں بیٹھنا ہی پسند کرتے ہیں۔ یہ سیاسی بازی گر کبھی جمہوریت کا نام لے کر کبھی روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر' کبھی اسلام کے نفاذ کے نام پر قوم کو بے وقوف بناتے رہے ہیں اور کبھی اسلامی شریعت نافذ کرنے کی بات کرتے ہیں۔ انہی جاگیرداروں نے ملک میں اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کے لئے بیشتر مذہبی رہنماؤں کو بھی اپنا آلہ کار بنایا ہوا ہے۔ ان مذہبی رہنماؤں نے عوام کو کبھی مذہبی فرقہ واریت اور کبھی مذہبی انتہا پسندی کا درس دیا۔ سنی' شیعہ کے نام پر ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو نذر آتش کیا جاتا ہے۔'' آج بھی یہ ملا اور علمائے سوء جاگیرداروں اور وڈیروں کے کاسہ لیس بن کر عوام کو مذہب کے نام پر بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں'' پاکستان کی بقاء کے لئے جہاں فیوڈل سسٹم کے خاتمہ کی اشد ضرورت ہے وہاں ایسے انتہا پسند اور منافق مذہب رہنماؤں کا بھی قبلہ درست کرنے کی ضرورت ہے جنہوں نے طرح طرح کے فتنے اور فساد اٹھا کر' فرقہ اور گروہ بنا کر عوام کو گمراہ کیا۔ ان مذہبی رہنماؤں نے جاگیرداروں کے اشارے پر عوامی طاقت کو مختلف مذہبی گروہ میں بانٹ کر ان کی طاقت کو تقسیم کر دیا۔ تاکہ عوام فرسودہ جاگیرداری نظام کے خلاف متحد نہ ہو سکیں۔ مذہبی رہنماؤں نے آج تک ملک بھر میں عوامی سطح پر قومی دولت لوٹنے والوں کے خلاف' ملکی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف' فیوڈل سسٹم کے خلاف' فوجی حکمرانوں کے خلاف' فرقہ واریت پھیلانے والے مذہبی ٹھیکیداروں کے خلاف' جہالت کے خاتمہ اور غربت کے خاتمہ کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ یہی مذہبی رہنما مذہب اور جہاد کے نام پر ہزاروں نوجوانوں کو ملک اور بیرون ملک اپنے اور غیروں کے ہاتھ مرواتے رہے ہیں۔

آزادی کے 56 سال گزر جانے کے باوجود بھی ملک کی دیہی آبادی جاگیرداروں اور وڈیروں کے ہاتھوں غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ جاگیردار کی زمینوں اور حویلیوں میں کام کرنے والے انسان آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی غلامی کی زنجیر میں قید ہیں۔ خدا کی اس مخلوق کو جس کی آواز سننے والا کوئی نہیں ہے' اسے بھاری قرضے' معاشی بوجھ' بے روزگاری اور سماجی

رسم ورواج میں اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ وہ دورِ قدیم کے غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ پاکستانی شہریت رکھنے والے لاکھوں بے زبان انسان نہ عدالت کے دروازے پر دستک دے سکتے ہیں اور نہ جاگیردار کے مظالم کے خلاف سر اٹھا سکتے ہیں۔ یہ مظلوم' مجبور' بے بس اور ناچار انسان کئی پشتوں سے جاگیرداروں اور وڈیروں کی غلامی' قرض کے بوجھ اور ذاتی جیلوں میں قید و بند کی اذیتیں برداشت کر رہے ہیں۔ پاکستان کی عوام پر حکمرانی کرنے والا یہ جاگیردار طبقہ وہی ہے جس نے 1857ء کی وفاداری بشرط استواری کے صلے میں زمینیں اور جاگیریں حاصل کی تھیں۔ انہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر انگریزی حکومت کے متزلزل ہونے تک سفید فام آقایانِ دہلی کی ہر طرح اور ہر لمحہ خدمت کی۔ 1857ء کی بیشتر جاگیرداریاں اور زمینداریاں مسلمان بادشاہوں کے ہاتھوں سے حاصل کئے ہوئے وثیقوں پر لی گئی تھیں یا تحریک آزادی کے مجاہدین کی مخبریاں کر کے حاصل کی گئی تھیں۔ ''انگریزوں کی وفاداری میں پنجاب کے جاگیرداروں کا بڑا حصہ ہے جنہوں نے موقع پرستی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک کو دبانے میں اہم کردار ادا کیا۔'' ان جاگیرداروں نے ذاتی مفادات کی خاطر تحریک پاکستان کی بھی مخالفت کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد جاگیرداروں نے قدیم جاگیردارانہ نظام اور موروثی سیاسی قدروں کو زندہ رکھنے کیلئے گھٹیا سودے بازی' بے اصولی' ضمیر فروشی' موقع پرستی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ 1947ء سے 1958ء تک پنجاب کی سیاست پر انہی جاگیرداروں کا قبضہ رہا ہے۔'' راجہ رنجیت سنگھ سے لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک ان کی جبینیں ہر در پر سجدہ ریز رہی ہیں۔ ان جاگیرداروں نے برطانوی سامراج کے ساتھ مل کر ''چیفس آف پنجاب'' کی ایک بہت بڑی کھیپ پیدا کی۔ جو ہر آڑے وقت میں ان کی ہر طرح امداد و اعانت کرتے تھے۔ پنجاب کے مجبور و محکوم عوام خواہش کے باوجود ان جاگیرداروں کے طلسم سامری کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انہی جاگیرداروں کی بدولت برصغیر کی تاریخ میں اس شرمناک باب کا اضافہ ہوا کہ یہاں پاکستان بننے سے پیشتر یونینسٹ کے

مقابل مسلم لیگ کی حکومت قائم نہ ہوسکی۔''

جاگیرداروں نے قیام پاکستان کے بعد قانون ساز اداروں میں اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کے لئے صوبوں کے درمیان بدگمانیاں' اختلافات' نفرتیں اور دوریاں پیدا کیں۔ انہوں نے محلاتی سازشوں اور اندرون خانہ سودے بازی کے ذریعے عوام کو سیاسی' معاشی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ رکھا۔ پاکستان کے غریب ومفلوک الحال اور پسماندہ عوام کو اندھیروں' مایوسیوں' ناامیدیوں کے کنویں میں ڈبونے والے مفاد پرست اور موقع پرست جاگیرداروں نے اپنی بالادستی کو قائم اور مستحکم رکھنے کی خاطر بدترین قسم کی آمرانہ اور فسطائی طور طریقے سے وطن عزیز کی 98 فیصد عوام کو احساس محرومی ومحکومی میں شدید اضافہ کیا۔ جاگیرداروں اور وڈیروں نے ملک میں جو نظام اور انتظام رائج کیا ہوا ہے اس کے نتیجہ میں غریب' غربت' مفلسی' محتاجی اور مفلوک الحال کے گرداب میں پھنستا جارہا ہے۔ دوسری طرف وہ جاگیردار' امراء اور دولت مند حاکم اور اشرافیہ ہیں جنہوں نے امیری اور غریبی کی اس تفریق میں زبردست عدم توازن پیدا کیا جس سے عدم استحکام کی فضا نے جنم لیا۔ اگر قومی اور طبقاتی تضادات کو منصفانہ طور پر جلد حل نہ کیا گیا تو ملک انتشار' بدامنی' اور طوائف الملوکی کا شکار ہوکر زوال سے بھی دوچار ہوسکتا ہے۔ پاکستان کی بقاء اور سلامتی' دوام اور پائیداری کے لئے ضروری ہے کہ ملک سے جاگیرداری نظام کو ہمیشہ کیلئے ختم کیا جائے بلکہ جاگیردارانہ نظام کی جڑوں کو تحفظ فراہم کرنے والے عناصر کو تلاش کر کے انہیں پاک سرزمین سے ہمیشہ کے لئے اکھاڑ دیا جائے۔

اس کتاب کا مرکزی خیال اور پس منظر یہی ہے کہ جاگیرداروں' وڈیروں اور ان مذہبی رہنماؤں کے چہروں پر سے نقاب اتاری جائے جو پاکستان کے شدید مخالف تھے اور قائداعظم کو مسلمانوں کا قائد تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ

''مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے اور قائداعظم دراصل کافراعظم ہے''

''اگر مسٹر جناح نے اپنی موجودہ مہم کو نرم نہ کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ انہیں
پنجاب میں سوائے ناکامی اور مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا''

''میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ تقسیم ہند پر نہ مریں اور ایک ایسے
دستور پر راضی ہو جائیں۔''

''پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کے معاملات میں کسی غیر پنجابی کی
مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی''

''افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چند مقدیوں تک ایک بھی ایسا
نہیں ہے جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز تک رکھتا ہو''

''ہم ایسی آزادی نہیں مانگے کہ یہاں مسلم راج ہو اور وہاں ہندو راج ہو''

''مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت
نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرا دیا جائے''

قیام پاکستان کی مخالفت کرنے والے جاگیرداروں اور اشرافیہ نے پاکستان کی حمایت پاکستان کی محبت میں نہیں بلکہ انگریزوں کی عنایت کردہ جاگیروں کو بچانے اور جاگیرداری سسٹم کی بقاء کے لئے کی تھی؟ اور یہی جاگیردار طبقہ پاکستان کو دولخت کرنے کا ذمہ دار بھی ٹھیرا ہے۔ جس کے کئی روپ اور بہروپ ہیں جو شکلیں بدل بدل کر مختلف عہدوں اور منصب پر فائز نظر آتا ہے۔

بقول شاعر

نیرنگئی سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

جاگیرداروں کی
وفاداری۔تابعداری۔فرمانبرداری

اہل ہندوستان نے انگریز سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جو تحریک شروع کی تھی اس تحریک میں اہل ہندوستان نے شکست کھائی اور انگریزوں کو کامیابی ملی۔آزادی کی اس تحریک میں اہل ہندوستان کی شکست کے اسباب پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایسے سازشی اور غدار قدم قدم پر نظر آئیں گے۔جنھوں نے ذاتی مفادات اور دولت کی ہوس میں مخبریاں کرکے تحریک آزادی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ بلکہ سازشیں اور مخبریاں کرکے اہل ہندوستان کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔

برطانوی سامراج نے تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے جب حریت پسندوں پر انتہائی مظالم ڈھائے تو فرنگی کے جبر و تسلط کے خلاف حریت پسند سراپا احتجاج بن گئے اور انھوں نے انگریز کی حاکمیت اور استعماری قوت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا وہ اپنے لہو سے تحریک آزادی کو منزل کے قریب تر لانے کی جدو جہد میں سرگرم تھے۔اس موقع پر غداروں اور ضمیر فروشوں نے ذاتی مفادات کی خاطر، زمین اور دولت کے لالچ میں، سرکاری خطاب اور دیگر مراعات کی خواہش اور طلب میں انگریزوں کے ساتھ مل کر حریت پسندوں کی تحریک کو نقصان پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔اگر تحریک آزادی میں غداری، سازش، ضمیر فروشی کے عنصر شامل نہ ہوتے تو ہندوستان کی

تاریخ مختلف ہوتی۔

ہندوستان کے ان علاقوں کا جائزہ لیں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں تحریک آزادی کی جدوجہد کا مطالعہ کریں تو ہمیں حریت پسندوں کی قربانیوں کے ساتھ ساتھ وہاں کے جاگیرداروں کی غداری اور ضمیر فروشی کی شرمناک تاریخ بھی ملے گی۔ان جاگیرداروں کا کردار بہت شرمناک تھا انہوں نے دولت کی ہوس، زمین کے حصول اور سرکاری خطابات کے لالچ میں قوم وملت سے غداری کی۔ انگریز حکمرانوں سے مراعات اور انعامات حاصل کرنے کیلئے ان کی ہر لمحہ خدمت کی۔ اسلامی ملکوں میں جاسوسی کے فرائض ادا کیے، مشکل وقت میں انگریزوں کو رنگروٹ دیئے۔ تحریک آزادی کو نقصان پہنچانے کیلئے مخبری کے فرائض انجام دیئے، انگریزوں کو مفید معلومات فراہم کیں، انگریز سرکاری کی خوشنودی کیلئے تمام کام برضا و رغبت کئے۔ پاکستان کے ایوانوں میں نظر ڈالیں تو اکثریت ان جاگیرداروں کی نظر آئے گی جن کے آباؤ اجداد کو جنرل نکلسن نے ملکہ برطانیہ اور یونین جیک سے وفاداری کے صلہ میں جاگیریں عطا کی تھیں۔ جنرل نکلسن، کلائیو کے ان ہم نشینوں میں سے تھا جس نے بہادر شاہ ظفر کے بچوں کا سر کاٹ کر تین دن سے بھوکے پیاسے قیدی شہنشاہ کو ناشتے کے طور پر پیش کیا تھا۔ جاگیردار آج جس مقام اور مرتبہ پر ہیں وہ ان کے بزرگوں کی عنایتوں اور نوازشوں کا ثمر ہے۔ اگر وہ سید احمد بریلوی سے دغا نہ کرتے اور محلاتی سازشوں میں انگریزوں کا ساتھ نہ دیتے تو آج ان کی نسلیں بڑی بڑی جاگیروں اور زمینوں کی مالک نہ ہوتیں۔

کسی بھی بڑے جاگیردار کا نامہ اعمال کھول لیجئے اس کی جاگیرداری اور زمینداری کا سلسلہ وہیں سے جڑے گا جب سے انگریزوں نے تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے جاگیرداروں کو انعام کی شکل میں زمینیں عطا کرنا شروع کیں۔ تاج برطانیہ کی وفاداری میں جاگیرداروں نے غداری، سازش اور موقع پرستی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ جنگ آزادی میں حریت پسندوں کے خلاف پیش پیش رہے۔ عالمی جنگوں میں انگریزوں کی مالی امداد اور افرادی قوت فراہم کرنے

کے ساتھ ساتھ برطانوی سامراج کے ظلم وستم کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک کو دبانے میں جاگیرداروں نے بھرپور ساتھ دیا جن جاگیردار خاندانوں نے انگریز کی خدمت کے عوض بڑی بڑی زمینیں اور انعامات حاصل کئے ان میں شاہ پور کے ٹوانے، سرگودھا کے نون، بہاولپور کے نواب، لاہور کے ممدوٹ، ملتان کے قریشی، گیلانی اور گردیزی، لاہور کے قزلباش، کالا باغ کے نواب، راولپنڈی کے کھکھڑ، جھنگ کے سیال، کمالیہ کے کھرل، مظفرگڑھ کے گورمانی، ڈیرہ غازی خان کے مزاری، لغاری، تونسوی، قیصرانی، دریشک، کھوسے، سدوزئی، گورچانی، پنڈی کے راجے، مغل میرزادے، قادیانی اور مرزائی شامل تھے۔

تاج برطانیہ کے نیازمند

انگریزوں کا ساتھ دینے اور حریت پسندوں سے غداری کے صلہ میں جاگیریں اور زمینیں حاصل کرنے والے خاندانوں کی نسلیں کسی نہ کسی شکل میں آج بھی فیوڈل سسٹم کا حصہ ہیں۔ان جاگیرداروں کے آباؤ اجداد نے سلطنت برطانیہ کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہی سب سے زیادہ تاج برطانیہ کے وفادار ہیں انہیں عرضداشت پیش کیں۔ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر ڈیرہ غازی خان کے سرداروں، رئیسوں اور زمینداروں نے ایک عرضداشت پیش کی جس میں انھوں نے پنجاب اور وہاں کی عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے تاج برطانیہ سے اپنی وفاداری اور تابعداری کیلئے جو الفاظ استعمال کئے اسے پڑھ کر زمینداروں اور جاگیرداروں میں انگریز سامراج سے محبت، عقیدت اور اعتقاد کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

(عرض داشت)

(عرضداشت گر قبول افتدز ہے عز و شرف)

بعد عرض فیض عرض باریافتگان پایہ سریر سلطانی، ظل یزدانی آیت دولت جاودانی، عدل و انصاف اور جہانبانی کے مصدر و منبع و اعلیٰ حضرت شہنشاہ عالی جاہ، عالم پناہ

والد بارگاہ' خدیو گیہان منصف دوران، سلیمان زمان، جمشید جہاں، جناب معلی القاب فیض مآب، معدلت انتساب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم، اللہ ان کے اقبال اور شان وشوکت کو تا ابد قائم ودائم رکھے۔

بے حد عجز وانکساری کے اظہار اور تسلیمات بے اندازہ وتعظیمات بے شمار کے بعد ہم ساکنان ضلع ڈیرہ غازی خان صوبہ پنجاب ملک ہندوستان یعنی بلوچی سرداران، ملازمان، رئیسان، میونسپل کمشنران اور دیگر رعایا بہ ادب و نیاز پائیہ تخت اعلیٰ حضرت شہنشاہ جہاں پناہ منبع فیوض و برکات کو بوسہ دیتے ہوئے بادشاہ سلامت کی تاج پوشی کے جشن پر پُر خلوص ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے لئے یہ جشن سعید ہے کہ شہنشاہ برطانیہ کلاں اور قیصر ہند کی تاج پوشی کے باعث ہم جانثار اور وفادار بندوں کو اس پُر مسرت موقع پر بے حد خوشی اور سرور حاصل ہوا۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ہم سلطنت عظمیٰ کے دوسرے ممالک میں بسنے والوں کا مقابلہ علوم و فنون کی تحصیل اور تجارت وزراعت کی ترقی میں کسی طور پر نہیں کر سکتے۔ مگر ہم اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ ہم برطانیہ عظمیٰ کے تخت کی تابعداری اور فرمانبرداری میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ ہم بصد عقیدت واحترام حضرت ملکہ معظم مغفور ومرحومہ قیصرہ ہند کی ذات والا صفات کے مداح ہیں جو ہمارے لئے گنجینہ فیوض و برکات تھی۔ وہ بے شمار اوصاف حمیدہ کی حامل تھیں جنھیں حیطہ تحریر وتقریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ ممدوحہ مغفورہ نہ صرف عدل پرور اور کرم گستر ملکہ تھیں بلکہ ہندوستان کی رعایا کے لئے شفقت ومہربانی کے لحاظ سے مادر بھی تھیں۔ اس ملک میں ولی عہدی کے زمانہ میں حضور پرنور کی تشریف آوری اب تک ہمارے لئے انتہائی مسرت وطمانیت کا باعث ہے۔ ہماری عاجزانہ درخواست ہے کہ حضور انور شہنشاہ اکبر اپنے عہد حکومت میں انہی خیالات عالیہ کا اظہار فرماتے ہوئے اس دور

افتادہ علاقہ کے باسیوں کو حسب معمول اپنے شاہانہ اور کریمانہ الطاف وعنایات سے نوازتے رہیں جن کے پیش نظر حضور نے اس سرزمین کو وقار بخشا تھا۔ آخر میں ہماری دعا ہے کہ خدائے ذوالجلال شہنشاہ با استقلال اور عالم پناہ باکمال کے اقبال اور اجلال کو ہمیشہ عروج بخشے اور سایہ ہما پایہ فیض گنجور حضرت ملکہ معظمہ کے فیوضات کا ظہور اہل جہان کی پیشانی پر تاابد قائم و دائم رہے۔ اقبال و اجلال شہنشاہ با استقلال و عالم پناہ راپیوستہ بہ عروج دارادو سایہ ہما پایۂ حضور فیض گنجور حضرت ملکہ معظمہ صفالین ظہور بر مفارق عالمیان تا بقائی جہاں دائم و قائم دارا۔

بحرمت النون والضاد آمین یا الہ العالمین!

جاگیرداروں کے علاوہ ایک بڑا طبقہ پیروں، پیرزادوں، سجادہ نشینوں کا بھی تھا جو انگریزوں کی وفاداری اور انگریز نوازی میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ آج بڑے بڑے خانقاہ نشین جن جاگیروں اور زمینوں کے مالک ہیں وہ بھی انگریز حکمرانوں کی عنایت کا ثمر ہے۔ ان پیروں، پیرزادوں اور خانقاہ نشینوں نے بھی انگریزوں کا خوب حقِ نمک ادا کیا۔ جلیانوالہ باغ میں جب جنرل ڈائر کے حکم پر قتل عام ہوا تو یہ پیرزادے اور پیر بے گناہ اہل ہندوستان کے قتل عام پر خاموش رہے۔ بلکہ انگریز سرکار کی وفاداری اور تابعداری میں دوسروں سے آگے بڑھ کر سر مائیکل اوڈوائر کو سپاسنامہ پیش کیا۔ انھوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی فتح اور کامرانی کی دعائیں مانگیں۔ شاہ جارج کو ظل اللہ لکھا۔ پنجاب کے علماء ، مشائخ اور سجادہ نشینوں نے 1919ء میں اپنے دستخطوں سے پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر کی خدمت میں ''دعا نامہ'' بطور ایڈریس پیش کیا۔ مائیکل اوڈوائر وہی جابر و ظالم شخص تھا جس کے حکم پر جلیانوالہ باغ امرتسر میں جنرل ڈائر نے عوام کو بلا اشتعال گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔

پنجاب کے مشائخ، علماء اور سجادہ نشینوں کی طرف سے پیش کردہ ''دعا نامہ'' جسے ''غلامی نامہ'' ہی لکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ''غلامی نامہ'' پڑھیے اور ماتم کریں کہ وہ طبقہ جو قیام پاکستان

سے قبل انگریز حکمرانوں کے سامنے سجدہ ریز تھا اور تحریک آزادی کا شدید مخالف تھا۔ یہی مفاد پرست ٹولہ پاکستان کے اقتدار پر قابض ہوگیا اور اس ٹولے نے ہمیشہ ذاتی مفادات پر قومی مفادات کو قربان کیا۔

دعانامہ

حضور والا!

ہم خادم الفقراء سجادہ نشینان وعلماء مع متعلقین شرفائے حاضر الوقت مغربی حصہ پنجاب نہایت ادب اور عجز وانکساری سے یہ ایڈریس لے کر خدمت عالی میں حاضر ہوئے ہیں اور ہمیں یقین کامل ہے کہ حضور انور جن کی ذات عالی صفات میں قدرت نے دلجوئی ذرہ نوازی اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ ہم خاکساران باوفا کے اظہار دل کو توجہ سے سماعت فرما کر ہمارے کلاہ فخر کو چار چاند لگا دیں گے۔

سب سے پہلے ہم ایک دفعہ پھر حضور والا کو مبارکباد کہتے ہیں جس عالمگیر اور خوفناک جنگ کا آغاز حضور کے عہد حکومت میں ہوا اس نے حضور ہی کے زمانے میں بخیر و خوبی انجام پایا اور یہ بابرکت و باحشمت سلطنت جس پر پہلے بھی سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا اب آگے سے زیادہ مستحکم اور آگے سے زیادہ روشن اور اعلیٰ عظمت کے ساتھ جنگ سے فارغ ہوئی جیسا کہ شہنشاہ معظم نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا۔ واقعی برطانوی تلوار اس وقت نیام میں داخل ہوئی جب دنیا کی آزادی امن و امان اور چھوٹی قوموں کی بہبودی مکمل طور پر حاصل ہوکر بالآخر سچائی کا بول بالا ہوگیا۔ حضور کا زمانہ ایک نہایت نازک زمانہ تھا اور پنجاب کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی عنان حکومت اس زمانے میں حضور جیسے صاحب استقلال، بیدار مغز اور عالی دماغ حاکم کے مضبوط ہاتھوں میں رہی جس سے نہ صرف اندرونی امن قائم رہا بلکہ حضور کی

دانشمندانہ رہنمائی میں پنجاب نے اپنے ایثار و وفاداری اور جانثاری کا وہ ثبوت دیا جس سے ''شمشیر سلطنت'' کا قابل فخر و عزت لقب پایا۔ پھر اس کا معراج صلیب احمر کی اعجاز نماد ستگیری، قیام امن کی تدبیر، تعلیم کی ترقی سب حضور ہی کی کاوشیں ہیں اور حضور ہی ہیں جنھوں نے ہر موقع پر ہر وقت پنجاب کی خدمات وحقوق پر زور دیا۔ صرف جناب والا کو ہی ہماری بہبود و مطلوب نہ تھی بلکہ صلیب احمر (Red Cross) و تعلیم نسواں کے نیک کام میں حضور ہمدم و ہمراز جنابہ لیڈی اوڈ وائر صاحبہ نے جن کو ہم مروت کی زندہ تصویر سمجھتے ہیں نے۔ ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہندوستانی مستورات پر احسان کر کے ثواب دارین حاصل کیا۔ ہماری ادب سے التجا ہے کہ وہ ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

حضور انور! جس وقت ہم اپنی آزادیوں کی طرف خیال کرتے ہیں جو ہمیں سلطنت برطانیہ کے طفیل ہوئیں اور پھر جب ہم بے نظیر برطانوی انصاف کو دیکھتے ہیں جس کی حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں تو ہمیں ہر طرف احسان ہی احسان دکھائی دیتے ہیں۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے رابہ کسے کارے نباشد

ہم سچ! عرض کرتے ہیں کہ جو برکات ہمیں اس سلطنت کی بدولت حاصل ہوئیں، اگر ہمیں عمر خضر بھی نصیب ہو تو بھی ہم ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کیلئے سلطنت برطانیہ ابر رحمت کی طرح نازل ہوئی اور ہمارے ایک بزرگ نے جس نے پہلے زمانہ کی خانہ جنگیاں، خونریزیاں اور بدامنیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں، اس سلطنت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔

ہوئیں بدنظمیاں سب دور انگریزی عمل آیا

بجا آیا بہ استحقاق آیا بر محل آیا

مگر ہمیں پوری توقع ہے کہ ہماری گورنمنٹ اس بات کا خیال رکھے گی کہ مقامات مقدسہ کا اندرونی نظم ونسق مسلمانوں کے ہی ہاتھ میں رہے اور ہم حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ جب حضور وطن کو تشریف لے جاویں تو اس نامور تاجدار ہندوستان کو یقین دلائیں کہ چاہے کیسا ہی انقلاب کیوں نہ ہو، ہماری وفاداری میں سرمو فرق نہ آیا ہے اور نہ آ سکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اور ہمارے پیروان اور مریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکار برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جانثار رہیں گے۔

ہمیں نہایت رنج افسوس ہے کہ ناتجربہ کار ونوجوان امیر امان اللہ خان والیٔ کابل نے کسی غلط مشورہ سے عہد ناموں کے اور اپنے باپ دادا کے طرز کی خلاف ورزی کر کے خداوند تعالیٰ کے صریح حکم:

واوفوابالعہد...... ان العہد کان مسئولہ

(یعنی وعدے کا ایفا کرو.... ضرور وعدے کے متعلق پوچھا جائے گا) کی نافرمانی کی۔ ہم جناب والا کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم افغانستان کے اس طرز عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم اہالیان پنجاب احمد شاہ کے حملوں اور نادر شاہی قتل وغارت گری کو نہیں بھول سکتے۔ ہم اس غلط اعلان کی جس میں اس نے سراسر خلاف واقعہ لکھا ہے کہ اس سلطنت کی مذہبی آزادی میں خدانخواستہ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ واقع ہوئی، زور سے تردید کرتے ہیں۔ امیر امان اللہ خان کا خاندان سرکار برطانیہ ہی کی بدولت بنا اور اس کی احسان فراموشی کفران نعمت سے کم نہیں۔

ہم کو ان کوتاہ اندیش دشمنان ملک پر بھی سخت افسوس ہے جن کی سازش سے تمام

ملک میں بدامنی پھیل گئی اور جنھوں نے اپنی حرکات ناشائستہ سے پنجاب کے نیک نام پر دھبہ لگایا۔ مقابلہ آخر مقابلہ ہی ہے۔ ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان گمراہ لوگوں کی مجنونانہ و جاہلانہ حرکات کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ کیونکہ ہمارے قرآن کریم میں یہی تلقین کی گئی ہے۔ لا یفسد وافی الارض (یعنی دنیا میں فساد اور بدامنی مت پیدا کرو) اور ان اللہ لا یحب المفسدین (یعنی بے شک خدا فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

حضور والا! اگرچہ آپ کی مفارقت کا ہمیں کمال رنج ہے۔

سرِ غم سے کھچے کیوں نہ سردار ہمارا

لو ہم سے چھٹا جاتا ہے سردار ہمارا

لیکن ساتھ ہی ہماری خوش نصیبی ہے کہ حضور کے جانشین سردار ایڈورڈ میکلیکن بالقاسم جن کے نام سے نامی پنجاب کا بچہ بچہ واقف ہے اور جن کا حسن اخلاق اور رعایا نوازی میں شہرہ آفاق ہے اور جو ہمارے لئے حضور کے پورے نعم البدل ہیں، ان کا ہم دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی خدمت والا میں یقین دلاتے ہیں کہ ہم بمثل سابق اپنی جوش عقیدت و وفاداری کا ثبوت دیتے رہیں گے۔

حضور وطن کو تشریف لے جانے والے ہیں۔ ہم دعا گویان جناب باری میں دعا کرتے ہیں کہ حضور بمعہ لیڈی صاحبہ و جمیع متعلقین مع الخیر اپنے پیارے وطن پہنچیں۔ تادیر سلامت رہیں اور وہاں جا کر ہم کو دل سے نہ اتار دیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

المدعیان

جس وقت مشائخ' علماء اور سجادہ نشین نہ صرف گورنر پنجاب بلکہ ان کی اہلیہ تک کی ''خدمات جلیلہ'' کی مدح میں رطب اللسان تھے اور قرآنی آیات کے حوالے سے انگریز حکمرانوں

کو اسلامیان ہند کے لئے باعث رحمت قرار دے رہے تھے وہ دور برصغیر میں سیاست کے حوالہ سے نہایت طوفانی دور تھا۔ یہ وہی دور تھا جب مسلمان ہند تحریک خلافت میں جان و مال کی قربانیاں پیش کرر ہے تھے۔ اس دور میں بدنام زمانہ رولٹ ایکٹ پاس ہوا جسے برصغیر کی تمام سیاسی جماعتوں نے ''کالا قانون'' قرار دیا تھا۔ قائداعظم نے اس کالے قانون کے خلاف بطور احتجاج مرکزی قانون ساز اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ مگر دوسری طرف پنجاب کے جاگیردار اور سیاستدانوں نے یونینسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم سے اس کالے قانون کی نہ صرف حمایت کی بلکہ قائداعظم کی مخالفت کی۔ انہی سیاستدانوں کے بارے میں قائداعظم نے کھوٹے سکوں کے لفظ استعمال کئے تھے۔ پنجاب کے جاگیرداروں، زمینداروں، مشائخ اور پیروں کی زندگی کا مقصد اولین انگریز سرکار کی خدمت اور خوشامد کرنا تھا تا کہ انگریز سرکار کی وفاداری کے صلہ میں انھیں انعامات اور خطابات کی شکل میں وظیفے، پنشن، ماہانہ خرچ، زمینیں اور سرکاری عہدے ملتے رہیں۔

خیر خواہان برطانیہ

پنجاب میں زیادہ تر جاگیردار اور زمیندار موروثی فیوڈل طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان جاگیرداروں اور زمینداروں میں اکثریت ایسے گھرانوں کی ہے جو خالصتاً برطانوی راج کی پیداوار تھے۔ ان کی جاگیرداری اور منصب داری انگریزوں کی مرہون منت تھی۔ اس لئے ان کے نزدیک انگریز سے وفاداری جزو ایمان تھی دوسری طرف انگریز بھی ان کی پوری نگہداشت اور حفاظت کرتے تھے۔ ان جاگیرداروں کو کسانوں، ہاریوں اور اپنی رعایا کو پوری طرح لوٹنے اور ان کا استحصال کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ اس لئے جاگیرداروں میں انگریزوں سے وفاداری کا جذبہ راسخ پا گیا تھا۔ ایک جانب یہ جاگیردار اپنی رعایا پر ظلم اور جبر کر کے خود کو طاقت اور اختیارات کا منبع سمجھتے تھے تو دوسری طرف ضلع افسر سے لیکر انگریز حکمرانوں کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتے تھے۔ وہ اس خوف میں مبتلا رہتے تھے کہ کہیں انگریز سرکاران سے ناراض ہو کر اختیارات اور مراعات واپس نہ چھین لیں۔ اس لئے ہمیشہ ان کی خوشامد میں مصروف رہتے تھے۔

جاگیرداروں کی نفسیات میں ایک بات بیٹھ گئی تھی کہ انگریز کی حکومت لازوال ہے۔اس سے حقوق تو طلب کئے جاسکتے ہیں، مراعات تو مانگی جاسکتی ہیں لیکن ان کو ہندوستان سے نکالا نہیں جاسکتا۔ اس سوچ نے جاگیرداروں کو انگریز سرکار کے خلاف بغاوت کرنے سے روکے رکھا۔

انگریز نے 1849 میں سکھوں کو شکست دینے کے بعد پنجاب میں زرعی اراضی کو حکومت کی مملکت قرار دینے کی بجائے اسے اپنے وفا شعار خاندانوں میں بطور وراثت تقسیم کرنا شروع کیا۔اس طرح پنجاب میں جاگیرداروں کے ایسے وفادار خاندان معرض وجود میں آئے جو برطانوی سامراج کے لئے ستون شمار ہوتے تھے۔ برطانوی حکومت نے اپنے وفادار خاندانوں کو جاگیریں اور زمینیں عطا کیں۔انہیں خطابات سے نوازا انہیں دربار میں کرسی نشین بنا کر لوگوں کی نگاہ میں معزز قرار دینے کی باقاعدہ مہم چلائی۔ جاگیرداروں کی خواہش تھی کہ کسی بھی قیمت پر انگریز دربار میں جگہ حاصل کرلیں۔چاہے اس کے لئے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ان جاگیرداروں نے انگریزوں کی نمک حلالی کرتے ہوئے پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہونے نہیں دی۔ 1936ء کے اوائل میں سر فضل حسین نے قائداعظم کو لیگ پارلیمانی بورڈ بنانے کی اجازت نہیں دی اور انہیں کہا کہ ''وہ پنجاب کو ہاتھ مت لگائیں۔'' جبکہ سکندر حیات نے 11 مارچ 1941ء کو بالواسطہ طور پر متنبہ کیا کہ

''پنجاب کے معاملات میں کسی غیر پنجابی کی مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی۔''

جاگیرداروں نے تحریک آزادی سے دغا اور حریت پسندوں کی مخبریاں کرکے نہ صرف انگریز سرکار سے بے حساب زمینیں، جاگیریں، انعامات اور خطابات حاصل کئے بلکہ حریت پسندوں کے خلاف لڑائی میں انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کی۔کسی بھی جاگیردار کا نامہ اعمال کھول کر دیکھیں سب کی جڑیں انگریز سرکار کے وفادار حواریوں سے جاکر ملتی ہیں جنھوں نے حریت پسندوں کے لہو سے غداری اور اہل زمین سے دغا اور انگریز سرکار کی خدمت اور خوشامد کرتے ہوئے بڑی بڑی جاگیریں، خطابات اور درباری اعزازات پائے۔ان جاگیردار خاندانوں میں مثلاً ڈیرہ غازی خان کے مزاری، لغاری، دریشک اور کھوسے، بہاولپور کے نواب، خان گڑھ کے

نوابزادے، مظفر گڑھ کے گورمانی، لڈھن کے دولتانے، ملتان کے قریشی، گیلانی اور گردیزی، خانیوال کے ڈاہے، لاہور کے ممدوٹ، موکل، قزلباش، کالاں شیخ اور بخاری فقیر، ربوہ کے مرزائی، گوجرانوالہ کے چٹھے، گجرات کے نواب زادے، کڑلیہ کے کھرل، جھنگ کے سید، سیال اور رجوعے، سرگودھا کے ٹوانے اور نون، کھوکھر، جہلم کے راجے، راولپنڈی کے گکھڑ اور الیپال، عیسیٰ خیل کے نیازی، میانوالی کے میاں اور بچھر شامل ہیں۔ تاج برطانیہ کے خیر خواہان اور وفادار خاندانوں میں سے چند کا مختصر احوال ملاحظہ فرمائیں۔

نواب مظفر علی قزلباش کے دادا علی رضا خان نے 1839ء میں پہلی افغان جنگ کے دوران انگریزی فوج کو اناج اور ذرائع نقل وحمل مہیا کئے جب افغان حریت پسندوں نے سامراجی فوجوں کا محاصرہ کیا تو رضا خان نے محصورین کی امداد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اس پس منظر میں انگریز ارباب اقتدار کی رائے یہ تھی کہ پورے ہندوستان میں ایسا خاندان ملنا مشکل ہے جس نے ان کی حکومت کی اس قدر بے لوث خدمت کی ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک کابل کی تباہ کن مہم یاد رہے گی اور جب تک ہمارے گھروں میں 1857ء کے غم واندوہ کا ذکر ہوتا رہے گا، اس وقت تک سارے انگریز علی رضا خان کو شکریے اور احترام کے ساتھ یاد کرتے رہیں گے۔

نواب شاہ نواز ممدوٹ کے دادا جمال الدین خان نے 1848 میں فیروز پور کے نزدیک انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی کے دوران یکایک سکھوں کا ساتھ چھوڑ کر انگریز کمانڈر سرجان لیٹر (John Littler) کی امداد کی تھی اس خدمت کے صلے میں ان کی جاگیر کو بحال رکھا گیا۔ 1848ء میں اس کے بھائی جلال الدین کو نواب کا خطاب دیا گیا تھا اسے امن کے زمانے میں 60 گھوڑسوار اور جنگ کے زمانے میں 70 گھوڑسوار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔

ضلع شاہ پور کے ملک فتح شیر خان نے 1848-49ء میں انگریزوں کی سکھوں کے ساتھ آخری لڑائی میں ملتان میں چار سو گھوڑسواروں کے ساتھ ایڈورڈ لارنس کی مدد کی تھی اس نے 1857ء میں جنگ آزادی کے دوران سب سے پہلے پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے چیئرمین جان لارنس کی مدد کی تھی۔ ملک فتح شیر اور اس کے لشکر نے ہسار، بنگال اور جمال پور میں

بھی انگریزی فوجوں کی اعانت کی تھی۔

ملک خضر حیات خان ٹوانہ کے دادا خان بہادر ملک صاحب خان نے 1848ء میں سکھ سردار بھائی مہاراج سنگھ کا تعاقب کر کے اسے اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کردیا تھا۔ اس لڑائی میں ملک صاحب خان خود بھی لڑے تھے انھوں نے مہاراج کے کئی پیروکاروں کو ہلاک کیا۔ ملک خضر حیات خان کے والد ملک عمر حیات خان نے پہلی جنگ عظیم میں، تیسری افغان جنگ میں اور 1919ء کے بلوؤں میں جو خدمات انجام دیں وہ SIR LEPEL کے بیان کے مطابق اتنی زیادہ اور اتنی گرانقدر ہیں کہ انہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صوبائی کونسل کے پہلے رکن تھے جس نے جنگ کیلئے اپنی خدمات پیش کیں۔ ان خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں سر کا خطاب دیا گیا تھا۔ ان کے بیٹے ملک خضر حیات خان نے بھی 1918ء میں قابل قدر جنگی خدمات سرانجام دی تھیں اور 1919ء کے بلوؤں کے دوران بھی بڑی سرگرمی سے خدمت سرانجام دیں چنانچہ ان کا گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں اسپیشل ڈیوٹی کیلئے انتخاب ہوا۔ انھوں نے تیسری افغان جنگ میں بھی لاہور ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ کے اے ڈی سی کی حیثیت سے کام کیا۔ انھیں افغان میڈل عطا کیا گیا تھا۔ ملک سر عمر حیات خان ٹوانہ، ملک فیروز خان نون کے نزدیکی رشتہ دار تھے جن کے دادا ملک فتح خان نے بھی 1848ء میں ملتان، جہلم اور بنوں میں انگریز سرکار کی بہت خدمت کی تھی۔ چنانچہ انھیں 1200 روپے کی پنشن دی گئی تھی۔ انگریز سرکار نے ان کے بیٹے ملک محمد حیات خان کو ایچی سن کالج میں تعلیم دلوا کر 1901ء میں پنجاب پراونشل سروس میں شامل کرلیا گیا۔ انہیں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر ترقی دی گئی، 1923ء میں نواب کا خطاب دیا گیا' انھیں صوبائی دربار میں بھی کرسی ملتی تھی، ضلع شاہ پور میں وسیع رقبہ اراضی بھی عطا کی گئی۔

ضلع کیمبل پور کے سکندر حیات خان کے والد محمد حیات خان نے 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران آفریدیوں کا ایک لشکر منظم کر کے پشاور کے ڈپٹی کمشنر نکلسن (Nicholson) کی امداد کی تھی۔ انعام کے طور پر انھیں 250 روپے سالانہ کی

پنشن اور خلعت بھی عطا ہوئی۔سکندر حیات خان نے لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلی جنگ کے دوران رنگروٹوں کی بھرتی میں بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔اس نے انگریزوں کی جانب سے تیسری افغان جنگ میں ایک کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے حصہ لیا۔انگریز فوج میں بھرتی کیلئے جو خدمات انجام دیں اس کے انعام کے طور پر انھیں سند اور خلعت عطا ہوئی اور 1918 میں انھیں آنریری مجسٹریٹ بنادیا گیا۔

1875ء میں فتح خان کی وفاداری بہت نمایاں رہی لہذا اسے 600 روپے سالانہ کی پنشن' ایک ہزار روپے کی خلعت اور جاگیر عطا ہوئی۔1960ء میں انھیں مجسٹریٹ بنادیا گیا 18 دیہات میں سول اور فوجداری مقدمات کے فیصلے کرنے کا اختیار دیا۔1866ء میں انھیں تین ہزار ایکٹر کی مزید جاگیر عطا کی گئی تاکہ وہاں گھوڑے اور مویشی پال سکیں اور 1888ء میں فتح خان کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔

ملک عطا محمد خان نواب آف کالا باغ کے دادا ملک مظفر خان اور اس کے بیٹے یار محمد نے ایک سو سپاہی بھرتی کر کے ہربرٹ ایڈورڈز کی کمان میں دے دیئے۔انھوں نے دوسری افغان جنگ کے دوران سپاہیوں کے علاوہ بار برداری کے لئے بہت سے مویشی بھی مہیا کئے تھے۔

نواب مشتاق احمد گرمانی کا تعلق ضلع مظفر گڑھ کے پیروں کے خاندان سے تھا۔اس کے والد محمد زمان نے پہلی جنگ عظیم کے دوران بہت سے لوگوں کو انگریز فوج میں بھرتی کروایا۔ اس خاندان کا انگریز سامراج سے وفاداری کا یہ عالم تھا کہ ان کا ایک بھائی سلطان احمد 1917ء میں رنگروٹوں کی بھرتی کے لئے ملتان کے ایک ایسے علاقے میں چلا گیا تھا جہاں ہیضہ کی وباء پھیلی ہوئی تھی وہ وہیں ہیضہ میں مبتلا ہوکر مر گیا۔انگریزوں نے اس کی قربانی کی قدر کی اور اس کے خاندان کو دس مربع اراضی اور 500 روپے کی جاگیر عطا کی پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے میاں محمد زمان خان کو ایک سند' خلعت اور بندوق بھی دی۔1920ء میں ان کا انتقال ہوا تو مشتاق احمد گرمانی اور نیاز احمد گرمانی کو اس کی وسیع وعریض جائیداد کا وارث تسلیم کرلیا گیا۔

ملتان کے گیلانی مخدوم زادے ''خیر خواہان برطانیہ'' میں سے تھے۔ان کو میجر ہربرٹ

ایڈورڈز نے ایک سند دی تھی جس میں ان کی وفاشعاری کی تعریف کی گئی تھی۔ سرجان لارنس نے بھی 1857ء میں قوم فروشانہ خدمات پر مخدوم سید نور شاہ کو ایک سند اور 300 روپے کی ایک خلعت عطا کی تھی۔ 1876ء میں ''پیر سید ولایت شاہ'' کو گیلانی کا رئیس قرار دے کر آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا، اس کے بعد مخدوم سید صدرالدین شاہ ''صوبائی درباری'' کہلائے۔

سر محمد ظفر اللہ خان ضلع گورداسپور کے مذہبی پیشوا مرزا غلام احمد کے پیرو کار تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس خاندان نے انگریز کا ساتھ دیا اور جنرل نکلسن سے تعریفی سرٹیفکیٹ پایا میرزا غلام مرتضیٰ کی وفات کے بعد مرزا سلطان احمد اس خاندان کا سربراہ مقرر ہوا جو پہلے نائب تحصیلدار پھر اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ مرزا غلام احمد اسی گھر میں 1835 کو پیدا ہوا، اس نے مختلف اداروں سے روایتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1891ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے مسئلہ جہاد پر کئی کتابیں لکھیں اور یہ موقف اختیار کیا کہ ''انگریزوں کی مہربان حکومت کے خلاف جہاد حرام ہے'' وہ ساری زندگی حکومت برطانیہ کا وفادار رہا اس نے اپنے پیروکاروں کو بھی یہ ہدایت کی کہ وہ بھی مسلسل حکومت کے وفادار ہیں۔

ضلع جھنگ کے سیالوں نے بھی انگریزوں کی خدمت کر کے انعام و اکرام پایا چنانچہ ان میں سے محمد اسماعیل خان کو نہ صرف جھنگ کے پولیس سواروں کا رسالدار بنایا گیا بلکہ جنگ آزادی کی گورا فوج کی امداد کے عوض اسے جاگیر، پنشن اور خلعت سے بھی نوازا گیا۔ بعد میں رابرٹ ایجرٹن (Robert Egerton) کی سفارش پر جاگیر میں اضافہ کیا گیا اور اسماعیل خان کو میونسپلٹی اور صوبائی دربار میں عہدے بھی دیئے گئے اس خاندان کے پاس جاگیر کے علاوہ بیس دیہات کی زمین کے مالکانہ حقوق تھے۔ سیالوں کی شاخ ملتان کے تحصیل کبیر والا میں بھی آباد تھی اس خاندان کے افراد خطابوں اور عہدوں سے مالا مال تھے۔

ملتان میں مخدوم قریشیوں کے آباؤ اجداد شیخ بہاؤالدین ذکریا کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ سکھوں کے زمانے میں اس مزار کے نام پر جو جاگیر دار تھی وہ ضائع ہو چکی تھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس خانقاہ کے جانشین مخدوم شاہ محمود نے انگریزوں کو خفیہ اطلاعات پہنچائیں

گھوڑسوار مہیا کیے اور اپنے مریدوں کو منع کیا کہ وہ مجاہدین کا ساتھ نہ دیں۔ انگریز ان سے بہت خوش ہوا اس نے مخدوم شاہ محمود کو تین ہزار روپے نقد انعام کے علاوہ 1780 روپے کی جاگیر اور آٹھ کنویں دیئے جب وائسرائے لاہور آیا تو اس نے اسے بھنگیاں والا باغ بھی بخش دیا۔ شاہ محمود کی وفات پر اس کی اولاد کو بھی بے شمار جاگیروں، زمینوں، القابوں اور خطابوں سے نوازا گیا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد بڑے بڑے عہدوں پر بھی تعینات کیے گئے۔

میانوالی کے خدایار اور ملک برخوردار خان نے ملتان کے فسادات میں انگریزوں کا ساتھ دیا حالانکہ اس خاندان نے سکھوں سے بھی خوب مالی فائدے اٹھائے تھے۔ فتح خان کے پوتے خان صاحب ملک امیر نے انگریزوں کی ہر طرح سے خدمت کی۔ ملک امیر خان اور ان کے بیٹے ملک مظفر علی نے جنگ عظیم میں اپنے ضلع سے سینکڑوں لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا۔ 1919ء کی جنگ آزادی میں حریت پسندوں اور تحریک خلافت کے بارے میں معلومات انگریزوں کو فراہم کی۔ مسلمانوں کی مخبری کے صلہ میں انہیں خان صاحب بہادر کا خطاب نصیب ہوا۔ انہیں ڈویژنل درباری کی لسٹ میں شامل کیا گیا، انگریزوں کی خدمت گزاری اور مسلمانوں کی مخبریاں کرنے پر انہیں کیپٹن کے عہدے پر متعین کیا گیا۔ اس خاندان نے انگریزوں کیلئے جو طویل خدمات انجام دی اس کے عوض انہیں 35463 ایکڑ اراضی الاٹ کی گئی۔

پنجاب کا ایک جاگیردار گھرانہ جس کا سربراہ صرف منشی تھا لیکن اس کی اولاد نے انگریزوں سے ساز باز کر کے ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ روح کانپ اٹھتی ہے اس خاندان کے پاس فیصل آباد، لاہور، پاکپتن اور منٹگمری کے پاس ہزاروں ایکڑ اراضی ہے جو صرف اور صرف مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر حاصل کی گئی۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس خاندان کے امام الدین نے دو دستے انگریز کے حکم پر دہلی بھیجے۔ جنھوں نے حریت پسندوں کا خون ناحق بہایا اور انہیں اذیت ناک موت سے دوچار کیا۔ اس خاندان کو انگریز کی خدمت گزاری کے صلہ میں 5600 ایکڑ جاگیر عنایت کی۔ امام الدین کے اکلوتے بیٹے غلام محبوب سبحانی کی انگریز سرکار نے اپنا وفادار اور جاں نثار سمجھتے ہوئے آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

بنایا۔ اس کے علاوہ انہیں دو ہزار ایکڑ زمین منٹگمری میں الاٹ کی۔ یہ خاندان انگریزوں کے ایماء پر مسلمانوں پر مظالم ڈھا کر پروان چڑھا۔ اس خاندان کا پنجاب کے بڑے جاگیرداروں میں شمار ہوتا ہے۔

میانوالی بچھراں خاندان کے ملک امیر خان اور ان کے بیٹے ملک مظفر علی خان نے جنگ عظیم میں اپنے ضلع کے سینکڑوں لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا۔ جنگ عظیم میں اس خاندان کی خدمات کا الفاظ میں تذکرہ مشکل ہے۔ 1914ء میں انہیں خان بہادر صاحب کا خطاب دیا گیا۔ 1919ء کے فسادات اور ہنگاموں میں بھی ان کی خدمات انگریزوں کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ ان کی دی ہوئی معلومات انگریزوں کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ خان بہادر ملک امیر خان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے خان بہادر کیپٹن ملک مظفر خان نے بچھراں قبیلے کی باگ دوڑ سنبھالی۔ انھوں نے 527 افراد کو جنگ عظیم میں بھرتی کرایا۔ انگریزوں سے وفاداری کے صلہ میں پیر محل کالونی میں اے کلاس جاگیر الاٹ کی گئی۔ انگریزوں سے وفاداری کی طویل رفاقت کی بناء پر انہیں 1932ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ انگریز سرکار کی طویل خدمات کے عوض انہیں 35463 ایکڑ اراضی الاٹ کی گئی۔

میانوالی کے میاں سلطان علی کا ایک بیٹا میاں محمد حیات ڈسٹرکٹ درباری اور ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ اس نے جنگ عظیم میں 240 افراد بھرتی کرائے۔ اس صلہ میں جنگ کے بعد اسے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریکروٹنگ تعینات کیا گیا۔ سلطان علی کے پوتے میاں فتح شیر بھی انگریزوں کے وفادار تھے۔ انگریزوں سے تعاون کے صلہ میں نمبردار بنایا گیا۔ پانچ گاؤں نیلی بار اور پانچ مربعے زمین الاٹ کی گئی۔ اس خاندان کے ایک اور وارث ملک علی نے جنگ عظیم میں انگریز کیلئے شاندار خدمات انجام دیں ان کا بیٹا محمد اکبر بھی باپ کی طرح انگریزوں کا جانثار تھا۔ رولٹ ایکٹ اور تحریک خلافت نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے مگر ملک علی اور اس کے بیٹے نے اس تحریک میں مسلمانوں اور ہندوستان کے بسنے والے بے گناہ انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ باپ اور بیٹا انگریزوں کے وفادار دوست تھے اور انہیں ایسی معلومات فراہم

کرتے تھے۔جس سے تحریک خلافت چلانے والوں کونقصان اورانگریزوں کوفائدہ ہوسکتا تھا۔بعد ازاں محمد اکبرکومیونسپل کمیٹی ،میانوالی کا نائب صدر نامزدکیا گیا۔انہیں اپنے ضلع میں اہم شخصیت کا پروٹوکول بھی حاصل تھا۔انہیں 1935ء میں تاج برطانیہ کیلئے دی گئی خدمات کے صلہ میں سلور جوبلی میڈل دیا گیا۔اس خاندان کے میاں شیر محمد اورمیاں سرفراز نے نہ صرف سرکاری ملازمتیں اورعہدے حاصل کئے بلکہ تاج برطانیہ کی طرف سے انگریزوں کی وفاداری کے صلہ میں سلور جوبلی میڈل بھی حاصل کئے۔

میانوالی کے جاگیرداروں میں عیسیٰ خیل کے نیازی انگریز دور میں نمایاں ہوئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں عیسیٰ خیل کا خاندان حریت پسندوں کے خلاف سرگرم تھااورآزادی کی تحریک کو کچلنے کیلئے انگریزوں سے ہرطرح کا تعاون کرتا رہا۔محمد ایاز خان کے پاس حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے ایک گھڑسوار دستہ تھا جو بنوں کے ڈپٹی کمشنر کی ہدایت پر کام کرتا تھا انہیں صلہ کےطور پر 250 روپے پنشن کا حقدار ٹھہرایا گیا۔اس دستے نے ضلع ہوشیار، پٹولی ،منگومی اور جمال پور میں حریت پسندوں کو عبرتناک سزائیں دیں۔ یہ خاندان پشت در پشت انگریزوں کا وفادار رہااوراس صلہ میں پنشن، جاگیر، خان بہادراور خان صاحب جیسے خطابات حاصل کرتا رہا۔ جنگ عظیم کے دوران بڑی تعداد میں میانوالی سے فوج میں بھرتی ہوئی۔اس جنگ میں انگریزوں کی حمایت کے لئے سردھڑ کی بازی لگادی۔جس کے عوض انہیں کئی تعریفی سرٹیفکیٹ اورسندیں عنایت کی گئیں۔محمد عبداللہ ،فیض اللہ، محمد سرفراز خان، محمد نواز، عبدالرحمان، محمد نواز سے لیکر خان بہادر عبدالرحیم خان عیسیٰ خیل تک سب نے سرکاری عہدے اورخطابات حاصل کئے۔اس کے عوض انھوں نے مسلمانوں کی مخبریاں کیں، تحریک آزادی اورحریت پسندوں کے خلاف سازشیں کی۔

کالا باغ کے نواب بھی انگریزوں کے وفادار رہے۔ جب انگریزوں نے ان کے علاقے پر قدم رکھا تو اس خاندان نے انگریزوں کی مدد کی اور''ایڈورڈ'' کوسکھوں کے مقابلہ میں سامان رسد اور گھڑسواروں کی کمی نہ آنے دی۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس خاندان کے

مظفر خان اور اس کے بیٹے نے سینکڑوں جانثاروں پر مشتمل دستہ ایڈورڈ کی کمان میں دیا۔ اس کے صلہ میں مظفر خان کو خان بہادر کے لقب سے نوازا گیا۔ 1863ء میں باپ کے انتقال کے بعد مظفر خان کالا باغ کے رئیس بن گئے۔ اس نے افغانستان جنگ میں انگریزوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کی۔ مظفر خان کے بعد اس کے بیٹے ملک عطا محمد کالا باغ نے جنگ عظیم میں اپنے والد سے بڑھ کر انگریزوں کی خدمت کی۔ اس نے لڑنے کیلئے ہزاروں سپاہیوں کا تحفہ بھی پیش کیا۔ انگریز سرکار نے اس خدمت کو سراہتے ہوئے دہلی میں ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا جس میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ اس کے علاوہ سرٹیفکیٹ اور بہت سے میڈل عطا کئے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد انگریزوں کا وفادار، جنگ آزادی کا مخالف، تحریک آزادی اور حریت پسندوں کا دشمن، نہ صرف مسلم لیگ میں شامل ہوا بلکہ گورنر بھی بنا۔

نون خاندان کے سربراہ خان بہادر ملک محمد حاکم خان 1857ء کی جنگ آزادی میں ملک فتح شیر خان ٹوانہ کے ساتھ تھے۔ اس نے کئی شورش زدہ علاقوں میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے بارے میں انگریز جرنیلوں کی رائے تھی کہ ان جیسے بہادر انسان صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ 1857ء میں انھوں نے جو خدمات انجام دی تھیں اس کے صلہ میں ان کے لئے بہت بڑی جاگیر اور 275 روپے سالانہ انعام مقرر کیا گیا۔ 1888ء میں انہیں ڈویژنل درباری کی حیثیت بھی مل گئی اور اسی سال خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ ان کے کزن محمد حیات خان نون بھی ڈویژنل درباری بنے تھے۔ محمد حیات خان کے بیٹے فیروز خان نون کو 1936ء میں انگلستان کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا اور بعد میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ انگریزوں کے اس وفادار خاندان کے چشم و چراغ فیروز خان نون پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔

پنجاب کے دوسرے موقع پرست جاگیردار خاندانوں کی طرح کھر خاندان نے بھی جاگیر حاصل کرنے اور سرکاری خطاب حاصل کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیا۔ اس خاندان نے بھی انگریز سرکار سے اپنی وفاداری کی قسمیں کھائیں۔ 1848ء میں جب سکھوں کے ساتھ

تصادم سے انگریز سامراج کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور وہ سکھوں کے ساتھ دوسری فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ محمد سرفراز کھرل نے اپنی فوج بنا کر لڑائی میں حصہ لیا۔ انگریز کھرلوں کے اس عملی تعاون سے بہت خوش ہوئے اس بہادری کے عوض 500 روپے پنشن کے علاوہ ریاست کمالیہ کے مالیہ سے 275 روپے سالانہ بطور انعام دیئے۔ کھرل سردار سرفراز خان نے انگریزوں کی اطاعت و وفاداری کو اپنا شعار بنایا ہوا تھا اس نے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے انگریز کیلئے جاسوسی کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس نے ''انفنس'' کے قتل کی اسکیم میں ایک مسلمان سردار کی حیثیت سے شرکت کرنے کے بعد اسے دو گھنٹے پہلے طشت از بام کر کے گورے آقا کی جان بچائی۔ 1857ء کی آزادی کی تحریک کو کچلنے کیلئے کھرل سردار کی معلومات بڑی مفید ثابت ہوئیں اور جب آزادی کی تحریک کو انگریزوں نے پوری طاقت سے کچل دیا تو انہیں خان بہادر اور خلعت کے علاوہ 575 روپے سالانہ پنشن مقرر کی گئی۔ ان کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے امیر محمد خان کھرل نے مقامی انتظامیہ کے ساتھ ہر مشکل میں تعاون کیا۔ 1884ء میں بھی امیر علی نے بے چینی کی تحریکوں کو دبانے میں انتظامیہ کا ساتھ دیا۔ اس خاندان کی انگریز سرکار سے وفاداری کا سلسلہ جاری رہا تو دوسری طرف انگریزوں کی جانب سے انعامات اور سرکاری خطاب دینے کا سلسلہ نہ رکا۔ انگریز سرکار نے ملتان، لائل پور، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور منٹگمری میں دیہاتوں کے مالکانہ حقوق اور کئی سو مربع زمین عطا کی۔ قیام پاکستان سے قبل اس خاندان نے یونینسٹ پارٹی کا ساتھ دیا اور قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ آج بھی اس خاندان کے سرکردہ افراد کسی نہ کسی سیاسی جماعت میں مل جائیں گے۔ ان جاگیرداروں نے تاج برطانیہ سے وفاداری نبھانے اور جنگی خدمات سرانجام دینے کے لئے مسلمانوں کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگے اس کے بدلے انگریز حکمرانوں نے اپنے من پسند اور وفادار خاندانوں کو جاگیروں، زمینوں، انعامات اور خطابات سے نوازا۔

ریشمی رومال تحریک کا آغاز مولانا محمود الحسن دیوبندی نے کیا تھا اس انقلابی تحریک کے

روح رواں ان کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی تھے جنہوں نے اپنے استادمحترم کی ہدایت پر اس تحریک کو پروان چڑھایا۔اس تحریک کوشروع کرنے کے پس پشت یہ خیال کارفرما تھا کہ ہندوستان سے فرنگیوں کو بغیر تشدد کے نکالنا ناممکن ہے چنانچہ انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کی ایک بین الاقوامی فوج تیار کی جائے جسے جنود ربانیہ کا نام دیا گیا۔ریشمی رومال تحریک میں بھی مسلم اقلیتی صوبوں اور سندھ کے جانثار اور ثابت قدم رہنما شریک رہے۔اس تحریک کے قابل اعتماد اور اہم ممبران میں حاجی ترنگ زئی' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا محمد میاں الجوی' مولانا عزیز گل' مولانا ظہور محمد خان سہارنپوری' شیخ عبدالرحیم سندھی' مولانا احمد اللہ پانی پتی' مولانا غلام محمد دین پوری' مولانا فضل ربی' مولانا ابوالحسن' تاج محمد امروٹی' ڈاکٹر انصاری، مولانا عبدالرحیم رائے پوری' مولانا محمد صادق کھڈہ، (کراچی) حکیم فتح محمد سہوانی (کراچی)، حاجی عبداللہ ہارون (کراچی) اور مولانا محمد ابراہیم سندھی (کراچی) وغیرہ شامل تھے۔

ریشمی رومال تحریک کے پیغام اور احکامات ریشمی کپڑے کے ٹکڑوں پر تحریر کئے جاتے تھے۔ان خطوط کے لئے کاغذ کی بجائے ریشمی کپڑے کے استعمال کا مقصد انہیں فرنگی سپاہیوں کی نگاہوں سے بچا کر تحریک کے کارکنوں تک پہنچانا تھا۔مگر غداروں نے اس انقلابی تحریک سے دغا کرتے ہوئے مسلمانوں کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔مولانا عبیداللہ سندھی تحریک کے احکامات اور پیغامات کابل سے کسی معتبر شخص کے ہاتھ ہندوستان میں موجود تحریک کے لوگوں تک پہنچاتے تھے تحریک کے اہم ترین خطوط کابل سے عبیداللہ سندھی نے شیخ عبدالرحیم کو پہنچانے کے لئے عبدالحق نامی شخص کو دیئے گئے تھے مگر سرگودھا سے تعلق رکھنے والا یہ شخص انگریزوں کا ایجنٹ نکلا۔اس نے وہ خطوط حیدرآباد میں شیخ عبدالرحیم کو پہنچانے کے بجائے ملتان کے خان بہادر رب نواز کے حوالے کر دیئے تاکہ وہ اس کے عوض انگریزوں سے مراعات اور انعامات حاصل کر سکے انگریزوں کے پٹھو رب نواز نے یہ خطوط 14 اگست 1916ء کو کمشنر ملتان کے حوالے کرتے ہوئے بتایا کہ یہ خطوط میرے پاس 4 اگست سے موجود ہیں اور یہ خطوط شیخ عبدالرحیم تک پہنچتے اور

وہاں سے یہ خطوط شیخ الہند کے پاس حجاز مقدس روانہ کئے جاتے۔ عبدالحق اور خان بہادر رب نواز نے غداری کرتے ہوئے مسلمانوں کی اس تحریک کو ناقابل برداشت نقصان پہنچایا۔ اس خدمت کے صلے میں انگریز سامراج نے رب نواز کو خان بہادر کے خطاب سے نوازا اور اسے 12 مربع اراضی عطا کی گئی۔

جاگیردار طبقہ جو پنجاب کی سیاست کا منبع تھا اس کے مفادات برطانوی سلطنت سے وابستہ رہے۔ یہ جاگیردار طبقہ برطانوی راج کو بقائے دوام بخشنے کے لئے دن رات کاوشیں کرتا تھا۔ یہی طبقہ تاج برطانیہ سے وفاداری، تابعداری اور فرمانبرداری میں سرفہرست تھا۔ پنجاب کے جاگیرداروں کی ایک طویل فہرست ہے جنہیں حکومت برطانیہ نے ''خان بہادر'' اور ''سر'' کے خطاب سے نوازا۔ ان میں میاں سر محمد شفیع، میاں سر فضل حسین، چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان، چوہدری سر شہاب الدین، سر سکندر حیات خان، نواب سر مظفر علی خان قزلباش، ملک سر فیروز خان نون، ملک سر خضر حیات ٹوانہ، نواب سر اللہ بخش، نواب سر محمد حیات قریشی، نواب سر فضل علی، نواب سر مخدوم مرید حسین قریشی، نواب سر عاشق حسین، ملک سر محمد امین، نواب صاحب کالا باغ، نواب سر محمد شاہ نواز خان مموٹ، میر سر مراتب علی شاہ، نواب مشتاق احمد گورمانی، نواب سر مہر شاہ، نواب سر مظفر خان اور میر شیر محمد خان جیسے اور بہت سے جاگیردار اور خیر خواہان برطانیہ ہیں جنہیں ان اعزازات سے نوازا گیا بدقسمتی سے یہ ہی جاگیردار پنجاب کے مسلمانوں کے سکہ بند لیڈر شمار ہوتے تھے۔



عالمی جنگ میں پنجاب کا حصہ

برطانوی سامراج کو ہندوستان میں قدم جمانے میں جاگیرداروں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان جاگیرداروں کی بدولت پنجاب فوجی بھرتی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈائر نے لکھا ہے کہ ''لارڈ رابرٹ اور لارڈ کچنر جیسے عظیم عسکری ماہرین کے دلائل ناقابل تردید ہیں کہ اگر ہندوستان کے 30 کروڑ عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے 75 ہزار برطانوی (جن کی تعداد اب صرف 60 ہزار کے لگ بھگ رہ گئی تھی) اور ایک لاکھ 60 ہزار مقامی فوجی کافی ہیں تو پھر ہندوستان سے بہترین افرادی قوت کا انتخاب نہ کرنا دانشمندی سے بعید ہوگا اور ایسی افرادی قوت کی اکثریت پنجاب سے دستیاب ہوسکتی ہے۔'' 1862ء میں انڈین آرمی کی 131 پیادہ یونٹوں میں سے 28 کا تعلق پنجاب سے تھا جبکہ نئی صدی کے آغاز تک پنجابی فوجیوں کا تناسب بہت بڑھ چکا تھا۔ 1914ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو انڈین آرمی کے 121 یونٹوں میں سے 57 پنجابی یونٹ تھے۔ انگریزوں نے اپنی تیار کردہ فوج کی کامیابیوں پر انہیں بہادری کے سب سے بڑے اعزاز ''انڈین آرڈر آف میرٹ'' سے نوازا۔ عالمی جنگ میں پنجاب سے ہی بڑے پیانے پر سپاہی برطانوی فوج میں شامل ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کو برصغیر کا بازوئے ''شمشیرزن'' کہا جانے لگا۔ عالمی جنگ میں پنجاب کے جاگیرداروں نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں عوامی اجتماعات منعقد کئے' تاج برطانیہ کے حق میں

قرار دادیں منظور کیں، برطانیہ کی فتح کیلئے دعائیں مانگیں اور تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی گہری وفاداری کا اظہار کیا۔

برطانیہ سے اظہار وفاداری اور عقیدت

برطانیہ سے اظہار وفاداری میں سب سے پہلے پیش رفت پنجاب کے سب سے بڑے شہر اور دارالحکومت لاہور سے تعلق رکھنے والے جاگیرداروں نے کی۔ 8 اگست 1914ء کو ٹاؤن ہال کے میدان میں مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور پارسیوں کا ایک عظیم الشان مشترکہ جلسہ منعقد ہوا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس جلسے میں شریک ہوئی۔ جلسے میں پر جوش تقریریں کی گئیں اور قراردادیں منظور کی گئیں۔ جلسے میں برطانوی فوج کی مکمل فتح اور نصرت کیلئے دعائیں مانگی گئیں۔ انتہائی جوش وخروش کے ساتھ سلطنت برطانیہ کی عظمت اور اس کے دفاع کیلئے ہر قسم کی قربانیاں اور حکومت کو ہر وہ خدمت پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا جو ان سے مطلوب ہو۔ لاہور میں جتنے طبقات اور برادریاں تھیں انھوں نے بھی اپنے اپنے طور پر الگ الگ جلسے کئے اور اپنی وفاداری کے بارے میں قراردادیں منظور کیں۔ ان قراردادوں کو بڑی تعداد میں تار کی صورت میں، شملہ میں واقع لیفٹیننٹ گورنر کے ایوان اور وائس ریگل لاج (Vice Regal Lodge) کو بھیجا گیا۔

نواب محمد علی خان قزلباش کی زیرِ صدارت 12 اگست 1914ء کو برکت علی محمڈن ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں بادشاہ جارج پنجم کے ساتھ مسلمانان پنجاب کی طرف سے اظہار وفاداری وعقیدت کیا گیا اور حکومت انگلینڈ کیلئے دعائیں مانگی گئیں۔ پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے حکومت انگلینڈ کو یقین دلایا گیا کہ مسلمانوں کا ہر فرد برطانوی حکومت کی ہر قسم کی امداد و خدمت کیلئے ہر وقت تیار ہے اس جلسے میں دو قراردادیں منظور کی گئیں پہلی قرارداد میں کہا گیا

"مسلمانان لاہور کا یہ جلسہ عام جو زیر سرپرستی انجمن اسلامیہ پنجاب (لاہور) منعقد ہوا ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے حکومت برطانیہ اور بادشاہ کی خدمت میں

غیر متزلزل اور مکمل وفادار ہے۔ عقیدت شعاری کا اظہار کرتا ہے اور سلطنت کی حفاظت میں اپنی خدمات اور تمام ذرائع پیش کرتا ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبال، ملک برکت علی، میاں شمس الدین، حکیم ڈاکٹر غلام نبی اور ڈاکٹر یعقوب بیگ نے اس قرارداد کی تائید کی۔ دوسری قرارداد میں کہا گیا کہ مسلمانان لاہور کا یہ عام جلسہ قرار دیتا ہے کہ برطانیہ کی فتح و کامیابی کیلئے پنجاب کی تمام مساجد میں دعا مانگی جائے۔''

(حوالہ: پنجاب کی آزادی کی تحریکیں)

راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں آل انڈیا کھتری ایسوسی ایشن کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس 12 اگست کو منعقد ہوا۔ جس میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا کہ جارج پنجم ان کے نزدیک صرف ماں اور باپ کی حیثیت ہی نہیں رکھتے بلکہ وہ ظلِ الٰہی بھی ہیں۔ اس لئے ان کی حمایت کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ 24 اگست کو بادشاہی مسجد لاہور میں عیدالفطر کی نماز پڑھنے کیلئے 20 ہزار کے قریب مسلمان جمع ہوئے۔ انھوں نے جرمن فوج کی شکست اور برطانوی فوج کی نصرت و فتح کیلئے عاجزانہ دعا کی۔ گوجرانوالہ میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ 7 اگست کو بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں ہوا۔ جس میں مولوی نذر حسین (میونسپل کمشنر و امام جامع مسجد) نے بین الاقوامی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ انگریز سرکار محض حقوق و انصاف کی خاطر یہ خطرناک جنگ لڑ رہی ہے۔ چنانچہ انصاف کی حمایت ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس لئے ہم پر اپنے بادشاہ اور گورنمنٹ کی امداد اور جان نثاری لازمی ہے۔ مولوی صاحب نے پرجوش الفاظ میں کہا کہ اگر گورنمنٹ عالیہ قبول کرے تو وہ سب سے پہلے بطور والنٹیر میدان جنگ میں جانے کیلئے تیار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حاضرین کی کثیر تعداد نے پرجوش الفاظ میں اپنی جان و مال گورنمنٹ کی خدمت میں نثار کرنے کی آمادگی ظاہر کی اور والنٹیر بننا منظور کیا۔ مسلمانان ملتان کا ایک جلسہ 4 نومبر 1914ء کو بمقام باغ لانگی خان منعقد ہوا۔ یہ جلسہ ملتان کے معاشرے کے تمام طبقات کی نمائندگی کرتا تھا۔ مختلف تقاریر کے بعد حسب ذیل قراردادیں اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔

الف۔ مسلمانان ملتان کا یہ جلسہ ترکی کے جنگ یورپ میں غیر جانبداری چھوڑنے پر اپنے دلی رنج وافسوس ظاہر کرتا ہے اور اپنی وفاداری کا قیصر ہند کو یقین دلاتا ہے۔

ب۔ یہ جلسہ حکومت ہند کے اس اعلان پر کہ مقامات مقدسہ ملک عرب وعراق پر کسی قسم کا حملہ نہیں ہوگا۔ تشکر کا اظہار کرتا ہے۔

انجمن اسلامیہ چکوال کی جانب سے 16 نومبر کو ایک مدرسے میں تقریباً 4 ہزار افراد پر مشتمل ایک جلسہ منعقد ہوا صدر جلسہ خان بہادر چوہدری اورنگ زیب خان تھے۔ اس جلسے میں مولوی کرم الدین نے اسلامی دلائل سے اپنی تقریر میں ثابت کیا کہ مسلمان مذہباً خدا اور رسول کے حکم سے اپنے بادشاہ کی اطاعت کا پابند ہے۔ اپنی غیر متزلزل اور مستحکم وفاداری کا برطانوی سرکار کو یقین دلایا۔ مقامات مقدسہ کے سلسلے میں برطانوی حکومت کی تعریف کی اور جلسے کا اختتام برطانوی فوج کی فتح ونصرت کی دعا پر ہوا۔

جرمنی کے خلاف جنگ میں برطانیہ کی حمایت کا جوش وجذبہ صرف لاہور، ملتان اور گوجرانوالہ کے شہروں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بالائی پنجاب کے دوسرے شہروں اور قصبوں تک پھیل گیا تھا۔ خصوصاً امرتسر تک جو پنجاب کا دوسرا بڑا شہر اور سکھوں کا سیاسی و مذہبی ہیڈ کوارٹر تھا۔ خالصہ دیوان کے سربراہ اور گولڈن ٹمپل کے منتظم سردار بہادر ارور سنگھ نے لوگوں سے برطانوی حکومت سے وفاداری اور احساسات وجذبات کے اظہار کیلئے اجتماع عام اور اکھنڈ پاٹھ کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ اکھنڈ پاٹھ کے اختتام پر ارداساس (پاٹھ کے اختتام کا نشان) میں اکال پورکھ (اعلیٰ ہستی) کے حضور برطانوی حکومت کی ابدی اور لازوال کامیابی اور یورپی بحران میں یونین جیک کی فتح کے لئے پراتھنا کی۔

ضلع سرگودھا کے مشہور معروف ٹوانہ خاندان نے دوسو پیادوں کی ایک جماعت بھرتی کر کے برطانوی حکومت کی خدمت میں پیش کی۔ انگلستان کے اخبارات نے جن ہندوستانی والنٹیئرز کے کارناموں کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ ان میں ایک رسالدار میجر ملک عمر حیات خان

ٹوانہ بھی شامل تھے۔ ان سے متعلق ایک مختصر نوٹ بمعہ تصویر کے برطانوی اخبارات میں چھپا۔ اس نوٹ کا ترجمہ پیسہ اخبار نے شائع کرتے ہوئے لکھا۔ ''ہندوستان کے بوقلمونی عناصر جو اس آڑے وقت میں یونین جیک کے گرد جمع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ملک عمر حیات خان ٹوانہ کی ذات ہے۔ جنھیں میدان جنگ میں سخت سردی اور برف باری کی وجہ سے پاؤں میں ورم پڑ جانے کے باعث انگلستان آنا پڑا۔''

پنجاب کی مارشل قومیں

سر سکندر حیات ٹوانہ کا شمار بھی تاج برطانیہ کے خیر خواہ اور وفاداروں میں ہوتا تھا انھوں نے تاج برطانیہ کی وفادار فوج میں سب سے زیادہ رنگروٹ بھرتی کر کے تاج برطانیہ کے حکمرانوں کو یہ ثابت کیا کہ پنجاب ہی ان کا سب سے زیادہ وفادار ہے۔ برطانوی سامراج کو مسلمان ممالک کے خلاف کامیابی اور فتح دلوانے کیلئے سر سکندر حیات نے حکومت کے کہنے اور از خود دو مرتبہ جنگ کے محاذوں پر ہندوستانی (بیشتر پنجابی) سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لئے گئے اور انہیں تلقین کی کہ وہ بہادری اور جرأت سے لڑتے ہوئے دشمنوں کو شکست فاش دیں۔ 1941-42ء میں برطانیہ کے وزیراعظم چرچل سے ملاقات کے موقع پر انھوں نے چرچل کو یہ یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی کہ پنجاب ہی وہ واحد صوبہ ہے جو مکمل وفاداری کے ساتھ تاج برطانیہ کے ساتھ ہے اور سب سے زیادہ پنجاب ہی فوج میں سپاہی بھرتی کرتا ہے۔ سر سکندر حیات کے بقول انہوں نے اس ملاقات پر چرچل پر دو باتیں واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔

1۔ برطانوی دولت مشترکہ کی جنگوں کو جیتنے کیلئے ہندوستان کا جو صوبہ حقیقی امداد دیتا ہے وہ پنجاب ہے اور جو طبقہ دلی وفاداری کی ساتھ تعاون کرتا ہے وہ پنجاب کی ''مارشل قومیں'' ہیں۔ لہٰذا اگر ہندوستان کی آزادی کے نام پر ایسا آئین بنایا گیا جس کے تحت کانگریس کے پنڈت اور مہاشے مرکزی حکومت کے ذریعے پنجاب اور اس کی مارشل

قوموں پر راج کرنے لگیں تو یہ بے انصافی اور احسان فراموشی کی انتہا ہوگی۔

2 ۔ وفادار پنجاب اس بات کا مستحق ہے کہ اسے ایک الگ ڈومینین (DOMINION) بنا دیا جائے یا ایسی ڈومینین میں شامل کر دیا جائے جس میں سندھ، بلوچستان اور سرحد بھی شامل ہوں۔

سائیں جی ایم سید پنجاب کے وزیراعظم سرسکندر حیات اور برطانوی وزیراعظم سرونسٹن چرچل کی ملاقات کا احوال کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''جب اتحادیوں اور جرمنی کے درمیان دوسری عالمی جنگ جاری تھی اس وقت مصر میں ہندوستانی فوج انگریزوں کی طرف سے لڑ رہی تھی۔ اس فوج میں سکھ اور پنجابی مسلمان بڑی تعداد میں شریک تھے۔ انگریزوں نے ہندوستانی فوج کا مورال بڑھانے کیلئے سرسکندر حیات خان کو مصر بلوایا۔ سرسکندر حیات نے ہر محاذ پر پنجابی فوجیوں کی ہمت افزائی اور ان کا مورال بڑھانے کیلئے تقریریں کیں۔ مصر میں برطانوی وزیراعظم چرچل نے سرسکندر حیات خان سے ملاقات کی اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہندوستانی فوج (جس میں واضح اکثریت پنجابی کی تھی) کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا......

''ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں سے وفا دکھائی ہے، مسلمانوں نے اس نازک وقت میں ان کی (انگریز سرکار) مدد کر کے ثابت کر دیا ہے کہ آزادی کے بعد بھی وہ انگریزوں کے وفادار بن کر رہیں گے۔ اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان تقسیم کر کے ایک حصہ مسلمانوں کے حوالے کریں گے۔ جہاں ان کی اکثریت ہوگی۔ ہندوستان کے تقسیم شدہ مسلم حصے میں ایک وفادار حکومت ہی اقتدار میں رہے گی جو آگے چل کر مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان ملکوں کی رہنمائی کر کے انگریزوں کیلئے بھی ایک دوست گروہ پیدا کر سکے گی۔ یوں آپ کو مستقبل میں مسلم ملکوں کے

لیڈر کی حیثیت ملنے والی ہے"

سر ونسٹن چرچل نے سر سکندر حیات اور ہندوستانی فوج پر اپنے جس اعتماد کا اظہار کیا تھا اس حوالے سے سائیں جی ایم سید برطانوی سامراج کے زیر سایہ اور زیر تربیت بننے والی ہندوستانی فوج کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب پہلی جنگ عظیم ہو رہی تھی تو یہی پنجابی تھے جنھوں نے انگریزوں کا سپاہی بن کر خانہ کعبہ پر گولیاں برسائی تھیں۔ اس وقت بھی عربوں کی اندرونی بغاوت کو روکنے کیلئے سعودیہ کے حکم پر خود کعبہ ڈھا کر خون خرابہ کرنے کا ذلیل کام انہی فوجیوں نے کیا تھا ..... انگریزی سلطنت کے دنوں میں پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں نے ساری زندگی انگریزی سامراج کی خدمت میں بسر کی۔ لہٰذا سامراجی طاقتوں کو پاکستان کے مسلمانوں کا تجربہ ہے کہ وہ دولت کیلئے کس طرح سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ پاکستان کے حکمران طبقے کی اسلامی تعبیر بھی یہی ہے یعنی دوسرے ملکوں کی آزادی غصب کرنا، عورتوں کو باندی بنانا، لوگوں کو ہلاک کرنا اور غلام بنانا، یہ ایک ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔"

(حوالہ: جی ایم سید کی کہانی)

پنجاب کے جاگیرداروں کی طرف سے برطانوی حکومت کے ساتھ اپنی گہری وابستگی اور جذبات کا اظہار جس وسیع پیمانے پر کیا گیا۔ اس کی بازگشت پنجاب اسمبلی میں بھی سنی گئی۔ 19 ستمبر 1914ء کے اجلاس میں ایک ممبر کے بعد دوسرا ممبر سلطنت برطانیہ کو اس بات کا یقین دلا رہا تھا کہ وہ برطانیہ کی اس عظیم جدوجہد میں اپنے فرائض کی بجا آوری میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کریں گے۔ سکھوں کی طرف سے سردار دلجیت سنگھ، مسلمانوں کی طرف سے محمد شفیع اور ہندوؤں کی طرف سے سر پی چٹر جی سی نے حکومت کو یقین دلایا کہ پنجاب سلطنت متحدہ کے مفاد کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہے۔ پنجاب کے جاگیرداروں کی حکومت کے ساتھ وفاداری کی نوعیت جذباتی ہی نہیں بلکہ اس کے اپنے مفادات پر مبنی تھی۔ یہ طبقہ حکومت کو مدد پہنچانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ڈھونڈتا رہتا تھا خواہ

اس میں عوام الناس کے مفاد کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے یہ طبقہ اپنی خدمت کے عوض حکومت سے زیادہ مراعات حاصل کرتا تھا یہ روباری طبقہ جو بڑے بڑے ساہوکاروں، بنیوں، صنعتکاروں اور بینکاروں وغیرہ پر مشتمل تھا حکومت سے اپنی وفاداری بڑی شدومد کے ساتھ ظاہر کرتا رہتا تھا حکومت کی ہمنوائی کرنا اس کے لئے بڑا نفع بخش تھا جنگ میں برطانیہ کی شکست کا مطلب خود ان کی اقتصادی تباہی تھی۔ پنجاب کے جاگیرداروں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اگر انہیں اپنا نام ونمود موروثی شان وشوکت کو برقرار رکھنا ہے تو وہ اپنی وفاداریاں برطانوی حکومت کے ساتھ وابستہ کردیں۔

پنجاب فوجی بھرتی کا مرکز

پہلی عالمی جنگ کے دوران ہندوستان بھر سے 7 لاکھ 26 ہزار رنگروٹ بھرتی کیے گئے ان میں سے نصف تقریباً ساڑھے تین لاکھ صرف پنجاب نے دیئے حالانکہ پنجاب کی آبادی ملک کی مجموعی آبادی کا صرف 17 فیصد تھی۔ اپریل 1917ء میں پنجاب میں فوجی بھرتی کے لئے علاقائی بھرتی کا نظام نافذ کیا گیا اس کے تحت تمام علاقوں کا کوٹہ مقرر کیا گیا بھرتی ٹیم کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ تمام علاقوں، نسلوں اور مذہبی فرقوں سے فوجی بھرتی کرسکتی ہے فوج کی تنخواہیں بڑھادی گئیں اور انہیں بونس دینا بھی قرار دیا گیا لوگوں کو فوج میں بھرتی کی طرف راغب کرنے کے لئے پنجابی میں بعض سلوگن یا ٹپے بھی تیار کئے گئے۔

بھرتی ہو جا او ئے
باہر کھڑے رنگروٹ
بھرتی ہو جا
ایتھے تے پاٹا ئیں پاٹے ہوئے کپڑے
اوتھے پا ئیں گا سوٹ
بھرتی ہو جا او ئے باہر کھڑے رنگروٹ

اتھے تے پانائیں ٹٹے ہوئے چھتر

اوتھے پائیں گا بوٹ

بھرتی ہو جاوے باہر کھڑے رنگروٹ

(حوالہ: پنجاب اور آزادی کی تحریکیں)

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان سے رنگروٹوں کی بھرتی کے حوالے سے احمد سلیم لکھتے ہیں۔ ''پہلی جنگ عظیم کے دوران بھرتی کے نتیجے میں ہندوستان بھر سے 7,26000 رنگروٹ بھرتی کئے گئے۔ ان میں تقریباً نصف 3,50,000 صرف پنجاب نے دیئے جبکہ پنجاب کی آبادی 240 لاکھ تھی۔'' لیفٹیننٹ گورنر اوڈوائر کے مطابق پنجاب نے لڑائی کے شروع میں ہی جوان اور افسر ملا کر، کوئی ایک لاکھ کی نفری میدان میں اتار دی۔'' جنگ کے خاتمے تک پانچ لاکھ پنجابی فوجی الگ الگ پلٹنوں کے شعبوں میں خدمت کر چکے تھے۔ چار سالہ لڑائی کے دوران سارے ہندوستان میں کی گئی فوجی بھرتی کے نصف سے، پنجاب میں سے کی گئی۔''

وی، این دت اپنی تصنیف '' جلیانوالہ باغ'' میں لکھتے ہیں کہ'' پنجاب کی آبادی تو تمام ملک کی آبادی کا 13 فیصد تھی لیکن فوجی رنگروٹوں کی بھرتی یہاں سے 60 فیصد ہوئی۔'' 1917ء میں فوجی بھرتی کا کام سول ایڈمنسٹریشن نے سنبھال لیا تھا۔ حکومت ہند نے ایک مرکزی فوجی بھرتی بورڈ قائم کیا۔ اس طرح کے صوبائی فوجی بھرتی بورڈ قائم کئے گئے۔ صوبائی بورڈ کا سربراہ صوبے کا لیفٹیننٹ گورنر ہوتا تھا۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر اوڈوائر کے بیان کے مطابق '' یکم جولائی 1917ء سے لیکر ایک سال میں پنجاب سے 2 لاکھ چار ہزار رنگروٹ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حکومت پنجاب کے ایڈیشنل سیکریٹری مسٹر ایل فرنچ کے مطابق جولائی 1917ء سے لیکر مارچ 1918 تک 13610 کی ماہانہ اوسط کے حساب سے کل بھرتی ایک لاکھ بائیس ہزار چار سو بانوے (1,22,492) تک پہنچ گئی تھی۔' بمبئے کرانیکل کی رپورٹ کے مطابق 1918ء میں، پنجاب میں فوجی بھرتی اپنے عروج پر تھی۔ دسمبر 1917ء میں ملتان ڈویژن میں بھرتی پانچ سو

اسی (580.11) کی شرح سے ہوئی جو نومبر 1918ء میں ترانوے نسبت ایک (93.1) کی شرح تک بڑھ گئی۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار فوجی بھرتی کے معاملے میں پنجاب کے زبردست جوش و خروش کو ظاہر کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ جنگ عظیم میں برطانوی سامراج کو شکست سے بچانے کیلئے جاگیرداروں نے پنجاب کے آخری بچے تک کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''جنگ عظیم اول کے دوران برطانوی حکومت نے نئی فوجی بھرتی کا زیادہ تر انحصار پنجاب کی دیہی آبادی پر ہی رکھا جو کہ کئی سالوں سے ہندوستانی فوج کا جزو اعظم چلی آ رہی تھی۔ مذہبی لحاظ سے پنجاب کے پنجابی بولنے والے مختلف مذہبی گروہوں کی فوج میں بھرتی کا تناسب درج ذیل تھا۔

1۔ مسلمان =	190,078
2۔ ہندو =	83515
3۔ سکھ =	97,016

جنگ عظیم اول کے دوران فوجیوں کی تنخواہ اور پنشن بڑھا دی گئی اور ایک زائد بونس کا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔ 1917ء میں ایک تخمینہ کے مطابق پنجابی فوجی نے مجموعی طور پر اپنے گھر والوں کو تنخواہ کے طور پر جو رقم بھیجی وہ ساڑھے چار کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اس کے علاوہ جنگ کے دوران ہندوستانی فوجیوں نے جو قربانیاں تھیں اس کے صلے میں انہیں انعامات اور تمغہ سے نوازا گیا۔ پہلا ہندوستانی سپاہی جس نے ''وکٹوریہ کراس'' حاصل کیا۔ وہ ضلع جہلم کا جمعدار خداداد خان تھا۔ کل اعزازات جو پنجابی سپاہیوں نے حاصل کئے وہ درج ذیل ہیں۔

وکٹوریہ کراس	3	(ہندوستانی فوج کے لئے کل 16 میں سے)
ملٹری کراس	22	(99 میں سے)
آرڈر آف برٹش انڈیا	125	
انڈین آرڈر میرٹ	374	

انڈین ڈسٹنگویشڈ سروس میڈل	1137	
انڈین میریٹورس سروس میڈل	513	
دیگر مختلف اعزازات	30	
فارن ڈیکوریشن	110	(210 میں سے)

ان انعامات واعزازات کیساتھ معاشی فوائد بھی جنگ کے دوران بڑھا دیئے گئے تھے زیادہ اونچے انعامات و اعزازات کے ساتھ خصوصی پینشن اور زرعی زمینیں بھی الاٹ کی جانے لگیں۔زمین کی الاٹمنٹوں کے فیصلے کے طفیل ایک اندازے کے مطابق جنگ کے اختتام پر 4 لاکھ 20 ہزار ایکڑ اراضی وائسرائے کمیشنڈ اور دیگر افسران میں جن کی تعداد 5902 تھی، تقسیم کی گئی۔ وائسرائے کمیشن کے خاص خاص دوسوافسروں کو خصوصی جاگیریں بھی تقسیم کی گئی اور ساتھ ہی ان جاگیروں پر مالیہ بھی معاف کردیا گی مالیہ کی معافی تین نسلوں تک چلتی تھی۔تمام علاقوں سے زیادہ صوبہ پنجاب کے فوجیوں نے یہ انعامات حاصل کیے۔کل ہندوستانی فوج کے لئے 14000 خصوصی پنشنیں تھیں۔ جو بالعموم دس روپے ماہانہ ہوتی تھیں یہ ایسی پنشنیں تھی جو فوجی کو مرنے کے بعد اس کی اگلی نسل کو بھی ملتی رہتی تھیں۔یہی نہیں بلکہ وی سی او میں 200 جاگیریں تقسیم کی گئیں۔ پنجاب کی حکومت نے ایک لاکھ اسی ہزار (180,000) ایکڑ نہری زمین انعام یافتہ فوجیوں میں تقسیم کرنے کے لئے مختص کی۔افسروں کو 150 ایکڑ اراضی دی گئی۔دوسرے فوجیوں کو 25 ایکڑ نہری زمین الاٹ کی گئی۔ جو دیہات فوجی بھرتی میں سب سے نمایاں رہے تھے، ان کی زمین کا مالیہ بھی معاف کردیا گیا۔

فوجیوں کو ملنے والی یہ خصوصی پنشنیں اور نہری زمینوں کی تقسیم انگریز گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستانی فوج کی بہتر کارکردگی کا ایک کھلا اعتراف تھا اور ان کی حوصلہ افزائی کا ایک پہلو لئے ہوئے تھا۔اس کے علاوہ گورنمنٹ نے فوج کو مزید حوصلہ افزائی کے لئے کئی اور اقدامات بھی کیئے۔مثلاً ہندوستانی فوج کے سات فوجی نمائندوں کو وائسرائے کی کونسل میں شامل کرلیا گیا۔ان

میں سے تین فوجی نمائندوں کا تعلق پنجاب سے تھا۔''

(حوالہ: فوج اور پاکستان۔عبداللہ ملک)

ہندوستان کی فوج کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے تاریخی خطبہ الہ آباد میں فرمایا تھا۔

''اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بھرپور موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر نشوونما کر سکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں چاہے یہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات' ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب جس کی 56 فیصد آبادی مسلمان ہے' ہندوستان کی لڑاکا فوج کی 54 فیصد نفری مہیا کرتا ہے اگر ہندوستان کی پوری فوج سے آزاد ریاست نیپال کے 19 ہزار گورکھوں کو نکال دیا جائے تو پنجاب کا حصہ تمام ہندوستانی فوج کا 62 فیصد ہو جاتا ہے جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ممالک کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔''

☆☆☆☆☆

یونینسٹ پارٹی
مخالفین پاکستان کی آماجگاہ

جاگیرداروں نے فیوڈل سسٹم کو تحفظ دینے اور سیاست میں اپنے تسلط کو قائم رکھنے کیلئے یونینسٹ پارٹی کی شکل میں ایسی جماعت کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کے نزدیک انگریز سامراج سے وفاداری جز ایمان کا حصہ تھی۔ ان جاگیرداروں نے عالمی جنگوں میں انگریز سامراج کا دامے درمے سخنے ساتھ دیا۔ یونینسٹ پارٹی نے برطانوی راج کو بقائے دوام بخشنے کے لئے دن رات کوششیں کیں۔ غیر ملکی آقاؤں کے مفادات کے محافظ بن کر ان کا تادم آخر تحفظ کرتے رہے۔ یونینسٹ پارٹی نے انگریز حکومت کے متزلزل ہونے اور پاکستان کے ابھرنے تک سفید فام آقاؤں کی ہر لمحہ خدمت کی۔ جاگیردار مذہب' نسل اور رنگ کی تفریق کے بغیر یونینسٹ پارٹی میں متحد رہے۔ مفاد پرست' موقع پرست' ضمیر فروش' خوشامدیوں' اور چاپلوس جاگیرداروں کی یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ گورے حکمرانوں کی آنکھ کا تارا بنے رہیں اپنے مذموم مقاصد کے لئے جاگیردار یونینسٹ پارٹی کے گرد ہالہ بنائے رکھتے تھے۔

یونینسٹ پارٹی نے ایک جانب انگریزوں کے مرہون منت جاگیرداری نظام کو مضبوط کیا تو دوسری جانب انگریز سامراج کی ایماء پر تحریک آزادی' تحریک خلافت اور تحریک پاکستان کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ ان تحاریک کو بزور طاقت کچلنے کے لئے انگریز سامراج کو فوجی طاقت فراہم

کی۔ یونینسٹ پارٹی کے مرکزی رہنماؤں سر فضل حسین، سر سکندر حیات اور خضر حیات ٹوانہ نے غیر ملکی آقاؤں کی قدم قدم پر خدمت کی ان کے مفادات کا تحفظ کیا۔ یونینسٹ پارٹی کے ان ہی جاگیرداروں نے نظریہ پاکستان اور قائداعظم کی مخالفت کی۔ یہی جاگیردار پنجاب کی سیاست کے ناخدا تسلیم کئے جاتے تھے۔ یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین کے بارے میں پنجاب کے دانشوروں اور سیاستدانوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ اگر پنجابی مسلمانوں میں کوئی ہیرو پیدا ہوا ہے تو وہ سر فضل حسین ہی ہے۔ جس طرح رنجیت سنگھ پورے پنجاب کا ہیرو ٹھہرتا ہے اسی طرح سر فضل حسین دور جدید میں پنجابی مسلمانوں کا ہیرو ٹھہرتا ہے۔ پنجاب کے دانشور اور سیاسی رہنما سر محمد ظفر اللہ خان نے فضل حسین کے بارے میں کہا تھا۔

''یونینسٹ پارٹی کا قیام ایک سیاسی شاہکار ہے۔ یونینسٹ پارٹی کے روح رواں میاں سر فضل حسین ہر پنجابی کے مخلصانہ شکریہ کے مستحق ہیں''

فیروز خان نون نے سر فضل حسین کے بارے میں کہا تھا۔

''اگر کسی فرد نے جمہوریت کی تائید میں سب سے زیادہ گرانقدر حصہ ادا کیا ہے تو وہ سر فضل حسین تھے جنھوں نے یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ جو 1924ء سے 1946ء تک حکمران پارٹی کی حیثیت سے پنجاب میں چھائی رہی۔''

یونینسٹ پارٹی کو صوبہ پنجاب میں جو مقبولیت حاصل رہی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہیں پنجاب کے مراعات یافتہ طبقے اور جاگیرداروں کی مکمل حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ اس طبقے کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ یونینسٹ پارٹی ہی ان کے حقوق کی واحد علمبردار اور ان کی نجات دہندہ ہے۔ یہی وجہ ہے تھی کہ قائداعظم اپنی سیاسی بصیرت اور طویل سیاسی جدوجہد کے باوجود صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت بنانے میں ناکام رہے۔ صوبہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور اس کے مرکزی رہنماؤں سر فضل حسین، سر سکندر حیات اور سر خضر حیات کی مقبولیت کی ایک وجہ پنجابی شاونزم تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے سیاستدانوں نے قیام پاکستان اور قائداعظم کی کھل کر مخالفت

کی۔ 1936ء کے اوائل میں سرفضل حسین نے لیگ پارلیمانی بورڈ بنانے کی اجازت نہیں دی۔فضل حسین نے قائداعظم کو کہا تھا'' پنجاب کو ہاتھ مت لگاؤ'' جبکہ سرسکندر حیات خان نے اپنی 11مارچ 1941ء کی تقریر میں بالواسطہ طور پر قائداعظم کو متنبہ کیا تھا کہ'' پنجاب کے معاملات میں کسی غیر پنجابی کی مداخلت کو برداشت نہیں کیا جائے گا''

یونینسٹ پارٹی کے رہنماؤں کے ان بیانات سے صاف ظاہر تھا کہ جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں کے نزدیک تحریک پاکستان کی نظریاتی اور بنیادی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ان کی سیاست کا مرکز ومحور ایک ایسا پنجاب تھا جہاں پنجابی قومیت کی بنیاد پر پنجابی ہندو، پنجابی سکھ اور پنجابی مسلمان ملکر حکومت کریں۔ان جاگیرداروں نے ذاتی مفادات کی خاطر یونینسٹ پارٹی کو مضبوط کیا اور اس کے مدمقابل کسی قومی جماعت کو ابھرنے نہیں دیا۔

سرفضل حسین نے جنوری 1921ء میں مسلمان جاگیرداروں اور ہندو جاٹوں کے تعاون سے یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔1936ء تک وہ اس کے سربراہ رہے۔سرفضل حسین کے انتقال کے بعد یونینسٹ پارٹی پر سرسکندر حیات خان براجماں ہوئے انہیں بھی برطانوی سامراج کے ساتھ ساتھ جاگیرداروں اور زمینداروں کی مکمل حمایت حاصل رہی۔سرسکندر حیات خان ٹوانہ نے بھی اسی پالیسی کو جاری رکھا جو سرفضل حسین کے دور اقتدار میں تھی یعنی کہ پنجابی شاونزم کی بنیاد پر یونینسٹ پارٹی کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا جائے۔سرفضل حسین کی طرح سرسکندر حیات خان کے بھی قائداعظم کے ساتھ اختلافات رہے۔اس نے بھی قدم قدم پر قائداعظم کے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں۔پنجاب میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی قومی جماعت کی حیثیت سے ابھرنے نہیں دیا۔سرسکندر حیات کے انتقال کے بعد 1942ء میں سرخضر حیات کو یونینسٹ پارٹی کا سربراہ بنایا گیا۔اس نے بھی قائداعظم کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں مگر قائداعظم کی مسلسل انتھک جدوجہد کی بدولت مسلم لیگ نے پنجاب میں کسی حد تک جگہ بنالی تھی۔1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے 75 امیدوار کامیاب ہوئے مگر ان امیدواروں میں اکثریت ابن

الوقت اور موقع پرست سیاستدانوں کی تھی جنہیں اس بات کا یقین تھا کہ اب پاکستان بنکر رہے گا۔ انھوں نے وقت کے دھارے کو دیکھتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تا کہ پاکستان بننے کی صورت میں انہیں حکومت میں شامل کرلیا جائے۔

خضر حیات بھی سر سکندر حیات اور سر فضل حسین کے نقش قدم پر چل رہے تھے اس نے قائداعظم کیلئے مشکلات پیدا کیں۔ قائداعظم کو اس وقت انتہائی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب 1946ء میں بھی یونینسٹ پارٹی نے پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت بننے نہیں دی۔ یونینسٹ پارٹی نے اکالی، کانگریس اور آزاد امیدواروں کی مدد سے مخلوط وزارت قائم کرلی۔ اس وزارت کے سربراہ ملک خضر حیات ٹوانہ تھے۔ بقول ملک فیروز خان نون کے ''خضر حیات خان نے فروری 1946ء میں کانگریس کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت اس لئے بنائی تھی کہ چند بڑے برطانوی حکام نے یونینسٹ پارٹی کو یقین دلایا تھا کہ برطانیہ ہندوستان نہیں چھوڑے گا، مگر بعد میں سلطنت برطانیہ کے اس اعلان کے بعد کہ مارچ 1948ء تک ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جس میں سے ایک حصہ پاکستان قرار پائے گا۔ خضر حیات کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ وہ حکومت سے مستعفی ہو جائیں یوں قیام پاکستان سے صرف پانچ ماہ قبل یعنی مارچ 1947ء کو خضر حیات حکومت سے مستعفی ہوئے۔

یونینسٹ پارٹی کے مرکزی رہنما سر فضل حسین، سر سکندر حیات اور سر خضر حیات یونینسٹ پارٹی کی تشکیل سے لیکر قیام پاکستان تک مختلف ادوار میں پارٹی کے سربراہ رہے اس دوران انہوں نے دوقومی نظریہ، قیام پاکستان اور قائداعظم کی شدید مخالفت کی اس کا اندازہ ان کے دور حکومت پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بخوبی ہو جائے گا۔

یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین

سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی پر اپنے تسلط کو قائم رکھنے' پارٹی کو مضبوط بنیادوں پر

استوار کرنے کیلئے صوبہ پنجاب کے ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ جاگیرداروں سے اتحاد کیا جو ہر قسم کے علم و دانش کے دشمن تھے جو کئی پشتوں سے برطانوی سامراج کے اتنے وفادار تھے کہ چھوٹا اور بڑا کام اپنے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی اجازت و منظوری کے بغیر نہیں کرتے تھے اس پارٹی میں وہ ''چیف آف پنجاب'' شامل تھے جن کا ماضی اس قدر شرمناک اور گھناؤنا تھا کہ ان سے مسلمانوں کی کسی اجتماعی بھلائی کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی وہ برطانوی سامراج کو اپنا ''مائی باپ'' سمجھتے تھے۔ یونینسٹ پارٹی میں جن بڑے جاگیرداروں نے شمولیت اختیار کی ان میں سرفہرست نواب مظفر علی قزلباش، نواب شاہ نواز ممدوٹ، ملک خضر حیات خان ٹوانہ، ملک سر عمر حیات خان ٹوانہ، سکندر حیات خان، ملک عطا محمد خان، نواب آف کالا باغ، نواب مشتاق احمد گرمانی، میاں احمد یار خان دولتانہ، مرزا غلام احمد سمیت ملتان کے گیلانی اور مخدوم زادے، ضلع جھنگ کے سیال، فیصل آباد کے کھرل، ان سب سے بڑھ کر سر محمد ظفر اللہ خان بھی موجود تھے جنھوں نے پنجاب میں کسی دوسری جماعت کو یونینسٹ پارٹی کے سامنے ابھرنے نہیں دیا۔ 1924ء سے 1946ء تک پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی صورت میں جاگیرداروں کی نمائندہ جماعت برسر اقتدار رہی۔

شہید گنج کے تنازعہ کا پرامن تصفیہ کرانے کی غرض سے جب قائداعظم نے لاہور آنے سے قبل 5 فروری 1936ء کو سر فضل حسین کو خط لکھا جس میں انہوں نے مسلم لیگ کے آئندہ سیشن کی صدارت کیلئے بھی استدعا کی تھی۔ پنجاب کے سامراج نواز اور جاگیرداروں کے لیڈر فضل حسین نے محمد علی جناح کی خواہش پر عمل نہ کیا۔ قائداعظم نے فضل حسین سے مسلم لیگ سیشن کی صدارت کیلئے اس لئے لکھا تھا کہ مسلم اکثریتی صوبے پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر سر فضل حسین تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو مسلم لیگ کو پنجاب میں سیاسی تقویت مل جائے گی اور آئندہ انتخابات کے بعد آل انڈیا کانگریس کیساتھ بہتر پوزیشن میں کوئی سیاسی سمجھوتہ کر سکے گی۔ سر فضل حسین نے محمد علی جناح کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے 16 فروری 1936ء کو دہلی میں سر آغا خان کی زیر صدارت آل پارٹیز مسلم

کانگریس کے ایگزیکٹو بورڈ کے اجلاس میں شرکت کی اور یہ رائے دی۔

''آئندہ صوبائی انتخابات کے بعد صوبوں کے منتخب شدہ مسلمان ممبران کا مرکزی اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے منتخب شدہ مسلمانوں کا ایک کونشن طلب کیا جائے تاکہ مسلمانانِ ہند کی ایک ایسی نمائندہ حیثیت کی مرکزی تنظیم قائم ہو جائے جو مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا احساس کرے۔''

سر فضل حسین کی جانب سے قائداعظم کے دعوت نامہ کو مسترد کرنا اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں ''نمائندہ حیثیت کی مرکزی تنظیم'' کے قیام کا مطالبہ کرنا' ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی مشکلات کا احساس کرنے کی بجائے یہ مطالبہ کرنا کہ ''مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا احساس کرے'' ان کا یہ بیان پنجابی شاؤنزم کا آئینہ دار تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے رہنما قائداعظم کو پنجاب میں کوئی سیاسی مقام و مرتبہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

سر سکندر حیات ٹوانہ

سر فضل حسین کا 9 جولائی 1936ء کو لاہور میں انتقال ہوا تو سر سکندر حیات نے یونینسٹ پارٹی کی قیادت سنبھالی۔ سر سکندر حیات بھی اپنے پیشرو سر فضل حسین کی طرح پنجابی شاؤنزم کے علمبردار تھے وہ پنجابیت کو مذہب و ملت سے بالاتر سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا۔

''اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب میں خالص مسلم راج ہو تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ..... میں پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کے معاملات میں کسی غیر پنجابی بشمول جناح کی مداخلت برداشت نہیں کرتا...... '' پنجاب پنجاب ہے اور یہ پنجاب ہی رہے گا خواہ کوئی کچھ بھی کہے''

(حوالہ: مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقا)

سکندر حیات صرف پنجاب کے مفادات کو اولین حیثیت دیتے تھے باقی ساری چیزیں

اس کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آسمبلی میں بیٹھے ہوئے نمائندوں کو اپنی مہارت' سیاسی دباؤ اور لالچ دیگر مسلم لیگ کے اثر سے محفوظ رکھا۔ دو قومی نظریئے اور ''پاکستان'' کے مقبول ہو جانے کے باوجود پنجاب کے وزیراعظم سکندر حیات نے صوبائی آسمبلی میں مسلم لیگ تشکیل کی اور نہ کبھی اپنی تقریر یا تحریر میں ''پاکستان'' کا لفظ استعمال کیا۔ سکندر حیات نے ''مسلم قوم کے حق خود ارادیت'' کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس نے 8 ستمبر 1940ء کو لاہور کے ایک ہندو اخبار ٹربیون کے نامہ نگار سے انٹرویو میں کہا تھا۔

''میں آج بھی ہندوستان کی تقسیم کا مخالف ہوں اور میرا ابھی تک عقیدہ ہے کہ پنجاب میں نہ کسی ایک فرقہ کی حکومت ہو سکتی ہے نہ ہونی چاہئے۔ یہاں صرف پنجابیوں کی حکومت ہونی چاہئے۔ پاکستان' خالصتان اور اس قسم کی دوسری تحریکات قابل مذمت ہیں اور پنجاب پر صرف پنجابیوں کی حکومت ہو سکتی ہے''

(حوالہ: تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء۔ چوہدری حبیب احمد)

سر سکندر حیات خان پنجابی شاؤنزم کے زبردست حامی اور علمبردار تھے بلکہ قیام پاکستان کے بھی شدید مخالف تھے۔ اس نے صوبائی آسمبلی پنجاب میں 11 مارچ 1941ء کو پاکستان اور مسلم لیگ کے بارے میں انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا تھا:

''یہ کہنا نہایت غلط ہو گا کہ ہماری حکومت مسلم لیگ کی حکومت ہے۔ ہم نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ مسلم لیگ حکومت نہیں ہے کیونکہ اس کے نصف ارکان غیر مسلم ہیں۔ ہماری حکومت خالصتاً پنجابی حکومت ہے۔ اس پنجابی حکومت میں یونینسٹ شامل ہیں جن کی اس ایوان میں قطعی اکثریت ہے۔

مسلم عوام میں لفظ پاکستان کیلئے بڑی دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ یہ دلکش اصطلاح ہے۔ اب یہ مشہور ہو گئی ہے اور اس طرح الجھن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سادہ لوح عوام مختلف اسکیموں میں امتیاز نہیں کر سکتے اور مجھے یقین ہے کہ ایک عام مسلمان کو یہ احساس نہیں

ہے کہ پاکستان میں کیا پیچیدگیاں مضمر ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سی اسکیم کی حمایت کر رہا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی طالع آزماؤں کو سادہ لوح عوام کو بیوقوف بنانے کے وسیع مواقع مل گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے رجحانات اور مصلحتوں کے مطابق عوام کا سیاسی استحصال کرتا ہے"۔

''مسٹر جناح کو بھی، ہر شخص کی طرح، اس دلکش فقیرے کو اپنانے میں فائدہ نظر آتا ہے کیونکہ یہ عوام الناس کی طرح دلکش ہے۔اگر ہندو اور سکھ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو مسلم لیگ اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھائے۔اسے مسلمان پسند کرتے ہیں اس لئے یہ مسلم عوام کی حمایت حاصل کرنے کیلئے ایک آسان نعرہ ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان کے بارے میں واویلا کی ابتداء کی تھی اب مسلمانوں نے یہ نعرہ اپنا لیا ہے۔ چنانچہ دونوں ہی فریق پاکستان کے بھوت کو مقبول عام کرنے کے ذمہ دار ہیں۔جس کا اس وقت تک کوئی وجود نہیں تھا جب تک کہ مسلم لیگ کے مخالفین نے اسے جنم نہیں دیا تھا اور اب دونوں ہی عوام الناس کا استحصال کرنے کیلئے اسے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ غلبہ اور مداخلت کا خیال ترک کر دیا جائے تو مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ایسی صورت میں مسلمان ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے۔اگر وہ اس کے باوجود بھی اصرار کریں تو میرے خیال میں انہیں پاگل خانے بھیجنا مناسب ہوگا۔وہ یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مرکز ایسا طاقتور نہ ہو کہ وہ مسلم لیگ والے صوبوں کے اختیار اور اقتدار کو نقصان پہنچا سکے۔میرے بعض معزز احباب کا خیال ہوگا کہ اگر مرکز کو اہم محکمے دے دیئے گئے تو اس سے صوبوں کو دھونس دینے کی ترغیب ملے گی۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔مرکز میں لچک ہوگی یعنی اس کو دفاع، جہاز رانی، کسٹم، کرنسی، سکہ سازی اور امور خارجہ کے علاوہ صرف وہی محکمے دیئے جائیں گے جن پر سارے یونٹوں کا اتفاق ہوگا اور یہ ضروری نہیں مرکز کے

فیصلے اکثریت کے اصول کے تحت ہوں۔اس مقصد کیلئے کوئی مناسب فارمولا تیار کیا جاسکتا ہے جس کے تحت دوتہائی یا تین چوتھائی کی شرط عائد ہوسکتی ہے۔

ہم ایسی آزادی نہیں مانگتے کہ یہاں مسلم راج ہو اور وہاں ہندو راج ہو۔اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے پنجاب میں خالص مسلم راج ہو تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب اس ایوان میں پھر کہتا ہوں۔اگر آپ پنجاب کے لئے حقیقی آزادی چاہتے ہیں یعنی ایسا پنجاب جس میں ہر فرقہ کو معاشی اور انتظامی شعبوں میں اس کا جائز حصہ ملے تو ایسا پنجاب پاکستان نہیں ہوگا بلکہ وہ صرف پنجاب ہوگا یعنی پانچ دریاؤں کی سرزمین۔پنجاب، پنجاب ہے اور یہ پنجاب ہی رہے گا خواہ کوئی کچھ بھی کہے"۔

(حوالہ: مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقا)

سکندر حیات کی تقریر کے چند اقتباسات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے مرکزی رہنما جاگیرداروں کے نمائندے برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ان کا یہ کہنا کہ" دونوں ہی فریق (مسلمان و ہندو) پاکستان کے بھوت کے مقبول عام کرنے کے ذمہ دار ہے..... جو علیحدگی کا مطالبہ کرے اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے"یونینسٹ پارٹی کے مرکزی قائدین کی یہ گفتگو یقیناً قائداعظم اور تحریک پاکستان کے ہزاروں مسلم رہنماؤں کی تذلیل کے مترادف تھی۔

مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلم لیگ کی برتری

ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان دوقومی نظریہ کی بنیاد پر تحریک پاکستان کی جدوجہد میں شب وروز مصروف تھے وہ اس اصول پر کار بند رہے کہ" بٹ کر رہے گا ہندوستان.....لیکر رہیں گے پاکستان" جبکہ یونینسٹ پارٹی اس نظریہ کی شدید مخالف تھی۔یہی وجہ

ہے کہ 1937ء کے انتخابات میں پنجاب سے مسلم لیگ بامشکل ایک نشست پر کامیاب ہوئی جبکہ قائداعظم کی خواہش تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں سے مسلم لیگی امیدوار بڑی تعداد میں کامیاب ہوں۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے مقابلے میں مسلم اقلیتی صوبوں سے مسلم لیگ کو 70 فیصد تک کامیابی ملی۔ پاکستان کے جغرافیہ سے صرف ایک مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوا جبکہ ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں سے مسلم لیگ کے 107 امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔

1937ء کے انتخابات میں کانگریس اور مسلم لیگ کی جیتی ہوئی نشستوں کی تفصیل

نام صوبہ	کانگریس کی جیتی ہوئی نشستیں	مسلمان نشستیں	مسلم لیگ کی جیتی ہوئی نشستیں
مدراس	159	28	11
بمبئی	86	29	20
بنگال	54	117	40
یوپی	134	64	27
پنجاب	18	84	1
بہار	98	39	-
سی پی	70	14	-
آسام	33	34	9
سرحد	19	36	-
اڑیسہ	36	4	-
سندھ	7	35	-

1937ء کے انتخابی نتائج یہ ثابت کرتے ہیں کہ تحریک پاکستان کا آغاز مسلم اقلیتی صوبوں سے ہوا اور پاکستان کی تکمیل اور تعمیر بھی ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی لازوال قربانیوں اور جدوجہد کی بدولت ہوئی۔ جنہیں ''مہاجر'' کہا جاتا ہے۔ مگر یہ ستم ظریفی ہے

کہ بانیان پاکستان کی حب الوطنی پر شک کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کا تحریک پاکستان میں اپنا کوئی کردار نہیں تھا یہی لوگ آخری وقت تک پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔اس حوالے سے متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔

''سندھ نے پاکستان کے حق میں سائیں جی ایم سید کی سربراہی میں قرارداد منظور کی لیکن آج انہیں غدار قرار دیا جارہا ہے۔اردو بولنے والوں نے پاکستان کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں انہیں غدار کہا گیا سندھ واحد مسلم اکثریت صوبہ تھا جہاں کہ عوام نے پاکستان کے حق میں سو فیصد ووٹ دیئے انہیں بھی غدار کہا گیا جبکہ پنجاب میں آخر تک پاکستان مخالف یونینسٹ پارٹی کی حکومت رہی لیکن وہ لوگ آج تک سب سے بڑے وفادار ہیں۔''

قائداعظم نے انتخابات سے چند ماہ قبل پنجاب کا دورہ کیا تو انہیں کسی بھی جانب سے تعاون نہ ملا۔9 اکتوبر 1936ء کو محمد علی جناح انتخابی مہم کے سلسلے میں لاہور پہنچے تو ان کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ ہوئی۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مولانا ظفر علی خان کی ''مجلس اتحاد ملت'' مسلم لیگ سے اس لئے الگ ہو چکی تھی کہ وہ شہید گنج کے نام پر الگ جماعت کی حیثیت سے الیکشن لڑنا چاہتی تھی اور مجلس احرار نے مسلم لیگ سے اس لئے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ صوبائی مسلم لیگ کے پاس انتخاب لڑنے کیلئے سرمایہ نہیں تھا۔مزید برآں وہ بھی اینٹی قادیانی تحریک کے نام پر الگ جماعت کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لینے کی خواہاں تھی۔ 11 اکتوبر کو دہلی دروازہ کے باہر مسلم لیگ کا جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد مشکل سے ہزار ڈیڑھ ہزار تھی۔تاہم جناح نے اس جلسہ عام میں طویل تقریر کی جس میں انھوں نے سر سکندر حیات اور یونینسٹ پارٹی کی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کی۔اس کے بعد جناح نے تقریباً دو ہفتے تک پنجاب کا دورہ کیا مگر وہ پنجاب کی مسلم رائے عامہ پر نمایاں طور پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

فروری 1937ء کے عام انتخابات میں راجہ غضنفر علی خان نے لیگ کے ٹکٹ پر اپنی

کامیابی کے فوراً ہی بعد سیاسی قلابازی کھائی اور یہ اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو چھوڑ کر کے یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گیا ہے۔ راجہ غضنفر علی خان نے جس جلسے میں مسلم لیگ سے غداری کا اعلان کیا۔ اسی جلسے میں سر سکندر نے تقریر کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایماء سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے لیکن شروع ہی سے انھوں نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ اور جاگیرداروں کے سرغنہ وزیر اعظم سر سکندر حیات خان نے ذہنی طور پر قرارداد پاکستان کو کبھی قبول نہیں کیا تھا وہ بھی پنجابی قومیت کی بنیاد پر صوبائی خود مختاری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تحریک پاکستان کے سلسلے میں انگریز مصنف پلنیڈرل مون اپنی کتاب ''ہندوستان میں اجنبی راج'' (اردو ترجمہ) میں رقم طراز ہے۔

''پاکستان کا مطالبہ تو صرف مسلمانوں (مسلم اقلیتی صوبوں) نے پیش کیا ہے جو کسی صوبے کی معمولی اقلیت ہے پاکستان کے باشندوں کی طرف سے یہ مطالبہ نہیں ہوا۔ سکندر حیات پنجاب کے وزیر اعظم پاکستان کے زبردست مخالف تھے وہ مسلم لیگ کے ممبر بھی تھے مگر پاکستان کا حامی انہیں ہونا پڑتا تھا مگر پاکستان کا جو مطلب وہ لیتے تھے پاکستان اس سے مختلف ثابت ہوا تھا۔''

قائد اعظم کی مخالفت میں یونینسٹ پارٹی کے سربراہ سر سکندر حیات ہی بیانات نہیں دے رہے تھے بلکہ نواب احمد یار خان جیسے کم قد لوگ بھی قائد اعظم پر تنقید کر رہے تھے۔ نواب احمد یار خان نے بھی سیاسی قلابازی کھانے، پارٹی بدلنے اور موقع پرستی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ نواب احمد یار خان دولتانہ کا تعلق سر سکندر حیات خان کے دھڑے سے تھا چنانچہ جب 1936 کے آغاز میں یہ نظر آنے لگا کہ صوبائی خود مختاری کے تحت وزیر اعلیٰ میاں سر فضل حسین ہوں گے تو نواب احمد یار نے یونینسٹ پارٹی کی رکنیت کے باوجود آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ رابطہ و پیام جاری رکھا انھوں نے محمد علی جناح سے ملاقات بھی کی اور انہیں اپنی حمایت کا یقین

دلانے کیلئے خطوط بھی لکھے لیکن جوں ہی میاں فضل حسین کے انتقال کے بعد سر سکندر حیات یونینسٹ پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے اور ان کے پنجاب میں وزیراعلیٰ بننے کے امکانات روشن ہوئے خان بہادر میاں احمد یار دولتانہ' قائداعظم کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ انھوں نے لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات کے کالموں میں یونینسٹ پارٹی کی حمایت میں قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ وہ ابوالکلام کے مقابلے کے ابوالقلم بن گئے۔ نواب احمد یار خان دولتانہ نے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں قائداعظم کو اپنی تنقید کا ہدف بناتے ہوئے ایک بیان میں کہا۔

''مسٹر جناح ہم سے مفت میں جنگ مول رہے ہیں، ہم ان سے لڑنا نہیں چاہتے لیکن وہ ہمیں ہماری مرضی کے خلاف جنگ پر مجبور کر رہے ہیں...... اگر مسٹر جناح نے اپنی موجودہ مہم کو ترک نہ کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ انہیں پنجاب میں سوائے ناکامی اور مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا کچھ بعید نہیں کہ اس قابل اعتراض روش سے تنگ آ کر آئندہ فیڈرل اسمبلی میں پنجاب کے نمائندے مسلم لیگ تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیں اور اس کی بجائے انڈی پینڈنٹ (آزاد) رہنا پسند کریں یا پھر مسلم لیگ کے مقابلے میں دوسری جماعتوں سے مل کر کسی اقتصادی پروگرام کی بناء پر علیحدہ پارٹی بنالیں۔

(حوالہ: پاکستان فوج کی ابتداء۔ از عبداللہ ملک)

سر خضر حیات ٹوانہ

سر سکندر حیات کے انتقال کے بعد یونینسٹ پارٹی کے سربراہ کے طور پر خضر حیات ٹوانہ سامنے آئے۔ مگر خضر حیات کی وزارت میں ملکی اور غیر ملکی سیاسی حالات نے پنجاب کے جاگیرداروں، زمینداروں اور سیاستدانوں کو بھی قلابازی کھانے کا موقع فراہم کیا چونکہ بین الاقوامی سطح پر تبدیلیوں کی صورت میں سیاسی منظرنامے پر پاکستان کا قیام عنقریب نظر آ رہا تھا۔ پنجاب کے موقع پرست جاگیرداروں نے ان سیاسی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے قلابازی کھائی اور راتوں رات مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1946ء کے انتخابات میں پہلی بار پنجاب کی 86

مسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ نے 75 نشستوں پر کامیابی حاصل کی جبکہ ماضی کے انتخابات میں مسلم لیگ نے بامشکل ایک نشست پر کامیابی حاصل کی تھی۔ صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کی یہ کامیابی دراصل بدلتے ہوئے سیاسی حالات تھے جس کی وجہ سے جاگیرداروں نے قبل از وقت جائے پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ 1946ء کے انتخابات میں پاکستان سے مسلم لیگ نے 120 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ جبکہ بنگال اور مسلم اقلیتی صوبوں سے مسلم نشستوں پر 308 مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوئے۔

یونینسٹ پارٹی کے سربراہ ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ نے 1946ء کے انتخابات کے بعد پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت نہیں بننے دی۔ سر خضر حیات خان نے اکالی اور کانگریس کے تعاون سے ایسی وزارت بنائی جس کی حمایت ہندو اور سکھ ممبران نے کی۔ یونینسٹ پارٹی نے 1924ء سے پنجابی قومیت کی بنیاد پر پنجاب میں جو وزارت قائم کی ہوئی تھی اس کی جڑیں اس قدر مضبوط تھیں کہ مسلم لیگ وزارت بنانے میں ناکام رہی۔

مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے 1936ء کے انتخابات کی طرح 1946ء کے انتخابات میں بھی مسلم لیگ کے امیدواروں کو بھاری اکثریت سے کامیاب کرایا تھا۔ جبکہ بمبئی، لکھنؤ، آگرہ، جے پور، جودھپور، بریلی، علی گڑھ، آلہ آباد، رامپور، حیدرآباد دکن، بنارس، جبل پور، احمد آباد، بھوپال، میسور، سوات، بنگلور، کانپور، نینی تال، پونا، علی گڑھ، اجمیر، مراد آباد، بلند شہر، رائے پور، جمشید پور، شاجہاں پور سمیت لاتعداد شہروں اور دیہاتوں میں مسلم لیگ کا پرچم لہرایا اور تحریک پاکستان میں ان شہروں نے مثالی جدوجہد کی تاریخ رقم کی۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے 1946ء کے انتخابات میں اس وقت مسلم لیگ کو ووٹ دیا جب یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ مسلم اقلیتی صوبے پاکستان کا حصہ نہیں ہوں گے مگر پھر بھی پاکستان کے نام پر اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیئے۔ اگر اس وقت اقلیتی صوبوں کے مسلمان ذاتی مفادات کی خاطر یہ فیصلہ کر لیتے کہ وہ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کی

حمایت کریں گے تو انہیں سیاسی، معاشی، اقتصادی فائدے مل جاتے اور قیام پاکستان کے بعد انہیں اس بات کی سزا نہ دی جاتی کہ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے قیام پاکستان کی تحریک میں قائداعظم کا ساتھ کیوں دیا۔ آج بھی ہندوستان کے مسلمان تحریک پاکستان کا ساتھ دینے کی سزا کاٹ رہے ہیں دوسری طرف جاگیرداروں کا وہ ٹولہ ہے جو تحریک آزادی کے آغاز سے لیکر 1946ء تک قائداعظم کی مخالفت کرتا رہا اور جب منزل دو گام رہ گئی تو تمام منحرفین اور مخالفین مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد یونینسٹ پارٹی کا یہی جاگیردار طبقہ فیوڈل سسٹم کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہو گیا۔



یونینسٹ پارٹی کی باقیات

انگریز سامراج نے ہندوستان میں اپنے قبضہ کو طویل عرصہ تک قائم رکھنے کے لئے مقامی جاگیرداروں کا ایسا طبقہ پیدا کیا جو تاج برطانیہ کا مستقل وفادار رہے۔ انگریز حکمران کے نزدیک صرف وہی لوگ منصب اور عہدوں کے حقدار ٹھہرے جنہوں نے مادر وطن سے غداری کی اور انگریز سرکار سے وفاداری نبھائی ان غداروں نے حریت پسندوں اور انگریز دشمن تحریکوں کے بارے میں انگریزوں کو مفید اطلاعات پہنچائی' انگریز حکمرانوں کو طاقت فراہم کی' جنگوں کے درمیان سپاہیوں کی کمی کو پورا کیا ان جاگیرداروں نے برطانوی سامراج دشمن طاقتوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور انہیں آپس میں لڑانے کے لئے پروپیگنڈہ اور سازشیں کیں انگریزوں سے وفاداری کے اظہار کے لئے ایسی انجمنیں قائم کی جنہوں نے انگریزوں کے لئے قصیدہ گوئی کے فرائض بحسن خوبی انجام دیئے۔ انگریزوں کے پیدا کردہ اس طبقے میں جاگیرداروں کی اکثریت تھی جنہیں انگریزوں نے قوم سے غداری کے صلہ میں حویلیاں' محل اور کوٹھیاں عطا کیں ان سیاسی سوداگروں کو سر' نواب' خان بہادر جیسے خطاب ملے ان کے بیٹوں اور دامادوں کو تحصیل دار اور نمبردار بنایا' ڈویژن کے سطح پر خان بہادر' جیسے القاب سے نوازا گیا۔ اس طبقے کا اولین مقصد یونین جیک کی سربلندی اور اس کے اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ انگریزوں کے اس وفادار طبقہ کا ستارہ کبھی غروب نہیں ہوا۔ ان جاگیرداروں نے سیاست اور پارلیمنٹ کو بھی اپنا تابع بنا کر رکھا۔ یہ طبقہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی شکل میں انگریزوں کا انتہائی وفادار اور عوامی جمہوریت کا

بدترین دشمن رہا۔ 1946ء کے انتخابات میں انگریزوں کا یہی وفادار طبقہ مسلم لیگ میں شامل ہوگیا۔ بقول قائد تحریک الطاف حسین

> ''جاگیرداروں اور وڈیروں نے پاکستان کی محبت میں نہیں بلکہ صرف اپنی جاگیریں بچانے کے لئے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی ،قیام پاکستان کے بعد ان جاگیرداروں اور وڈیروں نے جرنیلوں کے ساتھ مل کر پاکستان کیلئے جدوجہد کرنے والے اصل لیڈروں کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔''

قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی کونسل میں جاگیرداروں کا گروپ سب سے بڑا تھا جس میں پنجاب کے جاگیرداروں کی اکثریت تھی جن کی جاگیریں انگریزوں سے وفاداری کی نشانیاں تھیں۔ جب تک یونینسٹ پارٹی اقتدار میں رہی یہ جاگیردار اس پارٹی کا حصہ بنے رہے۔کوئی جاگیردار خاندان ایسا نہ تھا جس نے یونینسٹ پارٹی کی چھتری کے سائے میں پناہ نہ لی ہو۔ 1937ء کے انتخابات میں پنجاب سے یونینسٹ نے 80امیدوار کھڑے کئے جن میں سے 74امیدوار کامیاب ہوئے جن کا تعلق جاگیردار طبقہ سے تھا۔''ان انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لاہور سے علامہ اقبال کے داماد میاں امیر الدین' پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما اعتزاز احسن کے نانا سردار حبیب اللہ موکل' حامد ناصر چٹھہ کے دادا چوہدری نصیر احمد چٹھہ' جھنگ سے عابدہ حسین کے تایا سید مبارک حسین سمیت ملتان کے تین معروف سیاسی خاندان کے چشم و چراغ خان بہادر مشتاق گورمانی' کپتان عاشق حسین قریشی اور مخدوم رضا شاہ گیلانی نے بھی حصہ لیا''جن کا تعلق جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ کرنے والے ٹولے سے تھا ان انتخابات میں خان بہادر احمد یار دولتانہ جیسی شخصیت نے بھی حصہ لیا۔

1937ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے کامیاب امیدوار

1937ء کے انتخابات میں پنجاب سے یونینسٹ کے ٹکٹ پر جو امیدوار کامیاب ہوئے ان میں محمد یوسف پلیڈر' راجہ فتح خان' خان بہادر نواب مظفر خان' صوبیدار میجر فرمان علی

خان، ملک محمد اکرم آف شمس آباد، سر محمد حیات خان نون، خان بہادر اللہ بخش ٹوانہ، سید نوازش علی شاہ، سر سکندر حیات، میجر خضر حیات ٹوانہ، حیات قریشی، راجہ غنضفر علی، خان صاحب غلام قادر، راجہ محمد سرفراز خان، شیخ محمد امین، سید مبارک حسین، میاں نور اللہ، راجہ محمد اکرم، نواب سعادت علی کھرل، پیر ناصر الدین، خان شہادت خان، خواجہ غلام حسین، چوہدری سرفراز، چوہدری عبدالرحیم، چوہدری نصیر اللہ چھٹہ، خان صاحب ریاست علی چھٹہ، شیخ کرامت علی، بیگم شاہنواز، سید افضال حسنی، مظفر قزلباش، میاں عبدالعزیز، فتح محمد آف کوہلیا، پیر محمد خان، سردار محمد حسین گنجیالوالہ، خان طالب حسین فتح شیر لنگڑیاں، سلطان محمود جہانگیر خان، خان ہیبت خان ڈاہا، سید مخدوم رضا شاہ گیلانی، احمد یار دولتانہ، عاشق حسین قریشی، مخدوم ولایت حسین شاہ، مشتاق گورمانی، خان صاحب مخدوم حسن، خواجہ غلام مرتضیٰ، ایس ولی محمد، چوہدری محمد حسین، خان بہادر نواب فضل علی، سر جمال خان لغاری، میر مقبول، چوہدری شہاب الدین، چوہدری فقیر حسین، سید امجد علی، چوہدری محمد یاسین، نواب زادہ محمد فیاض علی، میاں عبدالحیٔ، فیض خان، صوفی عبدالحمید، میاں بدرالدین، چوہدری علی اکبر، چوہدری عبدالرؤف، چوہدری عبدالرحمٰن، رانا نصر اللہ خان، مولوی محی الدین، شیخ فیض محمد، چوہدری جلال دین، خان صاحب محمد شیخ علی خان، چوہدری عبدالرب، صوبیدار میجر فرمان علی، خان صاحب غلام قادر اور سردار احمد بخش شامل تھے۔

جاگیرداروں کا یہ ٹولہ پنجاب کی سیاست کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس طبقہ نے اپنے سیاسی اور معاشی تحفظ کے لئے ہمیشہ یونینسٹ پارٹی کی حمایت کی جن کی سرپرستی تاج برطانیہ کرتی تھی۔ 1946ء کے انتخابات سے چند ماہ قبل جاگیرداروں کا یہی ٹولہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لئے بے تاب نظر آیا۔ یہ وہی مفاد پرست طبقہ تھا جس نے قائداعظم اور نظریہ پاکستان کی مخالفت کی اور یہ کہا تھا کہ ''قائداعظم پنجاب میں مداخلت نہ کریں'' اسی جاگیردار طبقہ نے دوقومی نظریہ کی مخالفت میں کہا تھا:

'' ہم ایسی آزادی نہیں مانگتے کہ یہاں مسلم راج ہو اور وہاں ہندو راج ہو''

یونینسٹ پارٹی کے جن ارکان نے خضر حیات سے بغاوت کر کے خود کو مسلم لیگ سے وابستہ کیا وہ سب کے سب دراصل سیاسی مرغان بادنما تھے برطانوی وزیراعظم کے اس اعلان کے بعد کہ برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کا آخری برطانوی وائسرائے ہوگا۔ قیام پاکستان کے روشن امکانات کے بعد جاگیردار نے مسلم لیگ سے ناطہ جوڑنا شروع کر دیا یہی طبقہ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع نظر آیا اور قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے کندھوں پر سوار ہو کر پاکستان کے ایوانوں تک پہنچ گیا جن کا تحریک پاکستان میں کوئی کردار نہیں تھا۔ احمد یار دولتانہ' راجہ غضنفر خان' نواب افتخار حسین ممدوٹ' میاں امیر الدین' چوہدری نذیر احمد خان اور متعدد دوسرے جو خود کو معمار پاکستان کہتے ہیں' درحقیقت وہ خیر خواہان برطانیہ تھے۔ پنجاب کے جاگیردار طبقہ کی اکثریت نے 1937ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کا بھرپور ساتھ دیا اور ہر مرحلہ پر قائداعظم کی مخالفت کی۔ اسی جاگیردار طبقہ کی باقیات نے قیام پاکستان کے بعد ہر اس جماعت میں پناہ لی جو اقتدار کے قریب تر نظر آئی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کے گرد یونینسٹ پارٹی کی باقیات نظر آتی ہیں جن کے آباؤ اجداد نے یونینسٹ پارٹی کا دامے' درمے' سخنے ساتھ دیا۔

سیاسی مرغان بادنما

1937ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کی نمائندگی کرنے والے سیاسی خاندان جو قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ سمیت حکمران جماعت میں شریک رہے۔

محی الدین لال بادشاہ نے 1937ء اور 1946ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی مگر قیام پاکستان کے بعد اپنی وفاداری مسلم لیگ کے ساتھ کر لیں 1951ء اور 1956ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی اسی خاندان کے

سید صفی الدین، پیر صفی الدین مکھڑ اور پیر سید عباس محی الدین قومی اسمبلی کے ممبر رہے۔

کیپٹن محمد اکرم 1946ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر مسلم لیگ کے مدمقابل تھے۔ 1951ء میں یہ مسلم لیگ میں تھے اور 1956ء میں مسلم چھوڑ کر ری پبلکن میں شامل ہو گئے اس خاندان کے ملک قاسم اور ملک اسلم قومی اسمبلی کے ممبر رہے۔

سردار سکندر حیات کا شمار یونینسٹ پارٹی کے اہم رہنماؤں میں ہوتا ہے مگر مسلم لیگ کو اقتدار میں آتا دیکھ کر انہوں نے سیاسی قلابازی کھائی سردار سکندر حیات کے انتقال کے بعد سردار شوکت حیات نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ یہ خاندان ری پبلکن پارٹی، مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں اقتدار کے مزے لوٹتا رہا اس خاندان کے سردار شوکت حیات اور سردار ممتاز خان بھی سیاسی مفادات حاصل کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔

راجہ فتح خان نے 1937ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔ اس خاندان کے راجہ سید اکبر خان، راجہ لال خان، راجہ شاہد ظفر اور راجہ آفتاب احمد بھی سیاست میں چھائے رہے۔

خان بہادر اللہ بخش ٹوانہ نے 1937ء اور 1946ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ بعد میں اس خاندان کے افراد مسلم لیگ سمیت دیگر جماعتوں میں بھی شامل رہے۔

عمر حیات ٹوانہ: سیاسی مفادات حاصل کرنے والا یہ خاندان بھی قلابازیاں کھاتا رہا یہ خاندان یونینسٹ پارٹی، کنونشن لیگ، جے یو پی، آئی جے آئی اور کبھی جونیجو لیگ میں شامل ہوا اس خاندان کے خضر حیات ٹوانہ، ملک فتح محمد ٹوانہ، محمد انور ٹوانہ، ملک خدا بخش ٹوانہ اور غلام محمد ٹوانہ قومی اور صوبائی اسمبلی میں جلوہ گر ہوتے رہے۔

سلطان احمد ننکیانہ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے مقابلے میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کے مقابلے میں یونینسٹ

پارٹی کا ساتھ دیا۔اس خاندان کے افراد بھی قیام پاکستان کے بعد سیاست میں شریک رہے خود سلطان احمد قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوکر ایک بار پھر وزارت اور ممبر اسمبلی کے مزے لوٹنے لگے۔

میاں سلطان رانجھا یونینسٹ پارٹی کے ممبر تھے' قیام پاکستان کے بعد اسی خاندان کے اکرم رانجھا' ڈاکٹر خالد رانجھا 'میاں سیف اللہ' محمد حسین رانجھا' اور شاہنواز رانجھا سیاسی سفر میں اقتدار کے مزے لوٹتے رہے۔

نواب محمد حیات قریشی 1946ء کے انتخابات میں بھی یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے مگر قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ میں پناہ لی۔اس خاندان کے نواب زادہ سعید قریشی' میاں خورشید قصوری' ذاکر قریشی' اسلم حیات قریشی' مظہر احمد قریشی' اور امید حیدر قریشی مختلف سیاسی جماعتوں میں شامل رہے۔

سردار حیات نون یونینسٹ پارٹی کے اہم صوبائی ممبر تھے۔یہ خاندان بھی سیاسی جماعتیں بدلنے میں ماہر تھا اس خاندان کے سر فیروز خان نون مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور پھر ری پبلکن پارٹی سے وابستہ ہوئے 1958ء میں پاکستان کے وزیراعظم بنے۔اس خاندان کے نور حیات نون' انور علی نون' امجد علی نون اور ملک احمد خان نون مختلف سیاسی جماعتوں میں قلابازی کھاتے رہے۔

قاسم میلہ کا بھی سیاسی کردار دیگر یونینسٹ سے کچھ مختلف نہ تھا وہ 1937ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے 1956ء میں ری پبلکن پارٹی میں شامل ہوئے۔بعد میں کنونشن لیگ اور 1970ء میں کونسل لیگ میں شریک رہے اس خاندان کے نصر اللہ میلہ نے پیپلز پارٹی اور قادر بخش میلہ نے 1990ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔

شیخ محمد امین نے 1937ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔اس خاندان کے شیخ محمد سعید نے 1946ء میں مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل کیا مگر یہ خاندان 1970ء

میں جے یو آئی کے پلیٹ فارم پر نظر آیا۔اس ہی خاندان کے شیخ نفیس الدین نے پیپلز پارٹی کی چھتری میں پناہ لی تو دوسری طرف شیخ محمد یوسف' شیخ محمد اقبال' اور قیصر احمد شیخ بھی مختلف سیاسی جماعتوں میں شامل رہے۔

سید مبارک حسین نے 1946ء میں مسلم لیگ میں جگہ بنائی اس سے قبل یونینسٹ پارٹی کے ممبر رہے۔اس کے خاندان کے افراد کرنل عابد حسین' ذوالفقار بخاری' سید عابد حسین' فیصل صالح حیات' سیدہ عابدہ حسین' سید افتخار بخاری' اسد صالح حیات' اور مخدوم اسد حیات پاکستان کی سیاست میں چھائے ہوئے ہیں اس خاندان کے افراد مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستہ رہے تاکہ کوئی نہ کوئی شخص اقتدار میں موجود رہے اس خاندان کے افراد' سینیٹر' وفاقی و صوبائی وزیر اور اسپیکر قومی اسمبلی بھی رہے ہیں۔

راجہ سرفراز خان نے یونینسٹ پارٹی سے ناطہ توڑ کر 1946ء اور 1951ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔اس خاندان کے سردار غلام عباس اور سردار محمد اشرف بھی سیاست میں موجود ہیں۔

نواب طالب مہدی: اس خاندان نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیکر عروج حاصل کیا۔نواب طالب یونینسٹ پارٹی میں شامل تھے قیام پاکستان کے بعد یہ خاندان مسلم لیگ میں شامل ہوا پھر کنونشن لیگ میں آ گیا۔وہاں سے اڑ کر پیپلز پارٹی کے منڈھیر پر بیٹھا اور وہاں سے اڑ کر آئی جے آئی اور پھر مسلم لیگ کے غول میں شامل ہوگیا اس خاندان کے سیاسی افراد میں راجہ خیر مہدی' ملک افضل مہدی' راجہ لہراسب خان' راجہ سکندر' راجہ ناصر علی' راجہ خالد اور راجہ اقبال مہدی شامل ہیں۔

نواب زادہ اصغر علی یونینسٹ پارٹی کے پرانے ممبر تھے۔1937ء کے انتخابات میں ممبر اسمبلی بنے۔اس خاندان کے چوہدری مہدی علی خان' نواب زادہ اصغر علی' نواب زادہ مظہر علی' نواب زادہ غضنفر علی گل' نواب زادہ ظفر قومی اور صوبائی سیاست میں شریک رہے۔

فتح محمد کو ہلیانے 1946ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر ناکامی کے بعد مسلم لیگ میں پناہ لی اور جب اقتدار مسلم لیگ کے ہاتھوں سے نکل کر کونسل لیگ اور پیپلز پارٹی کے ہاتھوں میں آیا تو اس خاندان کے افراد انہی پارٹیوں میں پائے گئے اس خاندان کے اسلم حیات اور افضل حیات پارٹیاں بدلنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔

چوہدری عبدالرحیم نے 1937ء میں یونینسٹ پارٹی کے سہارے کامیابی حاصل کی۔ 1946ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔ 1962ء تک مختلف جماعتوں کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیتے رہے ان کے بعد چوہدری عبدالرؤف' محمد افضل ادریس تاج اور اشفاق تاج سیاست کے وارث ٹھہرے۔

مخدوم ناصر الدین کو 1946ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر شکست ہوئی۔ ان کے خاندان کے ناصر الدین شاہ' مخدوم نذر حسین اور علی رضا قومی اور صوبائی سیاست میں سرگرم رہے۔

میاں نور اللہ نے یونیسٹ پارٹی چھوڑ کر 1946ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ ان کے بعد میاں نور اللہ' چوہدری محمد حسین' چوہدری سلطان علی' چوہدری عبدالستار' محمد اسلم' چوہدری بشیر احمد' اعجاز الحق اور چوہدری محمد اشفاق مختلف سیاسی جماعتوں میں شامل رہے۔

نواب سعادت علی خان کھرل کافی عرصہ یونینسٹ پارٹی سے وابستہ رہے۔ دو بار یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔ اس خاندان کے رائے انور کھرل' رائے نوشیر خان' رائے اسلم کھرل' رائے سلیم کھرل' رائے کرنل سلیم' رائے سخاوت' رائے صلاح الدین' رائے نواز کھرل' رائے رب نواز' رائے عارف حسین' جاوید کھرل' رائے شہادت کھرل اور غلام علی خان کھرل قومی وصوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیتے رہے۔ اب بھی اس خاندان کے افراد سیاست میں نظر آتے ہیں۔

چوہدری علی اکبر یونیسٹ پارٹی چھوڑ کر 1946ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے

اور 1965ء تک سیاست میں رہے اس کے بعد نثار اکبر' عمر دراز خان' قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب ہوتے رہے۔

چوہدری نصیر الدین چھٹہ: یہ خاندان بھی یونینسٹ پارٹی کا پرانا خیر خواہ رہا ہے۔ اس خاندان کے چوہدری صلاح الدین چھٹہ 1965ء تک' ان کے بعد حامد ناصر چھٹہ 1970ء سے سیاست میں شامل رہے' اسکے علاوہ چوہدری عارف چھٹہ' اور سیف چھٹہ بھی پنجاب کی سیاست میں چھائے رہے۔

محمد حسین بھنڈر نے 1937ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔ 1951ء تک سیاست میں رہے۔ان کے بعد شیخ محمد بھنڈاری نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔

خان بہادر چوہدری محمد حسین بھنڈر نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ 1951ء تک سیاست میں رہے ان کے بعد انور بھنڈر 1956ء سے 1970ء تک قومی سیاست کا حصہ رہے۔اس کے علاوہ چوہدری محمد انور اور شاہد اکرم بھنڈر بھی سیاست میں شامل رہے۔

خان بہادر میاں امیر الدین نے 1946ء میں یونینسٹ پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ 1937ء سے 1956ء تک سیاست میں رہے ان کے بعد میاں صلاح الدین 1977ء تک قومی سیاست پر نظر آئے۔ 90ء کی دہائی سے خواجہ احمد طارق' قاسم ضیاء' سلطان تاثیر اور میاں یوسف صلاح الدین سیاست میں نظر آئے۔

شاہنواز ممووٹ یونینسٹ پارٹی کے پرانے ممبر تھے اس خاندان کے افتخار ممووٹ 1946ء سے 1965ء تک پنجاب کی سیاست میں کافی سرگرم رہے۔ان کے بعد ذوالفقار ممووٹ' عفیفہ ممووٹ اپنے خاندان کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

سردار محمد حسین گنجیانوالہ 1946ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی سے

قلابازی کھا کرمسلم لیگ میں آئے۔ 1956ء میں ری پبلکن پارٹی سے وابستہ ہوگئے۔اس ہی خاندان کے سردار احمد علی اور سردار آصف احمد علی قلابازی کھا کر پی پی میں چلے گئے۔یہ کبھی آئی جے آئی اور کبھی جونیجو لیگ میں نظر آئے۔

نواب مظفر علی قزلباش یونینسٹ پارٹی کے اہم رکن رہے مگر 1946ء میں قلا بازی کھا کرمسلم لیگ میں آئے۔1962ء تک صوبائی وقومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے ان کے بعد میجر ذوالفقار قزلباش، مظفر قزلباش، بیگم افسر رضا قزلباش اور رضا عباس قزلباش پنجاب اسمبلی میں نظر آئے۔

رانا نصیر اللہ 1946ء میں وفاداری بدل کر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے ان کے بعد رانا عبدالحمید، رانا خداداد، راجہ احمد سعید، رانا نعیم محمود، رانا لقمان، رانا غلام قادر، نکا محمد اقبال راجہ شاہد سعید اس خاندان کی نمائندگی کرتے نظر آئے۔

مسعود چشتی نے 1946ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا اس خاندان کے دیوان قطب الدین غلام قدیر چشتی قومی اور صوبائی اسمبلی کی نشستوں پر کامیاب ہوتے رہے۔

فتح شیر لنگڑیال نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔اس خاندان کے فتح جہانگیر لنگڑیال، ملک فتح شیر، اقبال لنگڑیال اور اقبال احمد لنگڑیال اپنے علاقے میں قومی اور صوبائی اسمبلی کی نشستوں پر کامیاب ہوتے رہے۔

الیس ولی محمد خان نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ اس خاندان کے اقبال ہراج اور سردار اللہ یار ہراج قومی اور صوبائی سیاست میں شامل رہے۔

خان بہادر ہیبت خان ڈاہا نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی اس خاندان کے غلام قادر ڈاہا، میجر افضل ڈاہا، آفتاب ڈاہا، عرفان احمد خان اور رفعت حیات ڈاہا سیاست میں رہے بلکہ صوبائی وقومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

مخدوم رضا گیلانی اور سید ولایت حسین گیلانی نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر

انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔اس خاندان کے محمد رضا شاہ گیلانی' احمد حسین گیلانی' تنویر الحسن گیلانی' علمدار حسین گیلانی' سید فیض مصطفیٰ گیلانی' حامد رضا گیلانی' میر یوسف رضا گیلانی نے سیاست میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

عاشق قریشی' میجر عاشق حسین قریشی نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔اس خاندان کے مرید حسین قریشی' مخدوم سجاد حسین' سید محمد احسن شاہ' صادق حسین قریشی' ریاض حسین قریشی' شاہ محمود قریشی جبکہ مخدوم سجاد قریشی' سینیٹر اور بعد ازاں گورنر پنجاب بنے۔مرید حسین قریشی اور مخدوم زادہ احسن بھی سیاست میں شریک رہے۔

مشتاق گورمانی انگریزوں کی وفادار جماعت یونینسٹ پارٹی کے پرانے اور خیر خواہ ممبر تھے۔ مغربی پاکستان کے گورنر نامزد ہو کر ری پبلکن پارٹی کے تخلیق کار ٹھہرے۔اس خاندان کے محمد غلام جیلانی ون یونٹ کے رکن بنے۔سید احمد گورمانی اور طارق گورمانی بھی پنجاب کی سیاست میں رہے۔

ابراہیم برق 1946ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔1962ء سے 1977ء تک ممبر قومی منتخب ہوئے۔ابراہیم برق کے بعد ذوالفقار برق نے ان کی جگہ لی۔

احمد یار دولتانہ نے دو بار یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا۔یہ خاندان طویل عرصہ تک پنجاب کی سیاست پر چھایا رہا۔اس خاندان میں میاں اللہ یار دولتانہ' ممتاز دولتانہ' ریاض دولتانہ' جاوید ممتاز دولتانہ' زاہد دولتانہ' تہمینہ دولتانہ شامل ہیں۔

خان بہادر قادر بخش جھکڑ نے 1937ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی مگر 1946ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر شکست کھانے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔1951ء سے 1971ء تک ممبر اسمبلی رہے۔ان کے بعد نیاز احمد جھکڑ 1985ء سے سیاست میں ہیں۔

میاں فضل کریم 1946ء میں یونینسٹ پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل

ہوئے۔اس خاندان کے مظفر مہدی عاشق' میاں مصطفیٰ ظفر' میاں غلام عباس' احسن کریم قریشی اور عطا قریشی سیاست میں سرگرم رہے۔

خواجہ غلام مرتضیٰ نے 1946ء میں یونینسٹ پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں پناہ لی۔ 1951ء اور 1956ء میں رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔خواجہ سلمان تونسوی' خواجہ کمال الدین انور سینیٹر بنے۔اس ہی خاندان کے خواجہ محمد داؤد' خواجہ کمال الدین اور خواجہ غلام معین صوبائی و قومی اسمبلی کے ممبر بنے۔

سردار بہادر دریشک نے 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔اس سے قبل 1937ء میں یونینسٹ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔1956ء تک مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے۔ان کے بعد رمضان دریشک' سردار کرم الٰہی دریشک' نصر اللہ دریشک قومی و صوبائی سطح پر اسمبلی کے ممبر رہے۔

جمال خان لغاری نے 1946ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔قیام پاکستان کے بعد یہ خاندان مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی سمیت دیگر حکومتوں میں شامل رہا۔اس خاندان کے محمد خان لغاری' سردار محمد لغاری' سردار فاروق لغاری' مقصود لغاری اپنے آبائی علاقوں میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔اس خاندان کے سردار فاروق خان لغاری پاکستان کے صدر منتخب ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد یونینسٹ پارٹی بظاہر ختم ہوگئی تھی مگر اس کی روح آج بھی قبائلی و علاقائی عصبیت اور جاگیرداری کی صورت میں زندہ ہے۔ یہ وہی جاگیردار خاندان ہیں جو انگریزوں کے مرہون منت اور یونینسٹ پارٹی کے سائے میں سیاسی قدآور خاندان بنے۔یہی دو فیصد مراعات یافتہ اور مفاد پرست طبقہ ہر بار اپنی پیشانی پر کسی نئی جماعت کا لیبل لگا کر اقتدار کی کرسی سے چمٹا نظر آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

جاگیرداروں کا سورج کبھی غروب نہیں ہوا

جمہوریت ہو یا فوجی حکومت، ایوان ہو یا دربار سیاست کا کوئی بھی رنگ وروپ ہو۔ جاگیردار روشن ستاروں کی طرح جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ اقتدار کے ایوانوں میں، انگریزوں کے درباروں میں، مجلس شوریٰ میں، پشت بہ پشت، نسل در نسل جاگیردار ہی براجمان رہے ہیں۔ خواہ کتنے ہی سیاسی سسٹم تبدیل ہو جائیں، خواہ کتنی ہی زرعی اصلاحات ہو جائیں، فیوڈل سسٹم تبدیل نہیں ہوتا۔ حکومتیں ٹوٹ جاتی ہیں، آئین بدل جاتے ہیں، ملک تقسیم ہو جاتے ہیں، مگر جاگیرداروں کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ جاگیرداروں کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ ممبر پارلیمنٹ اور وزیر بننے کیلئے سیاسی وفاداریاں بدلتے رہے ہیں۔ انہیں کسی نظریہ، کسی اصول، اور کسی جماعت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں جس جماعت کے برسراقتدار آنے کا گمان گزرے یہ فوراً اس جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ انہیں سیاسی وفاداری بدلنے اور برسراقتدار جماعت میں پناہ لینے کا ہنر خوب آتا ہے۔ پنجاب کی سیاست پر جاگیردارانہ چھاپ سب سے زیادہ رہی۔ انگریزوں کے دور حکومت میں سر عمر حیات ٹوانہ کو ''رائل ہیرلڈ آف دی کنگ'' کا خطاب ملا۔ وہ یہ خطاب حاصل کرنے والا پہلا ہندوستانی جاگیردار تھا۔ جاگیرداروں کا یہی ٹولہ پاکستان اور قائداعظم کا شدید مخالف تھا مگر جب پاکستان کی منزل قریب آئی تو مفاد پرست جاگیرداراوں نے سیاسی وفاداری بدلتے ہوئے مسلم لیگ میں پناہ حاصل کرلی۔ قیام پاکستان کے بعد ان جاگیرداروں نے اقتدار اعلیٰ کو اپنے تابع اور سیاسی جماعتوں کو اپنا فرماں بردار بنانے کا عمل شروع کیا۔ ان

جاگیرداروں کا ایک مقصد، ایک ہی اصول اور ایک ہی نظریہ تھا کہ فیوڈل سسٹم کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ چاہے اس کے لئے ملک کو دولخت ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ جاگیرداروں اور بیوروکریسی نے مسلم لیگ کی جگہ ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی تو جاگیرداروں کا غول مسلم لیگ سے اپنی وابستگی کو نادانی اور غلطی قرار دیتے ہوئے ری پبلکن پارٹی میں شامل ہوگیا۔ جب فوجی جنرل ایوب خان نے جاگیرداروں کے ساتھ مل کر کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو تمام بڑے جاگیردار گھرانے ایوب خان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ ایوب خان نے مارشل لاء کے سائے تلے انتخابات کرنے کا اعلان کیا تو جاگیردار کنونشن مسلم لیگ کی صفوں میں شامل ہوگئے۔ ایوب خان کے اقتدار میں جاگیرداروں نے نہ صرف خود کو مضبوط کیا بلکہ زرعی اصلاحات کے نام پر جو زمینیں لی گئی تھیں وہ بھی واپس حاصل کرلیں۔ 1962ء میں بنیادی جمہوریت کے نام پر جو انتخابات ہوئے اس میں مغربی پاکستان کی 75 فیصد نشستوں پر 37 بڑے جاگیردار منتخب ہوئے۔ جن جاگیرداروں نے جنرل ایوب خان کے سر پر ''صدر پاکستان'' کا تاج رکھا تھا ان میں 5.7 فیصد ایسے جاگیردار تھے جو صرف انگوٹھا لگا سکتے تھے۔ 36.7 فیصد پرائمری پاس تھے۔ 44.6 فیصد سیکنڈری پاس تھے، کالج تک تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد 12.8 فیصد تھی۔ 11 سال تک یہ جاگیردار ایوب خان کے مارشل لاء کے سائے تلے پروان چڑھتے رہے۔ جب ایوب خان کا اقتدار ڈگمگانے لگا تو جاگیرداروں نے نئی پناہ گاہ کی تلاش شروع کردی۔ ایوب خان کے اقتدار سے نکل کر جاگیرداروں کا ٹولہ مسلم لیگ قیوم اور پیپلز پارٹی میں شامل ہوگیا۔ 1970ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کے منتخب ہونے والے 50 سے زیادہ ارکان قومی اسمبلی کا تعلق اس جاگیردار گھرانے سے تھا جو مسلسل قومی اسمبلی کے رکن بنتے آرہے تھے۔ پیپلز پارٹی میں شامل جاگیرداروں نے اپنے جاگیردارانہ پس منظر اور رشتہ داریوں کے باعث جاگیردار گھرانوں کو اقتدار میں شریک رکھا۔ پیپلز پارٹی کو اقتدار سے محروم کرکے جب ایک بار پھر فوجی جنرل ضیاء الحق اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوا تو جمہوریت کا گیت گانے والے اور پارلیمنٹ کے تقدس کی قسم

کھانے والے، مارشل لاء کے گن گا رہے تھے اور یہی جاگیردار آمریت کو جمہوریت سے بہتر قرار دے رہے تھے۔ جنرل ضیاء نے مجلس شوریٰ بنانے کا اعلان کیا تو جاگیرداروں کا ٹولہ مجلس شوریٰ کا رکن بننے کے لئے بیتاب نظر آیا۔ **1985**ء میں غیر جماعتی انتخابات میں یہی جاگیردار اور وڈیرے اپنی دولت اور موروثی گدانشینی کے باعث ایک بار پھر پارلیمنٹ کے رکن بن گئے۔ **1988**ء میں انتخابات کا اعلان ہوا تو وہ تمام جاگیردار جنہوں نے پیپلز پارٹی سے بے وفائی کی تھی اور جنرل ضیاء الحق کو امیرالمومنین کہتے تھے پیپلز پارٹی کی پناہ میں چلے گئے اور یہ کہا کہ اگر صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ یہ جاگیردار ایک وقت میں ایک ساتھ وفا کرتے ہیں تو دوسری طرف کسی دوسری جماعت کے ساتھ پینگے بڑھا رہے ہوتے ہیں۔

جمہوری اداروں کو کمزور کرنے والے یہی جاگیردار پیپلز پارٹی سے دغا کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ سیاسی وفاداری بدلنے کا یہ کھیل یونینسٹ پارٹی سے لے کر مسلم لیگ تک اور پھر کنونشن لیگ، ری پبلکن پارٹی، پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن) اور مسلم لیگ (ق) تک جاری رہا اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ پاکستان کی نصف صدی کی پارلیمانی سیاست کا سرسری جائزہ لیں تو جاگیرداروں کا تسلط اور حکمرانی نظر آئے گی جو صرف چڑھتے سورج کے پجاری ہیں۔ ان جاگیرداروں نے فیوڈل سسٹم کی بقاء کے لئے عوامی جمہوری سسٹم کو پروان چڑھنے دیا اور نہ ہی سیاسی اداروں کی نشو ونما ہونے دی۔ جاگیرداروں نے جمہوریت کے نام پر پارلیمنٹری نظام میں جو فسطائیت قائم کی اس نے غریب اور متوسط طبقہ کو مرکزی حکومت کا حصہ بننے ہی نہیں دیا۔



جماعت اسلامی کا
استخلاص وطن کی جدوجہد میں حصہ

جماعت اسلامی کی بنیاد 1941ء میں رکھی گئی اس وقت قرارداد پاکستان کو پاس ہوئے ایک برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن جماعت اسلامی نے اپنے پہلے اجلاس میں قرارداد پاکستان کے بارے میں کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ زاہد چوہدری لکھتے ہیں کہ" پنجاب میں مجلس احرار، خاکسار جماعت، جمعیت العلمائے ہند اور جماعت احمدیہ کے علاوہ جس تنظیم نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اس کا نام جماعت اسلامی تھا جو قرارداد پاکستان کی منظوری کے 17 ماہ بعد وجود میں آئی تھی اس جماعت کا سربراہ ایک شخص ابوالاعلیٰ مودودی تھا۔" تاریخ گواہ ہے کہ جماعت اسلامی کا استخلاص وطن کی جدوجہد میں کوئی حصہ نہیں ہے آزادی وطن کی خون سے رنگین داستان میں ان کے لہو کا ایک قطرہ بھی شامل نہیں اس حقیقت سے جماعت اسلامی کے بزرگ اکابرین بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس حقیقت سے ہر کوئی آگاہ ہے تقسیم سے قبل جماعت کا رجحان اور میلان زیادہ تر کانگریس کی جانب تھا اسی لئے جماعت اسلامی نے اپنے اجلاس پٹنہ میں گاندھی جی کو شرکت کی دعوت دی تھی اور گاندھی جی اجلاس میں شریک ہوئے تھے لیکن اس کے مقابلہ میں جماعت نے کسی مسلم لیگی کو اپنے اجلاس میں مدعو نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ" وہ تقسیم ہند پر نہ مریں اور ایک ایسے دستور پر راضی ہو جائیں جس میں

صوبوں اور ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ خود اختیاری دی جائے۔"

جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی کی تحریروں سے مسلم لیگ اور اس کی قیادت نیز مطالبہ پاکستان سے بیزاری کا اظہار ملتا ہے۔ان کی متعدد کتابوں میں مسلم لیگ اور اس کی قیادت اور تحریک پاکستان پر کڑی نکتہ چینی موجود ہے۔قارئین کی دلچسپی اور آگہی کیلئے مولانا مودودی کی تحریروں سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔جس میں انہوں نے مسلمانوں کو نادان اور بے وقوف لکھا اور ان کی قیادت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلمان ان لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کر رہے ہیں جن کے سامنے اپنی فراست اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اپنی قوم کے لئے اپنا بال بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اس لئے بلند آہنگوں کے ساتھ لیتے ہیں کہ ایوان و وزارت میں ان کا قبضہ رہے جن کی بزدلی پر دشمنوں کو پورا پورا اعتماد ہے جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے اگر تم ہمارے ساتھ جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہیں اور وہ چیلنج قبول کرنے کی بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکار برطانیہ کو جنگ کا خطرہ درپیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کی کشتی کو بھنور سے نکالیں گے تو میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ان کی کشتی ڈوب کر رہے گی۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا نے مسلم لیگ کی قیادت کو بزدل ڈرپوک اور جیل خانے سے گریزاں قرار دیا ہے اقتدار اور وزارتوں کا طلب گار اور انگریزوں کا وفادار لکھا ہے اور پیش گوئی کی ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی کشتی کو ساحل مراد پر نہیں پہنچا سکتے بلکہ ان کے ہاتھوں یہ کشتی مجدھار میں ڈوب جائے گی۔

(حوالہ: ولی خان اور قرارداد پاکستان)

شاہد حسین خان لکھتے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب نے مسلم لیگ' اس کے قائد اور تحریک کے بارے میں صرف بدگمانیوں سے کام نہیں لیا بلکہ الزام تراشی کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مولانا مودودی کی تحریروں سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں جس میں مولانا نے فرمایا تھا۔

جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع بنا بھی تو) لازماً لادینی جمہوری اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہوں گے جس طرح مسلمان ۔اور پاکستان میں ان کی تعداد کم اور نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور ہوگی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے۔

(ترجمان القرآن فروری 1946ء)

17' 18 اپریل 1947ء کو ٹونک میں جماعت اسلامی کا ایک اہم جلسہ ہوا اس میں مولانا مودودی سے مسلم لیگ کے بارے میں سوالات ہوئے جن کے جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کیلئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے اور اس میں ایک لادینی جمہوریت (Secular Democrac) یا عوامی پارلیمنٹری حکومت Popular Parliamentary Govt نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت کتاب و سنت کے اصول پر قائم ہو سکتی ہے اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریقہ کار کو اپنی خواہشات نفس کے خلاف پا کر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کے بجائے صاف کیوں نہیں

کہتے اللہ اور رسول کے کام کو چھوڑ یے اور ہمارے نفس کے کام میں حصہ لیجئے

(ترجمان القرآن جون 1947ء)

اور خونریز کشمکش کے بعد اب یہ "مرکب حماقت" کامیابی کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے اور جس چیز کے لئے اقلیت کے مسلمان خود لڑ رہے تھے وہ حاصل ہوا چاہتی ہے یعنی اکثریت کی آزاد وخود مختار حکومت جس میں وہ بحیثیت ایک قوم کے محکوم ہوں گے اور محکوم بھی اس اکثریت کے جس سے وہ قومی جنگ لڑ رہے ہیں۔

(روئداد" جماعت اسلامی" حصہ پنجم اجتماع مدراس ص ۱۱۵)

"قومیت اور جمہوریت ۔۔۔ افکار سے اقرار تک" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں محمد سرور جامعی لکھتے ہیں کہ پاکستان کا مطالبہ جمہور کے حق خودادیت کے اصول پر کیا گیا تھا اور مودودی صاحب سرے سے اس کے خلاف تھے چنانچہ اس زمانے میں انہوں نے لکھا تھا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری لئے اس مسئلے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیری التعداد ہیں، وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس پاکستان میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا۔ ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا، جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔

(حوالہ: مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی آپ بیتی)

پنجاب میں جماعت اسلامی کی تاسیس کے پس منظر اور مولانا مودودی کے بارے میں زاہد چوھدری لکھتے ہیں کہ" اس نے چوہدری نیاز علی خان کی وقف کردہ جاگیر کے سہارے درمیانہ طبقہ کے نیم تعلیم یافتہ وقدامت پسند عقیدتمندوں یا صالحین کا چھوٹا سا حلقہ بھی بنالیا تھا اس

کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پنجابی جاگیرداروں کو زمین کی ملکیت کے بارے میں اس کا اسلامی نظریہ بہت پسند تھا وہ چاہتے تھے کہ پنجاب میں اس نظریے کی تبلیغ جاری رہے اور وہ غریب کسانوں کی خون پسینے کی کمائی سے رنڈیوں کے مجرے کراتے رہیں۔مودودی کا زمین کی ملکیت کے بارے میں یہ نظریہ تھا کہ اسلام تمام دوسری مملکتوں کی طرح زمین پر انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم وثابت ہونے کے لئے مقرر ہیں ان ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اسی طرح ایک آدمی کی ملکیت ہوسکتی ہے جس طرح کوئی دوسری چیز۔اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے ایک گز مربع سے لیکر ہزار ایکڑ تک خواہ کتنی ہی زمین ہو اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملکیت میں آئی ہے تو بہر حال وہ اس کا جائز مالک ہے اس کے لئے خود کاشت کرنے کی قید بھی نہیں ہے جس طرح مکان اور فرنیچر کرائے پر دیا جاسکتا ہے اور تجارت میں شرکت کی جاسکتی ہے اسی طرح زمین بھی کرائے پر دی جاسکتی ہے اور اس میں بھی شرکت کے اصول پر زراعت ہوسکتی ہے۔ بلا کرایہ کوئی شخص کسی کو دے یا بٹائی لئے بغیر کسی کو اپنی زمین کاشت کر لینے دے تو یہ صدقہ ہے مگر کرایہ ولگان یا بٹائی پر معاملہ طے کرنا ایسا ہی ایک جائز فعل ہے جیسے تجارت میں حصہ داری یا کسی دوسری چیز کو کرایہ پر دینا''

(اسلام اور جدید معاشی نظریات۔

ابوالاعلیٰ مودودی طبع نہم 1976ء ص128 تا 13)

''خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطہ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جدو جہد کے مواقع میں مساوات ہے۔فطرت سے قریب تر نظام وہی ہوسکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔نیز یہ کہ جو

موٹر لے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے۔ جو صرف دو پاؤں لایا ہے وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کر دے۔

(اسلام کا نظام حیات۔ابوالاعلیٰ مودودی'

مکتبہ جماعت اسلامی لاہور طبع 1948)

پنجاب کے جاگیرداروں کے لئے ''اسلامی مساوات'' کا اس قسم کا نظریہ بہت پسندیدہ تھا۔ جو ''عالم دین'' غریب مسلم عوام میں اس نظریئے کی تبلیغ کرے۔ جاگیرداریت کی نظریاتی خدمات گزاری اس ''مفکر اسلام'' کا خاندانی پیشہ ہے۔ حیدر آباد دکن مسلمان تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کا گڑھ تھا اور اس کے خاندان نے انہی کے زیر سایہ پرورش پائی تھی۔''

(حوالہ:مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء)

''ابوالاعلیٰ مودودی نے 1941ء کے اوائل میں یعنی فروری اور مارچ 1941ء میں اپنے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں ایک اور سلسلہ مضامین شروع کیا جن میں مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا ان کا کہنا یہ تھا کہ...... ''افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز تک رکھتا ہو...... ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استاد فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں' سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے...... ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات' نظریات' طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خورد بین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اسے ہزاروں حصوں

میں تقسیم کرر کھا ہے...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کردیا جائے ...... یہ آزادی وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کی سروں میں امپریلزم کی مخالفت یہ سب ہمارے لئے بکری کی بولیاں ہیں ...... جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل لعنت......

زاہد چوھدری لکھتے ہیں کہ" 1941ء میں پنجاب کے جاگیرداروں کا مفاد اس میں تھا کہ دوقومی نظریئے کی بنیاد پر پیش کردہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی جائے' اس لئے وہ اسلام کی رو سے یہ ثابت کرتا تھا کہ تحریک پاکستان کے قائدین مسلمان نہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ پنجاب کے جاگیرداروں کا سرغنہ سرسکندر حیات خان تو یہ کہتا تھا کہ غیر پنجابی جناح کو پنجاب کے معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور مطالعہ پاکستان پنجاب کے مفاد کے منافی ہے۔ اور مذہبی پیشوا یہ کہتے تھے کہ جناح نے ہندو اکثریت والے صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنادیا ہے۔ 1941ء میں مودودی کے نزدیک یہ امر بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ وہ آزادی وطن کے نعروں کو بکری کی بولیاں تصور کرتا تھا۔ سرسکندر حیات کا بھی یہی موقف تھا وہ کہتا تھا کہ برطانوی امپیرلزم کی بیساکھی کے بغیر ہندوستان اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ مودودی کی آئینی تجویز یہ ہی کہ "مسلمانوں کی قومی ریاستوں کا علیحدہ وفاق ہو اور ہندو ریاستوں کا جداگانہ وفاق ہو اور پھر ان میں کنفیڈریشن پیدا کرلی جائے جس کی رو سے دفاع' مواصلات' تجارتی تعلقات کے لئے باہمی تعاون کرلیا جائے۔ بالفاظ دیگر یہ شعبے مشترک ہوں" بالکل یہی اسکیم سرسکندر حیات خان نے

جولائی 1939ء میں ایک پمفلٹ کی صورت میں پیش کی تھی اور پھر اس نے اسی اسکیم کا اعادہ 11 مارچ 1941ء کو پنجاب اسمبلی میں پیش کیا تھا۔ سر سکندر اور مودودی کی ہم خیالی اور ہمنوائی محض اتفاق نہیں تھی۔ یہ دراصل جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان غریب عوام کے خلاف ناپاک گٹھ جوڑ کی علامت تھی اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں نے محمد علی جناح کی وسیع المشرب بورژوا قیادت کے خلاف دقیانوسی جاگیرداروں کے ساتھ اتحاد کرلیا تھا۔"

(حوالہ: مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء)

جماعت اسلامی کے بانی امیر مولانا مودودی کا ایک مضمون ''ہندوستان کی موجودہ گتھی کا ایک حل'' کے عنوان سے یکم مئی 1946ء کو روزنامہ نوائے وقت لاہور میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں مولانا مودودی نے متحدہ ہندوستان میں آباد قوموں کا ایک متحدہ وفاق تشکیل دینے کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس مضمون کے اواخر میں قیام پاکستان کی صریح الفاظ میں مخالفت کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے مل جل کر رہنے پر زور دیا گیا ہے اور ''صلح حدیبیہ'' کی مثال پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہاں مضمون کا آخری پیراگراف نقل کیا جا رہا ہے۔

''میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ تقسیم ہند پر نہ مریں اور ایک ایسے دستور پر راضی ہو جائیں جس میں صوبوں اور ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ خود اختیاری دی جائے اور باقی اختیارات Residuary Powers بھی انہیں کو تفویض کئے جائیں اور صرف چند اختیارات ہندوستان کے وفاقی مرکز کیلئے مخصوص رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت مسلمانوں نے اپنی تمام توجہ پاکستان پر مرکوز کردی ہے اور ان کو اس کے سوا اپنے قومی حوصلوں کے پورے ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے اس تجویز کردہ نقشہ کو قبول کرلیا جائے اور تلخی اور کشمکش کے بجائے صلح و مصالحت سے دوستانہ اسپرٹ میں اس پر تصفیہ ہو جائے تو ہندوستان کی

تقسیم کے بجائے ہندوستان کی وحدت مسلمانوں کے لئے بھی زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ اور ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے لئے بھی بظاہر اپنے آزاد قومی اسٹیٹ کے قیام کا موقع کھودینا مسلمانوں کو ایک نقصان نظر آئے گا۔ مگر میرا خیال ہے کہ اور آئندہ پچیس سال اسے ثابت کردیں گے کہ اس طرح کی مصالحت مسلمانوں کے لئے اور ہندوستان کے لئے ویسی ہی رحمت ہوگی جیسی صلح حدیبیہ اسلام اور عرب کے لئے ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆

قائداعظم کے مدمقابل
شفیع لیگ کی تشکیل

لاہور کے جاگیردار میاں شاہ دین نے اپنی زیر صدارت مسلم لیگ پنجاب کی صوبائی شاخ قائم کی۔تو ان کے رشتہ کے بھائی میاں محمد شفیع مسلم لیگ پنجاب شاخ کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔جب شاہ دین کو پنجاب چیف کورٹ کا جج مقرر کیا گیا تو شاہ دین کی جگہ مسلم لیگ پنجاب شاخ کے سربراہ میاں محمد شفیع مقرر ہوئے مگر پنجاب کی قیادت کیلئے محمد شفیع اور میاں فضل حسین میں رسہ کشی شروع ہوگئی۔مگر دونوں میں وقتی طور پر مصالحت ہوگئی میاں محمد شفیع مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری اور میاں فضل حسین جوائنٹ سیکریٹری بن گئے۔ 1916ء میں ایک بار پھر میاں محمد شفیع اور میاں فضل حسین کے درمیان علیحدگی ہوگئی۔ان ہی اختلافات کی بنیاد پر سر محمد شفیع نے صوبائی مسلم لیگ پنجاب کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے ختم کردیا۔فروری 1918ء میں سر محمد شفیع نے پنجاب صوبائی مسلم ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔مسلم لیگ اور مسلم ایسوسی ایشن کا فرق بیان کرتے ہوئے ''پیسہ'' اخبار نے لکھا تھا۔

> ''مسلم ایسوسی ایشن مسلمانوں کی من حیث القوم تمام حقوق کی حفاظت کرتی ہے وہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو بطور سرکاری حقوق اور عہدے ملیں لیکن مسلم لیگ کی مجال نہیں کہ اس کی زبان پر مسلمانوں کے سرکاری عہدوں سے متعلق ایک لفظ بھی آ جائے۔

اس اندیشہ سے کہ اس سے کانگریس آقا ناخوش اور برہم ہو جائیں گے''

سر محمد شفیع بنیادی طور پر ایک جاگیردار تھے اس لئے وہ دیگر جاگیرداروں کی طرح سیاست میں سرگرم رہنا چاہتے تھے۔ان کی سوچ بھی دوسرے جاگیرداروں سے قطعی مختلف نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 20 مارچ 1927ء کو قائداعظم کی سربراہی میں متفقہ طور پر منظور ہونے والی قرارداد کی نا صرف مخالفت کی بلکہ اس قرارداد کو لیکر پنجاب میں قائداعظم کے خلاف محاذ کھول لیا۔ پنجاب سے جن شخصیات نے اس موقع پر سر میاں محمد شفیع کا ساتھ دیا اس میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔میاں محمد شفیع نے دہلی اجلاس سے واپس آ کر 'تجاویز دہلی'' کو موضوع بنا کر قائداعظم کی سخت مخالفت کی۔انہوں نے اس موقع پر اخبارات میں قائداعظم کے خلاف انتہائی سخت بیانات دیئے۔میاں محمد شفیع نے پنجاب میں قائداعظم کے مخالف مسلم لیگ کا ایک مضبوط گروپ بنالیا تھا۔ 1926ء کے اجلاس دہلی کے موقع پر آئندہ سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کی منظوری ہو چکی تھی مگر لاہور میں جس طرح ''تجاویز دہلی'' کو بنیاد بنا کر قائداعظم کی شدید مخالفت کی جارہی تھی۔ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجلس عامہ نے لیگ کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد کرانے کی تجویز پیش کی جسے بھاری اکثریت سے منظور کرلیا گیا۔مسلم لیگ پنجاب میں سالانہ اجلاس منعقد کر کے صورت حال کو مزید خراب کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے متفقہ پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ کا سالانہ اجلاس لاہور کی جگہ کلکتہ میں منعقد کیا جائے۔

سر میاں محمد شفیع جو کہ اس سے قبل بھی قائداعظم کی مخالفت کر رہے تھے انھوں نے پنجاب کے جاگیرداروں کے ساتھ ملکر مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ میں منعقد کرنے کی شدید مخالفت کی۔ بلکہ سر میاں محمد شفیع نے لاہور میں قائداعظم کے مدمقابل مسلم لیگ (شفیع لیگ) کے قیام کا اعلان کیا۔اس موقع پر سر میاں محمد شفیع کو مسلم لیگ کا صدر اور علامہ اقبال کو سیکریٹری بنانے کا اعلان کیا گیا۔مسلم لیگ (شفیع لیگ) کا پہلا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہندوستان میں دو مختلف مقامات پر مسلم لیگ کے اجلاس منعقد ہوئے۔ایک اجلاس کی صدارت محمد

علی جناح نے کی تو مسلم لیگ کے دوسرے دھڑے (شفیع لیگ) کی صدارت سر میاں محمد شفیع نے کی۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تقسیم کے بارے میں سید نور احمد لکھتے ہیں۔

''سر فضل حسین گروپ نے آل انڈیا مسلم لیگ پر قبضہ کرنے کی اسکیم مارچ 1927ء میں جناح کی ''تجاویز دہلی'' کے بعد تیار کر لی تھی لیکن جناح نے یہ اسکیم کامیاب نہ ہونے دی تو پنجابی لیڈروں نے متوازی لیگ قائم کر لی۔''

زاہد چوہدری، شفیع لیگ کے قیام کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''مارچ 1927ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے چند ماہ بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے جو دو دھڑے ہوئے۔ شفیع لیگ کے یونینسٹ نواز دھڑے کا صدر سر محمد میاں شفیع کو بنایا گیا تھا اس کے جنرل سیکریٹری کے طور پر ڈاکٹر اقبال کا انتخاب ہوا تھا اس زمانے میں یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار ''انقلاب'' کو علامہ اقبال کی اعانت و سرپرستی حاصل تھی۔''

(حوالہ: مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء)

قائداعظم مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد اور منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس کے برعکس پنجاب کے جاگیردار طبقہ نے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں سوچنے کے بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دی۔ مسلم لیگ جو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی اسے دو دھڑوں میں تقسیم کرنے کا کام پنجاب کے جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ سر میاں محمد شفیع کے ہاتھوں انجام پایا۔



خطبہ الہ آباد اور تصور پاکستان

سرعلامہ محمد اقبال پاک و ہند کے عظیم شاعر، اعلیٰ پایہ کے مفکر اور فلسفی، اسلامی نشاۃ ثانیہ کی آواز، ممتاز قانون دان، اور کئی تاریخی کتابوں کے مصنف تھے۔ علامہ اقبال کو جہاں اپنی تصانیف علم الاقتصاد، افکار اسلامی کی تعمیر نو، ضرب کلیم، اسرار خودی، مسافر، بال جبریل وغیرہ کی وجہ سے عالمگیر شہرت ملی وہیں اقبال کو بحیثیت شاعر، مفکر اور فلسفی کے جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا اس حوالے سے اقبال کے بارے میں یہاں تک لکھا جانے لگا کہ ''اقبال سرسید احمد خان سے ہر لحاظ سے زیادہ فلسفی، متکلم اور وسیع المطالعہ تھے۔''

علامہ اقبال کی شخصیت کو خطبہ الہ آباد کی وجہ سے بھی مقبولیت اور شہرت ملی۔ اس خطبہ کے حوالے سے پاکستان کے مورخوں نے لکھا کہ ''اقبال نے اس خطبہ میں سب سے پہلے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا۔'' اور اسی تصور کی بنیاد پر 14 اگست 1947ء کو پاکستان دنیا کے نقشہ پر معرض وجود میں آیا۔ اس بنیاد پر علامہ اقبال کو ایک شاعر اور مفکر سے زیادہ مصور پاکستان لکھا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد علامہ اقبال کو اس حوالے سے جو مقام اور مرتبہ حاصل ہوا وہ پاکستان کے دیگر مسلم لیگی رہنماؤں اور تحریک پاکستان کے اکابرین کو حاصل نہ ہوسکا۔ اس کی کیا وجوہات رہیں یہاں اس موضوع پر بحث کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے بلکہ ہمارا موضوع یہ ہے کہ پاکستان کے کچھ مورخ، محققین، تاریخ نویس اور کالم نگار علامہ اقبال کی شاعری، اقبال کے سیاسی سفر، خطبہ الہ آباد اور اقبال کے خطوط کے حوالے سے تصویر کا

دوسرا رخ بھی پیش کرتے ہیں۔ اس بات کا فیصلہ یقیناً پاکستان کے ماہر تاریخ نویس، مورخین، محققین اور پروفیسر ہی کریں گے کہ تصویر کا کونسا رخ درست ہے۔ یہاں پنجاب کے علمی و ادبی حلقہ کے ممتاز صحافی، کالم نگار، دانشور اور محقق زاہد چوہدری، ممتاز دانشور محقق اور صحافی ڈاکٹر صفدر محمود، پنجاب کے ممتاز سیاسی رہنما، کالم نگار اور مصنف محمد فاروق قریشی، ممتاز دانشور اور صحافی انور شیخ نے تاریخی حوالوں اور مستند کتابوں سے اقبال کی شخصیت، شاعری، نظریہ قومیت، تصور پاکستان اور خطبہ الہ آباد کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اسے مختصراً نقل کر رہا ہوں تاکہ ملک کے دانشور، محقق، تاریخ نویس حقائق کی روشنی میں تصویر کے درست رخ کو ملک اور قوم کے سامنے پیش کر سکیں تاکہ مجھ جیسا کم علم اور تاریخ کا ہر طالب علم حقائق سے استفادہ حاصل کر سکے۔

زاہد چوہدری لکھتے ہیں کہ

> ''عاشق بٹالوی اور علامہ اقبال کے بعض دوسرے ''آدمیوں'' کی مشکل یہ ہے کہ یہ اپنے ممدوح کو ایک فوق البشر اور منزہ عن الخطاء شخصیت ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں اور بعض چھوٹے ''آدمی'' تو ایسے بھی ہیں کہ وہ حکیم الامت کی کچھ اس طرح مدسرائی کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کو نعوذ باللہ پیغمبری کا درجہ دے رکھا ہے۔ وہ اقبال کی زندگی کے کسی پہلو پر ذرا سی بھی نکتہ چینی کو برداشت نہیں کرتے۔ اس طرح وہ اقبال کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتے بلکہ اپنی غیر ضروری مبالغہ آرائی کے باعث اس میں کچھ کمی ہی کرتے ہیں۔۔۔ بایں ہمہ اقبال نہ ہی مذہبی مجدد تھے اور نہ سیاسی نظریہ ساز، بلکہ بنیادی طور پر ایک عظیم شاعر اور اعلیٰ پایہ کے مفکر تھے۔''

علامہ سر محمد اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دسمبر 1930ء کو الہ آباد میں جو خطبہ پڑھا اس خطبہ کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ سر محمد اقبال نے سب سے پہلے ایک اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا۔ مگر اس خطبہ کی روداد زاہد چوھدری کچھ یوں لکھتے ہیں کہ ''اس

اجلاس میں حاضری اتنی کم تھی کہ بہت دیر تک 75 ارکان کا کورم ہی پورا نہیں ہوا تھا۔ جب میزبانوں کی بڑی تگ ودو کے بعد کورم پورا ہوا تو علامہ اقبال نے اپنا وہ خطبہ صدارت پڑھا جس کا اس وقت اور اس کے بعد 1940ء تک کوئی خاص نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔ مسلمان دانشوروں نے اور مورخوں نے اس خطبہ کو 23 مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد ہی رفتہ رفتہ محسوس کرنا شروع کیا۔ 14 اگست 1947ء کے بعد پنجابی شائنسٹوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیا کہ اسلامی مملکت پاکستان کا تصور دراصل پہلی مرتبہ علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد میں پیش کیا گیا تھا تاریخ کو مسخ کرنے کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔ پنجابی شاؤنسٹوں کی جانب سے جس شدومد اور تواتر کے ساتھ اقبال کو تصور پاکستان کے خالق کو طور پر پیش کیا گیا اس کے دو مقاصد تھے۔ایک تو یہ ثابت کرنا تھا کہ پاکستان کا قیام دراصل پنجابی مسلمانوں کا مرہون منت ہے اس لئے پاکستان میں آباد باقی تمام قومیتیں ان کی بالا دستی کو تسلیم کریں۔ دوسرا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اس نظریاتی ہتھیار کو بھی انہوں نے پاکستان کی دوسری قومیتوں اور مظلوم طبقوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے اور ان پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لئے استعمال کیا۔ تاریخ عالم کا اصول یہ رہا ہے کہ سلطنت اور ممالک تاریخی جدل کی بدولت وجود میں آتے ہیں اور پھر جدلی عمل کے نتیجے ہی میں زوال پزیر ہوتے ہیں چنانچہ پاکستان کسی شاعر کے خواب کی تعبیر نہیں تھا۔''

ہندوستان کو نظریاتی بنیاد پر یا دو حصوں میں تقسیم کی تجویز تو بہت پرانی تھی۔ جان برائٹ نے جون 1858ء میں برٹش پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کی پانچ اکائیوں میں تقسیم کی تجویز پیش کی جنہیں برطانوی تسلط ختم ہونے کی صورت میں آزاد مملکتیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ سرسید احمد خان نے نظریاتی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کا واضح خواب دیکھا اور اس کی پیشگوئی کی۔ 1883ء میں مسٹر بلنٹ نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز دی۔ جمال الدین افغانی وسط ایشیا' افغانستان اور ہندوستان کے شمال مغربی مسلمان اکثریتی صوبوں پر

مشتمل ایک وسیع اسلامی مملکت کا تصور پیش کرتے رہے۔ عبدالحلیم شرر' ولایت علی بمبوق' خیری برادران' سردار گل خان' مولانا حسرت موہانی' لالہ لاجپت رائے' مولانا محمد علی جوہر' سر ریجنالڈ کریڈوک' چوہدری رحمت علی' سر عبداللہ ہارون اور ڈاکٹر عبداللطیف نے بھی اپنے اپنے انداز میں ہندوستان کو مختلف مذہبی اور انتظامی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے لئے تجاویز دیں جو تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔

علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد کو سیاق وسباق کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے خطبہ میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا تصور پیش نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے ہندوستان کے اندر پنجاب' سندھ اور سرحد پر مشتمل ایک خودمختار صوبے کی تجویز پیش کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے خطبہ میں خودمختار مسلم ریاستوں Autoumonous Muslim State کے الفاظ استعمال کئے نہ کہ آزاد Independent مسلم ریاستوں کے۔ خطبہ الہ آباد پڑھنے سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے۔

علامہ سر محمد اقبال نے خطبہ الہ آباد میں فرمایا تھا۔

''ہندوستان مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے اس جیتے جاگتے ملک میں اسلام کے ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک مخصوص علاقہ میں اس کی مرکزیت قائم ہو مسلمانان ہند کے اس سب سے جاندار حصے کی مرکزیت کی بدولت کہ جس نے حکومت برطانیہ کی شدید ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس کی خدمات انجام دے کر برطانوی راج کو ممکن بنایا۔''

اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بھرپور موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر نشوونما کرسکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں چاہے یہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہونگے۔ پنجاب جس کی 56 فیصد آبادی مسلمان ہے ہندوستان کی لڑاکا فوج کی 54 فیصد نفری مہیا

کرتا ہے اگر ہندوستان کی پوری فوج سے آزاد ریاست نیپال کے انیس ہزار گورکھوں کو نکال دیا جائے تو پنجاب کا حصہ تمام ہندوستانی فوج کا 62 فیصد ہو جاتا ہے۔ جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ممالک کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

ہندوؤں کے دلوں میں یہ خدشہ نہیں ہونا چاہئے کہ خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام سے ان علاقوں میں ایک طرح کی مذہبی حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔ مسلم ریاست کی نوعیت کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے ایک اداریے سے لگایا جا سکتا ہے ہندوستان کی بینکنگ کی انکوائری کمیٹی کے سلسلے میں اخبار نے لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست سود کی شرح کے متعلق قوانین بناتی تھی لیکن باوجود اسلام میں سود لینا حرام ہے مسلم دور حکومت میں ہندوستانی مسلم ریاستوں نے شرح سود پر کوئی پابندیاں نہیں لگائیں۔

اس لئے میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک مربوط ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ ہندوستان کے لئے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اندرونی توازن قوت کی وجہ سے امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کے لئے یہ ایک موقع ہوگا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو جائے جو عربی سامراجیت نے اس پر مسلط کیے تھے اور وہ خود اپنے قوانین تعلیم اور ثقافت کو وضع کرے اور انہیں اپنی حقیقی روح اور زمانہ حال کی روح دونوں کے قریب تر لے آئے۔ پس یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں ان گنت قسم کی آب و ہوا، نسلوں، زبانوں، عقیدوں اور معاشرتی نظاموں کی موجودگی میں ہندوستان میں ایک مستحکم دستوری ڈھانچہ صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ یہاں ایسی خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں جو زبان، نسل، تاریخ مذہب اور اقتصادی مفاد کی شناخت کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر وفاق کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کے تحت ضروری ہے کہ مرکزی مجلس قانون ساز ایک عوامی مجلس نہ رہے بلکہ وفاقی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔

مجھے یقین ہے کہ وفاقی حکومت کے قیام کی صورت میں مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر غیر جانبداری بری اور بحری فوجوں کو قائم کرنے کے لئے بخوشی رضامند ہو جائیں گی ہندوستان کے دفاع کیلئے اس قسم کی غیر جانبدار فوجی طاقت مغلیہ دور حکومت میں موجود تھی اکبر کے زمانہ میں ان تمام سرحدی فوجوں کے افسر ہندو تھے۔
مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان کے وفاق پر مبنی ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام میں مسلمانوں کی حب الوطنی میں اضافہ ہوگا اور اس سے بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ بیرونی حملہ کی صورت میں مسلمان حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے۔
''مجوزہ خود مختار مسلم ریاست قائم ہونے سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری مضبوط ہوگا اور جذبہ حب الوطنی فروغ پائے گا اگر وہ ہندوستان کے نظام ریاست میں رہ کر مکمل نشوونما کر سکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ مجوزہ ریاست میں مذہبی حکومت قائم نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک ایسی ریاست ہوگی جس میں شرح سوذ پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ مجوزہ ریاست میں مسلمانوں کو مخلوط نیابت کے اصول کے نفاذ پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ اگر وفاقی ہندوستان میں صوبوں کی حد بندی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے اصول کی بنا پر ہوگی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ نیابت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔''

علامہ اقبال نے اس خطبہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد و خود مختار بنی (Independant Sovereign) اسلامی مملکت کا تصور پیش نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اس خطبہ میں آسام اور بنگال کے مسلم اکثریتی علاقوں کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی اقبال کی اسکیم میں ریاست جموں و کشمیر کا کوئی تذکرہ تھا البتہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو ایک ریاست میں ضم کرنے کا مطالبہ ضرور کیا گیا تھا اور اسے وفاق ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک خود مختار یونٹ کی حیثیت سے وضع کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

زاہد چوھدری لکھتے ہیں کہ ''علامہ اقبال نے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ضم کر کے ہندوستان کے دائرے میں ایک خودمختار ریاست قائم کرنے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا اس کی بنیاد کسی نئے تصور پر نہیں تھی۔ 1928ء میں یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار ''انقلاب'' میں مرتضیٰ احمد خان کے نام سے ایک مضامین شائع ہوا تھا جس میں یہی مطالبہ کیا گیا تھا۔ علامہ اقبال ان دنوں پنجاب کونسل میں یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ علامہ اقبال کی تجویز کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک وسیع صوبہ تشکیل دے دیا جائے جس کو اتنی خودمختاری حاصل ہو کہ وہ مقابلتاً ترقی یافتہ ہندوؤں کے شکنجے سے آزاد ہو کر سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ اس میں لفظ ''ریاست'' بہ معنیٰ ''صوبہ'' کے استعمال کیا گیا تھا جس کی حیثیت متحدہ ہندوستان میں ایک وفاقی یونٹ کے طور پر تجویز کی گئی تھی۔ علامہ اقبال فرقہ وارانہ بنیادوں پر فقط صوبوں کی نئی حد بندی چاہتے تھے اور ان صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک مرکزی اسمبلی کا قیام چاہتے تھے جس کی سائمن رپورٹ میں بھی منظوری دی گئی تھی۔ علامہ اقبال تو صرف یہ چاہتے تھے کہ گول میز کانفرنس آئندہ ہندوستان کے لئے ایسا آئینی ڈھانچہ منظور کرے جس سے مسلمانوں کو بالعموم اور پنجاب کے مسلمانوں کو بالخصوص معاشی پستی اور بھاری قرضوں کے بوجھ سے نجات حاصل ہو۔

علامہ اقبال کے اس خطبہ کے بعض دوسرے قابل توجہ نکات یہ تھے۔

1۔ مجوزہ خودمختار مسلم ریاست قائم ہونے سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری مضبوط ہوگا اور جذبہ حب الوطنی فروغ پائے گا۔ اگر وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر مکمل نشوونما کر سکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔

2۔ مجوزہ ریاست میں مذہبی حکومت قائم نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک ایسی ریاست ہوگی جس میں شرح سود پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

3۔ مجوزہ ریاست میں مسلمانوں کو مخلوط نیابت کے اصول کے نفاذ پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر وفاقی ہندوستان میں صوبوں کی حد بندی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے اصول کی بناء پر ہوگی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ نیابت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔

4۔ مجوزہ ریاست کے قیام کی صورت میں ہندوستان میں اندرونی توازن قوت کی وجہ سے امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو یہ موقع ملے گا کہ وہ اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، تعلیم اور قانون پر صدیوں سے طاری ہے۔

5۔ ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت قائم ہونے سے مسلم وفاقی ریاست یا ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر مشترکہ بری اور بحری فوجوں کو قائم کرنے کیلئے رضامند ہو جائیں گی اور انہیں تمام سرحدی فوجوں کے افسروں کے ہندو ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اکبر کے زمانہ کی طرز کی فوجوں کی تشکیل سے مسلمانوں کی حب الوطنی میں اضافہ ہوگا اور اس سے اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ بیرونی حملہ کی صورت میں مقامی مسلمان حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

6۔ اگر ہندوستان میں ایسا دستور نافذ کرنے کی کوشش کی گئی جس کی بنیاد برطانیہ کی پارلیمانی جمہوریت کے اصولوں پر ہوگی تو اس کا نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں برآمد ہوگا اور برصغیر میں امن و امان قائم نہیں ہو سکے گا۔

علامہ اقبال نے ان نکات پر مشتمل ہندوستانی وفاق کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک خودمختار وفاقی مسلم ریاست یا ریاستوں کا جو تصور پیش کیا تھا اس کا اس تصور سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کی بنیاد پر 14 اگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آیا تھا۔ تصور پاکستان کے خالق دراصل علامہ اقبال نہیں تھے۔۔۔ علامہ اقبال کے خطبہ کے کسی حصہ سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ذہن میں ایک کلی طور پر آزاد و خودمختار یعنی Independenet and Sovereign اسلامی مملکت کے قیام کا تصور تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ گول میز کانفرنس

آئندہ ہندوستان کے لئے ایسا آئینی ڈھانچہ منظور کرے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو بالعموم اور پنجاب کے مسلمانوں کو بالخصوص ''معاشی پستی اور بھاری قرضوں کے بوجھ'' سے نجات حاصل ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ان دنوں سر فضل حسین کے ترجمان اخبار ''انقلاب'' کی تجویز کے مطابق پنجاب میں مسلمانوں کے لئے ان کی آبادی کے مطابق 56 فیصد سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کے حصول کے لئے جو تحریک چل رہی تھی، علامہ اس کی تائید وحمایت کرتے تھے۔ جبکہ خلافتی لیڈر حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور بعض دوسرے قوم پرست لیڈروں کا الزام یہ تھا کہ کانگریس مکمل آزادی کے لئے جو جدوجہد کر رہی ہے، یہ تحریک اس میں انتشار واختلاف پیدا کرنے کے لئے چلائی گئی ہے۔ علامہ کا خیال تھا کہ اگر انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے اور پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو مدغم کر کے اس علاقے کو ہندوستان کی فیڈریشن کے اندر ایک خودمختار ریاست کا درجہ دے دیا جائے تو اس میں مسلمانوں کی اتنی اکثریت ہوگی کہ وہ ہندو سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی مخالفت کے باوجود اپنے لئے ترقی کی راہیں تلاش کر لیں گے۔'' (حوالہ: مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء)

علامہ اقبال کے پوتے منیب اقبال کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے جو 8 مئی 1996ء کو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔ منیب اقبال کے مطابق: ''علامہ اقبال نے ملک تقسیم کرنے کا خواب نہیں دیکھا تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان معاشی طور پر خوشحال ہوں'' (حوالہ: سہ ماہی لبرٹی)

خطبہ الہ آباد کی وضاحت

علامہ اقبال خطبہ الہ آباد اور اپنے تصور کی بار بار وضاحت کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے انڈین فیڈریشن کے اندر ایک مسلمان اکثریتی صوبہ کی تجویز پیش کی ہے نہ کہ ایک آزاد مسلم ریاست کا تصور تو پھر کیا ہمارے لئے یہ مناسب اور جائز ہے کہ ہم ان سے کئی قدم آگے جا کر خطبہ الہ آباد سے ایک آزاد مسلم مملکت کا تصور تلاش کریں؟ علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد کے حوالے سے جو وضاحتیں کی ہیں اس بارے میں ڈاکٹر صفدر محمود اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کی ان وضاحتوں پر نظر ڈالیں جو انہوں نے اپنے خطبہ کے بعد مختلف موقع پر کیں تو بات واضح ہو جاتی ہے کیونکہ مصنف سے زیادہ اپنی تحریر کے مدعا اور مرکزی خیال کو اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم مصنف کی اپنی توضیح کو من وعن قبول کریں۔ بجائے اس کے کہ مصنف پر اپنے نظریات مسلط کرتے رہیں۔ 1930ء تک علامہ اقبال نہ ہی قائداعظم کے پیرو تھے کیونکہ انہوں نے واضح کہا کہ میں کسی پارٹی کا رہنما ہوں نہ کسی رہنما کا پیرو

"I lead no party, follow no leader"

اور نہ ہی وہ ایک آزاد مسلم یا اسلامی ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ذہنی اور فکری ارتقاء انسانی زندگی کا بنیادی اصول ہے چنانچہ خطبہ الہ آباد کے چند ہی برسوں بعد علامہ اقبال کے نظریات میں تبدیلی آئی جس کا واضح نقشہ ان کے خطوط بنام جناح میں ملتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبے کی سب سے پہلے وضاحت اکتوبر 1931ء میں کی جب وہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن میں موجود تھے۔ انگریز مصنف پروفیسر ایڈورڈ ٹامسن کو علامہ اقبال سے لگاؤ تھا۔ پروفیسر ٹامسن نے ''پان اسلامی سازش'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو لندن ٹائمز میں 3 اکتوبر 1931ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون میں پروفیسر ٹامسن نے علامہ اقبال کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''میں ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ صوبوں کے قیام کی مخالفت نہیں کررہا لیکن سر محمد اقبال تو ان کی کنفیڈریشن ہندوستان کے اندر یا باہر قائم کرنے کا مطالبہ کررہے ہیں۔ ذرا نقشہ پر نگاہ ڈالئے کہ بقیہ ہندوستان کے لئے کس قسم کی قابل دفاع سرحد رہ جاتی ہے۔ دراصل پروفیسر ٹامسن کو مسلمان صوبوں پر مشتمل ایک علیحدہ وفاق کے تصور پر تشویش تھی۔ علامہ اقبال ان دنوں لندن میں موجود تھے۔ انہوں نے پروفیسر ٹامسن کے مضمون کا نوٹس لیا اور اپنے خطبہ الہ آباد کی چند سطروں کی سیاق وسباق سے الگ کرکے پڑھنے اور نتیجہ اخذ کرنے پر پروفیسر صاحب کی علمی انداز سے سرزنش کی۔ انہوں نے پروفیسر ٹامسن کے مضمون کے جواب میں ایک مضمون لکھا جو لندن ٹائمز میں 12 اکتوبر 1931ء کو

شائع ہوا۔ اس خط کو پڑھیے اور کھلے ذہن سے اندازہ کیجئے کہ خود علامہ اقبال اپنے خطبے کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ اتفاق سے علامہ اقبال نے اپنے اس خط میں خطبہ الہ آباد سے اسی اقتباس کا حوالہ دیا جو ہماری نصابی کتابوں میں عام طور پر نقل (Qoute) کر کے تصور پاکستان کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے لکھا ''آپ کے 3 اکتوبر کے اخبار میں ڈاکٹر ٹامسن نے میرے صدارتی خطبہ جو میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے گزشتہ دسمبر کے اجلاس میں پڑھا تھا' کا درج ذیل حصہ سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے پان اسلامی سازش کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

''میری خواہش ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو یکجا کر کے ایک واحد ریاست بنا دی جائے خواہ اسے برطانوی سلطنت کے اندر خود مختاری حاصل ہو یا باہر۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم مسلم ریاست کا قیام' مسلمانوں کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کا بالآخر مقدر ہو چکی ہے۔

''کیا میں ڈاکٹر ٹامسن کو یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے برطانوی سلطنت سے باہر مسلم ریاست کا مطالبہ پیش نہیں کیا ہے بلکہ دھندلے مستقبل میں ان زبردست قوتوں کی امکانی کارفرمائی کے متعلق یہ ایک تخمینہ ہے جو اس وقت برصغیر ہند کے مقدر کی صورت گری کر رہی ہیں۔ کوئی ہندوستانی مسلمان جو عقل کا شائبہ رکھتا ہو' عملی سیاست کے ایک منصوبے کو کی حیثیت سے برطانوی دولت مشترکہ سے باہر شمالی مغربی ہند میں مسلم ریاست یا ریاستوں کے سلسلے کو قائم کرنے کا خیال نہیں کر رہا۔ میں ہندوستان کے ایسے صوبہ جات میں از سر نو تقسیم کا حامی ہوں جس میں کسی ایک فرقہ کی موثر اکثریت ہو' جس کی وکالت ہندو رپورٹ اور سائمن

کمیشن نے کی ہے۔

(بحوالہ کلیات مکاتب اقبال (جلد سوم)

سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی

(صفحات 246 تا 248) مزید ملاحظہ ہو زندہ رود۔

حیات اقبال کا اختتامی دور از ڈاکٹر جاوید اقبال صفحہ 415)

نہرو رپورٹ نے ہندوستان کے اندر رہتے ہوئے مسلمان اکثریتی یا فرقہ وارانہ اکثریتی صوبوں کی وکالت کی تھی جو داخلی طور پر خود مختار ہوں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ خود مختار (Autonomous) اور آزاد (Independent) بالکل مختلف تصورات ہیں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خود مختاری سے مراد داخلی خود مختاری ہے یعنی صوبے داخلی معاملات میں خود مختار ہوں جبکہ ملکی سطح پر اقتدار اعلیٰ کی مالک ریاست ہوتی ہے۔

یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خطبہ الہ آباد میں ایک آزاد مسلمان مملکت کا تصور موجود نہیں تھا۔ یوں تو اس امر کے بہت سے شواہد موجود ہیں اور خطبہ الہ آباد کو بغور پڑھنے سے بھی صورتحال واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال 1930ء میں کسی واضح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے تھے ورنہ وہ خطبہ الہ آباد میں Within اور Without دونوں کا بیک وقت ذکر نہ کرتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں دونوں امکانات اور آپشنز (Options) موجود تھے۔ ہمارے اکثر اسکالرز نے خطبہ الہ آباد سے مختلف مفہوم اخذ کئے ہیں لیکن یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ خود علامہ اقبال نے اپنے خطبے کے بارے میں کیا کہا ہے جبکہ علامہ مرحوم یہ خطبہ دینے کے بعد تقریباً آٹھ برس زندہ رہے ہیں۔"

(حوالہ: ڈاکٹر صفدر محمود۔ روزنامہ جنگ)

قارئین کی توجہ علامہ اقبال کے اس خط کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو انہوں نے 6 مارچ 1934ء کو مولانا راغب احسن کے نام لکھا اور خطبہ الہ آباد کے حوالے سے اپنے تصور کی

وضاحت کی۔اس خط کے حوالے سے محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں کہ

''علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط کا ایک مجموعہ ''اقبال...... جہان دیگر'' کے نام سے محمد فرید الحق نے شائع کیا۔ یہ مجموعہ مولانا راغب احسن کے نام خطوط پر مشتمل ہے۔اس میں 1927ء سے 1937ء کے ایک بڑے عہد کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس میں 6 مارچ 1934ء کا مکتوب' تاریخی اور نہایت سنسنی خیز ہے۔علامہ نے اپنی تجویز کی جو تشریح کی ہے اس نے خطبہ الہ آباد کا ہلا کر رکھ دیا ہے۔حالانکہ علامہ مصور پاکستان کے طور پر یاد کئے جاتے ہیں اور انہیں مفکر پاکستان بھی کہا جاتا ہے لیکن اس خط نے ان کی ان دونوں حیثیتوں کو مشکوک بنا دیا ہے۔مولانا راغب کے نام مکتوب انگریزی زبان میں ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

مارچ 1934ء

عزیز من راغب!

میرا خیال ہے یہ بات زیادہ مناسب ہوگی کہ میں فاضل رحمت اللہ سے سلسلہ جنباتی کروں اور یہی کروں گا لیکن آپ شفیع داؤدی صاحب سے فرمائیں کہ وہ اپنا خط تحریر فرما کر مجھے ارسال کر دیں اور خط پر ہم دونوں کے دستخط ہوں گے۔ مجھے توقع ہے کہ آپ مجھے جمہوریت اور آئین کے بارے میں اپنے خیالات سے جلد از جلد آگاہ کریں گے۔

میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈورڈ تھامسن کا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ایڈورڈ تھامسن انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت ہیں۔ یہ تبصرہ مختلف وجوہات کی بناء پر دلچسپ ہے اور شاید تبصرہ آپ کے جریدے میں اشاعت کے لئے مناسب ہی رہے۔دوسری کاپی ''اسٹار آف انڈیا'' (کلکتہ) کو روانہ کر دیجئے۔

براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ اس تبصرہ کا منصف اس مغالطہ کا شکار ہے کہ جیسے میری تجویز ''پاکستان کی اسکیم'' سے تعلق رکھتی ہے۔

جہاں تک میری تجویز کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے۔ جبکہ پاکستان اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علیحدہ ہو اور انگلستان سے براہ راست وابستہ ہو۔

آپ اپنے تعارفی کلمات میں اس نکتہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ''اسٹار آف انڈیا' کے مدیر کی توجہ بھی اس نکتہ کی جانب منعطف کرادیں۔

خدا کرے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

(حوالہ: اقبال۔ جہان دیگر)

(حوالہ: ولی خان اور قرارداد پاکستان)

علامہ اقبال نے 4 مارچ 1934ء کو آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ جان تھامپسن کے مضمون کے جواب میں لکھا تھا۔ ''آپ نے مجھے اس اسکیم کا حامی قرار دیا ہے جو پاکستان کے نام سے موسوم ہے' پاکستان میری اسکیم نہیں ہے جو تجویز میں نے اپنے خطبہ میں پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبہ کے قیام کی تجویز تھی'' اقبال کا یہ تاریخی خط ان خطوط میں شامل ہے جو کتاب کی صورت میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے پروفیسر ایس حسن احمد نے 1979ء میں علیگڑھ سے شائع کی تھی۔ اس خط میں اقبال نے پروفیسر ایڈورڈ تھامپسن کو اپنے نظریات اور خطبہ الہ آباد کے حوالے سے وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''مائی ڈیئر مسٹر تھامپسن''

مجھے اپنی کتاب پر آپ کا ریویو (Review) ابھی ابھی موصول ہوا ہے یہ بہت عمدہ ہے اور میں ان باتوں کیلئے آپ کا بہت ممنون ہوں جو آپ نے اس میں میرے متعلق بیان کی ہیں لیکن آپ نے ایک غلطی کی ہے جس کی میں فوری نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ایک فاش غلطی ہے۔ آپ نے میرے بارے میں کہا ہے کہ میں اس اسکیم کا حامی ہوں جسے ''پاکستان'' کہا جاتا ہے جبکہ پاکستان میری اسکیم میں نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبہ میں جو تجویز پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبہ کے بارے میں تھی جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل تھا میری اسکیم کے مطابق یہ نیا صوبہ مجوزہ انڈین فیڈریشن کا حصہ ہوگا جبکہ پاکستان اسکیم میں مسلم صوبوں پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن کا قیام تجویز کیا گیا ہے جو ایک علیحدہ ڈومینیشن کی حیثیت سے انگلستان کے ساتھ براہ راست تعلق رہے گا۔ اس اسکیم نے کیمبرج میں جنم لیا ہے اس اسکیم کے مصنفین کا خیال ہے کہ ہم جو گول میز کانفرنس کے مندوبین ہیں، ہم نے مسلم قوم کو ہندوؤں یا نام نہاد انڈین نیشنلزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

خیر اندیش

محمد اقبال

علامہ اقبال نے جس مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا اس میں انہوں نے پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان کو شامل کرنے کی تجویز دی تھی۔ لیکن 1947ء کو دنیا کے نقشہ پر جس اسلامی نظریاتی مملکت نے جنم لیا اس مملکت کا سب سے بڑا صوبہ مشرقی پاکستان تھا جس کی آبادی 65 فیصد تھی۔ علامہ اقبال نے جس مسلم ریاست کی تجویز دی تھی اس اسکیم میں نہ تو مشرقی پاکستان

(بنگال) شامل تھا اور نہ ہی پاکستان کی شہ رگ کشمیر کا ذکر تھا۔ ڈاکٹر نجم عباس کے حوالے سے ''سندھ کوارٹرلی'' میں لکھا ہے۔

''سر اقبال اپنے دل کی گہرائیوں سے پنجابی قوم پرست تھے ان کی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے علیحدہ ریاست میں بنگال شامل نہیں تھا گو کہ یہ مسلمانوں کی اکثریت کا حصہ تھا۔ ان کی مسلم ریاست تھی پنجاب اور اطراف کے مسلم اکثریتی صوبے۔ ان کے تصور میں یہ علاقہ ''عظیم تر پنجاب'' تھا جہاں پنجابیوں کا مکمل اختیار و اقتدار ہو۔'' علامہ اقبال نے جن صوبوں پر مشتمل مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا اس اسکیم کے بارے میں ''تحریک پاکستان میں پنجاب کا کردار'' میں لکھا ہے۔ ''علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد میں ایک آزاد مسلم ریاست کی بجائے شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں کے انضمام کا تصور پیش کیا تھا جس کو 1952ء کے ون یونٹ کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے''

بقول انور شیخ' علامہ اقبال کے یہ اشعار خود اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

(حوالہ: سہ ماہی لبرٹی' جنوری 1998)

☆☆☆☆☆

اقبال کے نظریاتی سفر میں تضادات

علامہ اقبال کو شاعر مشرق اور قومی شاعر کہا جاتا ہے۔ اقبال کے بارے میں یہ لکھا جاتا ہے کہ اقبال کی شاعری قومی بھی ہے اور ملی بھی۔ بلکہ ان کی شاعری میں فکری پہلو نمایاں ہے۔ اقبال کی شاعری کا ایک نہایت اہم پہلو اسلامی افکار و نظریات کی تشریح اور تفسیر ہے۔ اقبال اپنے دور کے معاشی اور معاشرتی مسائل سے بھی بے خبر نہیں تھے۔ وہ اپنے دور میں سرمایہ اور محنت کی کشمکش کا بھی احساس رکھتے تھے۔ معاشی استحصال اور سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے فرماتے تھے۔

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو

علامہ اقبال کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "وہ بعض مسلمان سیاستدانوں اور مفکروں کی طرح ایک متحدہ ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس دور میں وہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

جیسی قومی نظمیں لکھ رہے تھے، لیکن ہندو اکثریت کے رویئے نے اس خواب کو پریشان کر دیا اور اقبال ملت اسلامیہ کے شاعر بن گئے" اقبال کی شاعری کے حوالے سے زاہد چوہدری کا ایک الگ نقطہ نظر ہے جسے درست ثابت کرنے کے لئے انہوں نے کئی تاریخی کتابوں کا سہارا لیا

ہے۔زاہد چوہدری نے اپنے مضمون ''اقبال کے نظریاتی سفر میں تضادات کا تاریخی پس منظر'' میں جو کچھ لکھا ہے' اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے مگر یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر صحت مند فکری بحث کی ضرورت ہے۔

زاہد چوہدری مستند اور ممتاز مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے شاعری گورنمنٹ کالج میں طالب علمی کے زمانے میں ہی شروع کر دی تھی۔ اور 1899ء میں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں نالہ یتیم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی' اسی سال انہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کر کے اورنٹیئل کالج لاہور میں بطور ریڈر ملازمت اختیار کر لی۔ 1901ء میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کی تھی جس میں ہندوستان میں اسلامی قومیت و سیرت کی نشو و نما کے مختلف اسلوب کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ'' پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں''

1905ء میں وہ بیرسٹری کرنے کے لئے لندن چلے گئے۔اس وقت تک ان کی شاعری زیادہ تر مظاہر فطرت' ہنگامہ کائنات اور حسن و جمال کے مطالعہ سے مرتب شدہ محسوسات پر مشتمل تھی۔اس میں ہندوستانی قوم پرستی اس حد تک تو تھی کہ ترانہ ہندی کی صورت میں اپنے وطن اور اس کی چیزوں سے پیار و محبت کے جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔

22 جنوری 1901ء کو ملکہ وکٹوریہ کے انتقال ہوا تو 24 جنوری کو لاہور میں ملکہ کی تعزیت میں ایک جلسہ ہوا جس میں اقبال نے ایک سو دس اشعار پر مشتمل ایک ترکیب بند مرثیہ بعوان'' اشک خوں'' پڑھا۔جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

اے آہ آج برق سر کوہسار ہو
یا تیر بن کے میرے کلیجے کے پار ہو
ہو ٹکڑے ٹکڑے ٹوٹ کے اے رشتہ نفس
اے مرغ روح، باز اجل کا شکار ہو

میت اٹھی ہے شاہ کی، تعظیم کے لئے
اقبال اڑ کے خاک سر راہ گزار ہو

آئی ادھر نشاط، ادھر غم بھی آ گیا
کل عید تھی تو آج محرم بھی آ گیا

ہاں اے ہلال عید خدا کی قسم تجھے
خواہان عیش کیا نظر آتے ہیں ہم تجھے

اے جام بزم عید مقدر یہ تھا ترا
لبریز کرنے آئے ہے اشک غم تجھے

کہتے ہیں آج عید ہوئی ہے ہوا کرے
اس عید سے تو موت ہی آئے خدا کرے

دل کا تو ذکر کیا ہے کہ دل کا قرار بھی
سیماب کی طرح سے ہوا بے قرار آج

اے ہند تیرے سر سے اٹھا سایہ خدا
اک غم گسار تیرے مکینوں کی تھی، گئی

اے ہند جو فضیلت نسواں کی تھی دلیل
تیرے گھروں کی پردہ نشینوں کی تھی گئی

لے اے عروس ہند تری آبرو گئی
آنکھوں کو اشک غم سے درخشاں کئے ہوئے

برطانیہ تو آج گلے مل کے ہم سے رو
سامان بحر ریزئی طوفاں کئے ہوئے

اے کوہ نور تو نے تو دیکھے ہیں تاجور
دیکھا ہے اس طرح کا کوئی تاجور کہیں؟

وکٹوریہ نہ مرد کہ نام نکو گذاشت
ہے زندگی یہی جسے پروردگار دے

اے باغ ہند تیرا خیابان بجائے گل
موتی بجائے دامن ابر بہار دے

پژمردہ کر گئی ہے جو باد خزاں تجھے
حذ نو بہار ناز تجھے روزگار دے

1918ء میں جبکہ پوری برصغیر میں تحفظ خلافت کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا علامہ اقبال نے نواب علی خان کے وساطت سے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کی فرمائش پر ایک نظم لکھی جس میں سرکار برطانیہ کے حضور میں اہل وفا کی جانب سے سرکا نذرانہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ نظم بعنوان ''پنجاب کا جواب'' دراصل پنجاب کے بدنام ترین لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے عہد میں برطانوی سامراج کا قصیدہ تھا جو اقبال نے خود یونیورسٹی ہال کے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا۔ بعد میں یہ نظم 11 مئی 1918ء کو ''وکیل'' (امرتسر) میں بھی شائع ہوئی۔ نو بندوں پر مشتمل اس قصیدے کے چند بند یہ تھے۔

اے تاجدار خطہ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند

محکم ترے قلم سے نظام جہاں ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند

ہنگامہ وغا میں میرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقاد خیر و شر
بہروز جنگ توز جگر سوز سینہ در

رایت تری سپاہ کا سرمایہ ظفر
آزادہ، پرکشادہ، پری زادہ، یم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

وقت آگیا کہ گرم ہو میدان کارزار
پنجاب ہے مخاطب پیغام شہر یار
اہل وفا کے جوہر پنہاں ہوں آشکار
معمور ہو سپاہ سے پہنائے روزگار
تاجر کا زر ہو اور سپاہی کا زور ہو
غالب جہاں میں سطوت شاہی کا زور ہو
اخلاص بے غرض ہے، صداقت بھی بے غرض
خدمت بھی بے غرض ہے، اطاعت بھی بے غرض
عہد وفا و مہر و محبت بھی بے غرض
تخت شہنشہی سے عقیدت بھی بے غرض
لیکن خیال فطرت انسان ضرور ہے
ہندوستاں پہ لطف نمایاں ضرور ہے
جب تک چمن کے جلوہ گل پر اساس ہے
جب تک فروغ لالہ احمر لباس ہے
جب تک نسیم صبح عنا دل کو راس ہے
جب تک کلی کو قطرہ شبنم کی پیاس ہے

قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

اس نظم کے تعارف میں غلام رسول مہر لکھتا ہے کہ پہلی جنگ یورپ کے دوران مائیکل اوڈوائر پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے جہاں جنگی تنظیمات کے سلسلے میں بیسیوں اور تدبیریں اختیار کی تھیں وہاں مختلف اوقات میں مشاعرے بھی کرائے تھے۔ 1918ء کے ایک مشاعرے میں اوڈوائر نے اقبال سے بطور خاص نظم لکھنے اور مشاعرے میں آنے کی فرمائش کی تھی۔ زمانہ ایسا نازک تھا کہ اس فرمائش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہیں تھی لہذا اقبال نے مندرجہ ذیل نظم لکھی اور خود مشاعرے میں جا کر پڑھی۔ 11 مئی 1918ء کے ''وکیل'' (امرتسر) میں یہ شائع ہوئی تھی۔

اقبال کی یہ نظم کسی تعبیر وتشریح کی محتاج نہیں، اس نظم میں پنجاب کے اہل وفا کی طرف سے برطانوی سامراج کو سر کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ ہندوستان کی خونخوار تیغ سے دشمن کے سر اور سودائے خام کا خاتمہ کیا گیا تھا حالانکہ اس دشمن کی صف میں سلطنت عثمانیہ بھی شامل تھی اور پھر برطانیہ کے تخت شہنشی سے بے غرض عقیدت واطاعت کا اظہار کر کے یہ دعا کی گئی تھی کہ ہندوستان پر اس کا سایہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

اقبال کی اس نظم میں مسلم قومیت یا پان اسلام ازم کا نام ونشان نہیں ملتا بلکہ اس کی تباہی وبربادی کا پیغام موجود ہے۔ اس نظم میں اسلام عالم کی سربلندی کی بھی کسی خواہش کا اظہار نہیں۔ دعا برطانوی سامراج کی فتح وسربلندی کے لئے کی گئی ہے۔ عبدالمجید سالک لکھتا ہے کہ یہ مسدس لکھنے سے قبل چار سال تک علامہ زیادہ تر منقار زیر پر ہی رہے اس لئے کہ بے حد پرآشوب زمانہ تھا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان اور بے شمار دوسرے علمبرداران اتحاد اسلامی قید وبند تھے۔ اگر اس دور میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکام وقت کو ناگوار ہوتی تو حکومت کی شدید گرفت میں آجاتے اور کوئی نتیجہ بھی مرتب نہ ہوتا۔ گویا اقبال کی عافیت کوشی ان کی اتحاد اسلامی کی علمبرداری کے راستے میں حائل رہی اور اسی عافیت کوشی نے ان کو

برطانوی شہنشاہیت کا قصیدہ لکھنے کی ترغیب دی تھی۔

11 نومبر 1918ء کو پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ 15 دسمبر کو پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اوڈور نے بریڈ ہال میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خان کے ساتھ شریک ہوئے اور انہوں نے لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین نظمیں پڑھیں ان میں چند فارسی کے اشعار بھی تھے جن میں فرانس، روس، برطانیہ اور امریکہ کی تعریف کی گئی تھی۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کا سترھواں اجلاس 21، 22 اور 23 فروری 1902ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں منعقد ہوا۔ 22 فروری کے دوسرے سیشن میں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب میکورتھ ینگ (Mackworth Young) اور ڈائریکٹر تعلیم پنجاب ولیم بل (William Bill) بھی موجود تھے۔ اس موقع پر اقبال نے نظم ''خیر مقدم'' پڑھی۔ جس میں لیفٹیننٹ گورنر کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔

خوشا نصیب وہ گوہر ہے آج زینت بزم
کہ جس کی شان سے ہے آبروئے تاج و سریر

وہ کون زیب دہ تخت صوبہ پنجاب
کہ جس کے ہاتھ نے کی قصر عدل کی تعمیر

حضور زینت محفل ہیں ناز ہے ہم کو
جھلک رہی ہے نصیبوں میں سبزی کشمیر

دعا نکلتی ہے دل سے حضور شاد رہیں
رہیں جہان میں عظمت طراز ساج و سریر

ولیم بل کیلئے علامہ اقبال نے یہ اشعار پڑھے۔

ہوئے ہیں رونق محفل جناب ولیم بل
ضیائے مہر کی صورت ہے جن کی ہر تدبیر

یہ علم و فضل کی آنکھوں کا نور ہیں واللہ
انھیں کی ذات سے حاصل ہے مہر کو تنویر

خوشا نصیب کہ یہ ہمرہ حضور آئے
ہماری بزم کی یکبار بڑھ گئی توقیر

بڑھے جہان میں اقبال ان مشیروں کا
کہ ان کی ذات سراپا ہے عدل کی تصویر

1923ء میں جبکہ تحریک ترک موالات کی وجہ سے پورے ہندوستان میں سرکاری خطابات کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی، علامہ کو نواب ذوالفقار علی خان کی سفارش پر سر کا خطاب دیا گیا تھا جسے انہوں نے محض اس لئے قبول کرلیا تھا کہ گورنر میکلگین کی طبیعت مکر درسی ہوگئی تھی اور وہ یہ سمجھا تھا کہ اقبال بھی اس معاملے میں عوام کے ہم خیال ہیں۔''

(مذید تفصیل کے لئے دیکھیں: باقیات اقبال، ترتیب اول سید دبدالواحد معینی۔ سرودرفتہ، غلام رسول مہر۔ ذکر اقبال، عبدالمجید سالک۔) (حوالہ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء... زاہد چوہدری)

انور شیخ اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں۔''ایک ایسے موقع پر جب تحریک خلافت کے کارکن انگریزوں کیخلاف احتجاجی مظاہرے کرر ہے تھے۔ اقبال نے اس موقع پر تحریک کے کارکنوں کو''اخوان الشیاطین'' کے لقب سے نوازا اور خود بھی تحریک آزادی سے بالکل الگ رہے۔ انگریز سرکار نے علامہ اقبال کی وفاداری کا پاس کرتے ہوئے انہیں''سر'' (Sir) کے خطاب سے نوازا جسے انھوں نے بخوشی قبول کرلیا، اس سلسلے میں مسلمانوں کا جو ردعمل تھا اس کا اندازہ مولانا سالک کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوسکتا ہے۔

پہلے تو سر ملت بیضا کے تھے وہ تاج
اب اور سنو تاج کے سر ہوگئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ
سرکار کی دہلیز پہ سر ہوگئے اقبال

(حوالہ: انور شیخ۔۔ سہ ماہی لبرٹی)

محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں۔ ''جاوید نامہ میں انہوں نے نہرو خاندان کی قومی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے جو بنیاد تلاش کی ہے وہ حد درجہ حیران کن اور استعجاب انگیز ہے وہ مسلم قومیت اور قوم پرستی کو یکسر فراموش کے علاقہ پرستی میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں کہاں وہ وسعت نظر اور کہاں یہ عصبیت ؟ علامہ موصوف نے اس خاندان کی استخلاص وطن کے لئے جدو جہد کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اہل ہند کو ذوق آزادی سے آشنا کرنے کا سہرا ان کے سر پر باندھا ہے جنہوں نے اپنی ذہانت' فطانت' دوررس نگاہ اور سخت محنت سے برطانوی استعمار کو متزلزل کر دیا۔ اس سے بڑھ کر ان کی اصل خوبی و حسن یہ ٹھہرا کہ ان کا خمیر سرزمین کشمیر دل پذیر کی مردم خیز خاک سے اٹھایا گیا اور نسلی اعتبار سے وہ کشمیر کے برہمن زادے ہیں ان مشترک اقدار کے سبب وہ معزز معظم اور محبوب قرار پائے جاوید نامہ میں تذکرہ کے باعث ان کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔

هندرا ایں ذوق آزادی کہ داد — صید راسودائے صیادی کے داد
آں برہمن زادگان زندہ دل — لالہ احمر زروئے شاں خجل
تیز بیں وپختہ کاروسخت کوش — از نگاہ شاں فرنگ اندرخروش
اصل شاں از خاک دامنگیر ماست — مطلع ایں اختراں کشمیر ماست
خاک مارابے شرر دانی اگر — بردردن خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ وادی از کجاست — ایں دم باد بہاری از کجاست
ایں ہماں باداست کز تاثیراو — کوہسار ماگبیرد رنگ وبو
ہیچ می دانی کہ روزے دردلر — موجۂ می گفت باموج دگر

ہیچ می دانی کہ روزے دردلر
موجہ می گفت باموج دگر

(حوالہ۔ جاوید نامہ)



پنجاب کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت

قیام پاکستان سے قبل پنجاب میں مسلمان معاشی اور معاشرتی طور پر دو طبقوں میں تقسیم تھے ایک طبقہ تو جاگیرداروں کا تھا جس نے مفاد پرستی، خود غرضی، محلاتی سازشوں اور اندرون خانہ گھٹیا سودے بازی کے ذریعہ جاگیرداروں کا ایک ایسا مضبوط طبقہ پیدا کیا۔ جس نے ''وفاداری بشرط استواری'' کے صلے میں زمینیں اور جاگیریں حاصل کیں۔ اس طبقہ نے 1857ء کی جنگ آزادی سے لیکر انگریز حکومت کے متزلزل ہونے تک انگریز سامراج کی ہر لحہ خدمت کی۔ جاگیرداروں کا یہ خوشحال طبقہ پنجاب کی سیاست پر چھایا نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس اگر پنجاب کے غریب عوام کی معاشی اور معاشرتی حالت پر نظر ڈالیں تو وہ بہت ہی مفلسی اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے ان کی معاشی اور معاشرتی حالت نہایت خستہ تھی، ناقابل برداشت معاشی بوجھ اور مایوسی نے انہیں خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جاگیرداروں نے مسلمانوں کو تحفظ دینے اور معاشی طور پر انہیں مستحکم کرنے کی بجائے اپنی غریب اور مظلوم رعایا کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ جاگیراروں نے مزارعوں اور غریب رعایا پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے۔ انہیں اپنا غلام اور محکوم بنا کر رکھا۔ جاگیرداروں نے ان کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک رکھا اس کے بعد غریب مزدور اور کسان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ جاگیرداران کے حکمران اور آقا ہیں۔ یہی ان کے مقدر کے فیصلے لکھتے ہیں۔ اسلام مسلمانوں کو سکھاتا ہے کہ خدا عظیم تر ہے' وہی تمہیں روزی دیتا ہے۔ مگر غریب مزارع اور مزدور جو صبح و شام جاگیرداروں کی زمینوں پر محنت کرتا ہے' اس کے ذہن میں یہ

بات بٹھا دی جاتی ہے کہ زمین کا مالک جاگیردار ہے' جو تمہیں زمین سے بے دخل کر سکتا ہے' بھوکا مار سکتا ہے۔ ذاتی جیلوں میں قید کر سکتا ہے۔ مزارع کی بیٹی' بہن اور بیوی کو اغوا کر سکتا ہے۔ مزارع کی عزت و آبرو کو سرعام نیلام کر سکتا ہے۔ اگر کوئی جاگیردار کے حکم عدولی یا نافرمانی کرے تو اسے قتل بھی کرا سکتا ہے۔ مزارع کے دل اور دماغ میں یہ خوف بٹھا دیا جاتا ہے کہ تمہاری زندگی کے فیصلے جاگیردار کرتا ہے وہی تمہارا مالک ہے۔ تمہاری نسلوں کو نسل در نسل انہی جاگیرداروں کی غلامی کرنی ہے۔ تمہاری قسمت میں غلامی لکھ دی گئی ہے اور قسمت سے لڑا نہیں جاتا۔

جاگیرداروں کے ان مظالم کی وجہ سے پنجاب کے مزارعوں اور کسانوں کی زندگی عبرت کا نشان بنی ہوئی تھی۔ انتہائی مفلسی اور محتاجی کی وجہ سے انسان نام کے یہ مخلوق جاگیردار کے جوتے تلے پس رہے تھے۔ ان انسانوں کی زندگی جاگیردار کے گھوڑوں اور کتوں سے بھی بدتر تھی۔ جاگیردارانہ نظام کے اس انتہائی مکروہ چہرے اور اس کی تمام تر سفاکیوں اور ہیبت ناکیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ پنجاب کا عام انسان' زمینوں پر کام کرنے والے مزارعے، کسان اور مزدور معاشی اور اقتصادی طور پر انتہائی پست حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور تھا جس کا تصور ناممکن ہے۔

پنجاب میں مسلمان نوجوانوں کو نہ تو سرکاری ملازمت ملتی تھی اور نہ ہی تجارت و صنعت کے شعبوں میں ان کے لئے کوئی گنجائش تھی۔ صوبہ پنجاب میں مسلمان پنجابیوں کی آبادی 56 فیصد تھی مگر پنجاب میں تجارت، صنعت اور سرکاری ملازمتوں پر ہندو اور سکھ قابض تھے۔ سکھ اور ہندو سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو قدم رکھنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں اور سکھوں کا شمار تعلیم یافتہ اور ترقی پسندانہ طبقہ میں ہوتا تھا۔ تجارت اور صنعت کے ساتھ ساتھ چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتوں پر ان ہی کا مکمل غلبہ تھا۔ شمالی پنجاب میں سکھوں کی زمینداریاں کم تھیں، وہ زیادہ تر ساہوکاری کا کام کرتے تھے وہ تجارت کے پیشہ سے منسلک تھے ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت غریب کسانوں پر مشتمل تھی اکثر و بیشتر غذائی قلت اور مفلسی کا شکار تھے۔ مسلمان مزدوری اور چھوٹی چھوٹی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمتیں کرنے پر

مجبور تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کے بارے میں انگریز افسر تھور برن (Thorburn) نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:

''پنجاب ایک زرعی صوبہ ہے یہ ایسے کسانوں کی سرزمین ہے جن کی بھاری اکثریت ہر سال ساہوکاروں کی غلامی کی زنجیر میں جکڑی جارہی ہے۔ زمین کی ملکیت رفتہ رفتہ اپنے قدرتی مالکوں یعنی کاشت کاروں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندو ساہوکاروں اور تاجروں کے پاس جارہی ہے۔ دیہی علاقوں میں مسلمان کسانوں کی سالانہ آمدنی کا 80 فیصد حصہ قرضوں کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے ہندو کسانوں کی آبادی 40 فیصد ہے لیکن ان میں صرف 20 فیصد مقروض ہیں۔ ہندو کسانوں کی سالانہ آمدنی کے 20 فیصد حصہ سے ان کے قرضوں کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے قرضوں کے اس فرق کی وجہ دونوں کی عادات میں مضمر ہے۔ مسلمان تقریباً سارے ان پڑھ ہیں۔ ہندو کم وبیش سارے تعلیم یافتہ ہیں ہندو عام طور پر ان کارروائیوں سے گریز کرتے ہیں جو انہیں فوجداری قانون کی زد میں لاسکتی ہے جبکہ تقریباً ساری جرائم پیشہ آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ان پر اخراجات کا یہ زائد بوجھ بھی پڑتا ہے حالانکہ ان کی آمدنی کا ذریعہ صرف کاشتکاری ہے''

مسلمان کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہوئے 1885ء میں ایک سرکاری سرکلر جاری ہوا جس میں صوبائی گورنروں، ہائی کورٹوں اور ماتحت افسروں کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کی کمی کو دور کرنے کیلئے خاص کوشش کریں مگر اس پر کوئی زیادہ عمل درآمد نہ ہوسکا کیونکہ سرکاری دفتروں میں ہندوؤں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتوں کی طرح تعلیمی میدان میں بھی مسلمانوں کی حالت بہتر نہیں تھی۔ پنجابی مسلمانوں کی اکثریت زراعت کے پیشہ سے وابستہ تھی اس لئے انہیں جدید تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جبکہ دوسری طرف مسلمان جاگیردار علم دشمن تھے وہ اپنے علاقے میں کوئی اسکول کھلنے نہیں

دیتے تھے۔ 1869ء میں لاہور میں گورنمنٹ کالج قائم ہوا تو مسلمانوں نے اس ادارے میں اپنے بچوں کو بھیجنے سے حتی الامکان گریز کیا۔ 1882ء میں پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تب بھی مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جبکہ صوبے کی 30 فیصد ہندو اقلیت نے تعلیم حاصل کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی 56 فیصد تھی مگر اس کے مقابلے میں سرکاری ملازمتوں اور اہم عہدوں پر ہندو اور سکھ چھائے ہوئے تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہندو اور سکھ مسلمانوں کا استحصال کر رہے تھے۔ اس حوالے سے 1935ء میں ایک پمفلٹ سر فضل حسین کی جانب سے شائع ہوا جس میں انھوں نے پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی اور ان کی ملازمتوں کے حوالے سے ایک رپورٹ مرتب کی تھی جس کے مطابق سرکاری محکموں کی تمام چھوٹی بڑی آسامیوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم تھا۔ پنجاب سول سروس (ایگزیکٹو برانچ) میں مسلمانوں کا تناسب 40 فیصد اور جوڈیشنل برانچ میں 34 فیصد تھا۔ پولیس انسپکٹر کی آسامیوں میں 38 فیصد تھے۔ البتہ سب انسپکٹری میں انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملازمتیں حاصل تھیں۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل کے درجے میں انہیں آبادی کے تناسب سے زیادہ حصہ ملا ہوا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی کی پراونشل انجینئرنگ سروس میں ہندوؤں اور سکھوں کا تناسب 66 فیصد تھا اور اس کے مقابلے میں مسلمان صرف 18 فیصد تھے۔ سب انجینئرنگ کے درجے میں مسلمان 12 فیصد اور ہندو 87 فیصد تھے۔ سب آرڈینیٹ انجینئرنگ سروس میں مسلمان 30 فیصد اور ہندو اور سکھ 70 فیصد تھے۔ کلرک اور ہیڈ کلرک کی آسامیوں پر مسلمانوں کا تناسب 26 فیصد اور ہندوؤں اور سکھوں کا حصہ 66 فیصد تھا۔ پٹواریوں میں مسلمان صرف 38 فیصد تھے۔ محکمہ جنگلات کی پراونشل سروس میں مسلمانوں کا تناسب 17 فیصد تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کا تناسب 83 فیصد تھا۔ محکمہ مال کے پٹواریوں میں البتہ مسلمان 50 فیصد کے قریب تھے، محکمہ قانون میں مسلمانوں کی تعداد بے حد قلیل تھی۔ ہائی کورٹ کے کلرکوں میں مسلمانوں کا حصہ

37 فیصد کے قریب تھا۔ پنجاب کے سول سیکریٹریٹ میں، جو تمام صوبے کے نظم و نسق کا مرکزی ادارہ سمجھا جاتا تھا مسلمان کلرکوں کی تعداد صرف 37 فیصد تھی۔ فنانشل کمشنر کے دفتر میں مسلمان صرف 37 فیصد تھے۔ زراعت کے محکمہ کے پراونشل سروس کے درجہ اول میں ایک مسلمان بھی نہیں تھا اور ایگریکلچرل اسسٹنٹ کے عہدے پر مسلمانوں کا تناسب صرف 33 فیصد تھا۔ وٹرنری میں ان کا تناسب 40 فیصد کے قریب تھا۔ پی ڈبلیو ڈی کی پراونشل سروس میں مسلمان 11 فیصد تھے اور اسپیشل گریڈ میں ان کا حصہ صرف 7 فیصد تھا۔ سب انجینئر کی آسامی پر ان کا تناسب 11 فیصد کے قریب تھا۔ کلرکوں میں وہ صرف 36 فیصد تھے۔ محکمہ تعلیمات کے اسپیشل گریڈ میں مسلمان 11 فیصد تھے۔ پراونشل گریڈ کے درجہ دوئم کی ایک سو گیارہ آسامیوں میں سے مسلمانوں کے پاس صرف 36 فیصد حصہ تھا اور 57 فیصد ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں۔ سب آرڈینیٹ سروس کی 988 آسامیوں میں سے مسلمانوں کے پاس 39 فیصد اور ہندوؤں اور سکھوں کے پاس 61 فیصد حصہ تھا محکمہ صحت میں سول سرجن کی آسامیوں میں سے مسلمانوں کا تناسب 22 فیصد، اسسٹنٹ سرجن میں 37 فیصد اور سب اسسٹنٹ سرجن میں 22 فیصد تھا۔ ڈسپنسروں کی معمولی ملازمتوں میں بھی مسلمان صرف 32 فیصد تھے۔ پبلک ہیلتھ کے محکموں میں مسلمانوں کا مجموعی حصہ 30 فیصد تھا۔ اگر صوبہ پنجاب کے سرکاری اداروں میں مسلمانوں کی تعداد کا جائزہ لیا جائے تو صورتحال اور واضح ہو جاتی ہے۔ سرکاری اداروں کے اہم عہدوں پر مسلمان نہ ہونے کے برابر تھے محکمہ خزانہ پنجاب، سول سیکریٹریٹ میں ملازمین کی کل تعداد 12 تھی ان میں مسلمان صرف 2 تھے۔ ریزو بینک آف انڈیا لاہور برانچ میں 404 ملازمین تھے ان میں مسلمان 32 تھے، جو کل ملازمین کا 7.9 فیصد بنتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی کل 295 آسامیوں میں سے 85 پر مسلمان تھے محکمہ تعلیم پنجاب کے اہم عہدوں پر 9 غیر مسلم تھے اس کے مقابلہ میں مسلمان صرف ایک تھا۔ محکمہ سول سپلائیز پنجاب کی کل 21 آسامیوں میں سے مسلمان 3 تھے۔ پنجاب اریگیشن ڈیپارٹمنٹ کی کل 109 عہدوں پر مسلمان صرف 30 تھے۔ بورڈ آف اکنامک

انکوائری پنجاب کے ملازمین کی کل تعداد 46 تھی ان میں مسلمان 9 تھے۔ جو اسسٹنٹ اور کلرک کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ حکومت پنجاب میڈیکل برانچ کی کل 150 اسامیوں پر صرف 7 پر مسلمان تعینات تھے۔ بیرون ملک ٹیکنیکل ایجوکیشن کے لئے صوبہ پنجاب سے منتخب طلباء کی کل تعداد 67 تھی۔ اس میں 27 مسلمان بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کیلئے منتخب ہوئے۔

1927ء میں پنجاب حکومت نے تینوں فرقوں کا ملازمتوں میں کوٹہ مختص کیا۔ جس کے تحت مسلمانوں کے لئے 40 فیصد' ہندوؤں کے لئے 40 فیصد اور سکھوں کے لئے 20 فیصد کوٹہ رکھا گیا۔ پنجاب میں سرکاری ملازمتوں میں مختلف فرقوں کے کوٹے کے حوالے سے مولانا محمد علی جوہر نے مختصراً یوں بیان کیا: ''پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین کے بجائے پانچ ملازمتوں کی سرزمین ہے۔ اب جھگڑا اس بات کا ہے کہ پانچ ملازمتوں میں سے تین پر ہندو فائز ہوتے ہیں یا مسلمان'' مختصر یہ کہ مسلمانوں کو نہ تو آبادی کے تناسب سے ملازمتوں میں حصہ ملتا تھا اور نہ ہی کوٹہ کے حساب سے ملازمتیں ملتی تھیں۔ مسلمانوں کو صوبہ کی سرکاری ملازمتوں میں ان کا جائز حق نہیں ملتا تھا۔ وہ روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ تجارت وصنعت پر ہندوؤں اور سکھوں کی اجارہ داری تھی جبکہ دیہاتوں میں مسلمان' ہندو ساہوکاروں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ سیاسی بیداری کا صوبے بھر کے مسلمانوں میں نام ونشان نہیں تھا۔ معاشی طور پر ایک غیر مستحکم اور کمزور معاشرہ ایک نئے ملک کے قیام میں کبھی بھی تاریخی کردار ادا نہیں کرسکتا۔ پنجاب کو اپنی آبادی کے تناسب سے قیام پاکستان سے قبل سرکاری ملازمتوں میں بامشکل 30 فیصد حصہ ملتا تھا اور پنجاب اسمبلی میں مسلمان کو صرف 49 فیصد نمائندگی حاصل تھی مگر قیام پاکستان کے بعد پنجاب کی سماجی زندگی اور سیاسی حیثیت میں واضح تبدیلی آئی۔

مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی معاشی برتری

ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے صرف پاکستان کے لئے ہی

قربانیاں نہیں دی تھیں بلکہ 1857ء میں ہندوستان کے شمالی مغربی صوبے (جسے اس زمانے میں یو پی کہا جاتا تھا) نے جنگ آزادی کی لڑائی لڑی اس لئے یہاں کے بسنے والے برطانوی حکمرانوں کے قہر وغضب کا نشانہ بنے۔ برطانوی راج کے دوران یو پی کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نفرت، جبر اور اذیت کا نشانہ بنایا گیا۔ ان شدید مظالم کے نتیجے میں مسلمان طبقے کو ایک دل شکستہ قوم بن جانا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس بغاوت کے صرف 20 سال بعد ہی یو پی کے مسلمان ایک بار پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے انھوں نے اپنے خلاف ہونے والی مختلف النوع لڑائیوں پر سبقت حاصل کر لی۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1886ء میں یو پی کی صوبائی حکومت میں 54127 ہندو کام کر رہے تھے اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد 18825 تھی اس طرح مسلمان صوبائی حکومت میں 35 فیصد تھے۔ مسلمان ہندوستان کے اعلیٰ عہدوں میں بھی خاصی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مثلاً

عہدے	مسلمان	ہندو
ڈپٹی کلکٹر	51	90
تحصیل دار	122	101
ماتحت جج	15	20
منصف	47	51

یہ پوزیشن اس طبقے کے لئے خاصی مناسب تھی جو اس زمانے میں کل آبادی میں صرف 14 فیصد تھے۔ تجارتی طبقہ میں مسلمانوں کا حصہ 22 فیصد تھا۔ تعلیم کے شعبے میں بھی مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں تھے۔ تعلیمی میدان میں ان کی کارکردگی بہت نمایاں تھی۔ 1880ء میں یو پی کے کل اینگلو ورینکلر اسکولوں میں 32619 (16 فیصد) مسلمان طلباء زیر تعلیم تھے جبکہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بھی مسلمانوں نے خاصی کامیابیاں حاصل کیں تھیں۔ آبادی کے تناسب سے مسلمانوں نے نمایاں کارنامے سرانجام دیئے اور ہمیشہ ہندوؤں سے پیش پیش

رہے۔سرکاری کالجوں میں مسلمان طلباء کا تناسب 1860ء میں 8.4 فیصد تھا جو 1880ء میں بڑھ کر 12.6 فیصد ہوگیا۔ 1900ء میں 16.2 فیصد اور 1920ء میں 18.11 فیصد تک پہنچ گیا تھا۔ یہ سرسید احمد خان ہی کا کارنامہ تھا کہ جنھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔ جس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1886ء میں برطانوی ہند میں کل 1184 مسلمان گریجویٹوں میں 630 گریجویٹ یوپی سے تعلق رکھتے تھے۔

ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشی اور اقتصادی طور پر بھی کافی مضبوط تھے بعض انڈسٹریز پر تو صرف مسلمانوں کی اجارہ داری تھی مسلمانوں کا شمار خوشحال طبقہ میں ہوتا تھا، ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو معاشرتی طور پر برتری حاصل تھی، 1931ء کی مردم شماری کے مطابق یوپی کے 50 بڑے شہروں میں کم از کم 35 شہروں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ آبادی کی اکثریت ملازمتوں سے گریز کرتے ہوئے گھریلو صنعت میں مصروف تھی، یوپی کی تقریباً تمام کاٹیج انڈسٹری مسلمانوں کے پاس تھی، مثلاً بنارس کی ساڑھی، علی گڑھ کے تالے، رامپور کے چاقو، مرادآباد کے برتن، میرٹھ کی قینچی اور سروتے، کانپور میں ٹین کی پٹیاں اور چمڑے کی صنعت پر بھی مسلمانوں کی اجارہ داری تھی، اس کے علاوہ مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ سرکاری ملازمتوں سے وابستہ تھا صرف یوپی ہی نہیں سی پی کا مسلمان بھی ہر طرح سے آسودہ اور خوشحال تھا، جبل پور کی گن گیرج فیکٹری میں تقریباً تمام ماہرین مسلمان تھے، سی پی میں بیڑی سازی کی صنعت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی جو خوشحالی کا بڑا وسیلہ تھی، بھوپال مسلم ریاست اور حیدرآباد دکن میں بھی مسلمان معاشی اور اقتصادی طور پر خوشحال تھے، بمبئی، گجرات، مدراس، میسور غرض کہ جنوبی ہند کا مسلمان خوشحال اور تعلیم یافتہ طبقہ سمجھا جاتا تھا یہی حال بہار کا تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں مہاجروں پر یہ الزام سراسر غلط ثابت ہوتا ہے کہ مہاجر ملازمتوں کی تلاش اور معاشی حالت بہتر بنانے کی خواہش میں پاکستان آئے تھے، مہاجروں نے اپنے آئیڈیل کی خاطر پاکستان کی حمایت کی اور اسے ایک مثالی ملک بنانے کی خواہش میں اپنی خوشحالی

کو خود پامال کرتے ہوئے پاکستان چلے آئے، مہاجر غیر منقسم ہندوستان کے مختلف صوبوں سے نقل مکانی کر کے آنے والوں کا ایک اجتماعی نام ہے اگر یہ لوگ یورپ میں ہوتے تو محض ''جان کا تحفظ'' یا عقیدے کی حفاظت کیلئے نقل مکانی کرنے والے کہلاتے لیکن پاکستان آنے والے یہ لوگ ''مہاجر'' کہلاتے ہیں اسلام کے حوالے سے یہ لوگ اپنے ہی بنائے ہوئے ملک میں آئے ہیں، اس لئے نقل مکانی کرنے والے دیگر گروہوں سے مختلف ہیں یہ پناہ لینے والے لوگ نہیں یہ وہ تعمیری کارکن ہیں جو اپنے بنائے ہوئے ملک کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ متحدہ ہندوستان کے اقلیتی صوبوں میں رہنے والے مسلمان، معاشی، اقتصادی، سماجی اور تعلیمی میدان میں خوشحال اور بہت بہتر حالت میں تھے، اس کے برعکس قیام پاکستان سے قبل پنجاب کے غریب اور متوسط طبقہ کے مسلمانوں کی معاشی، اقتصادی اور تعلیمی حالت بہت پست تھی۔ پنجاب کے عام مسلمان طبقہ کی سیاسی پسماندگی کتنی زیادہ تھی اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب دسمبر 1912ء میں چونیاں میونسپلٹی کے 8 غیر سرکاری ارکان کا انتخاب ہوا تو ان میں صرف ایک مسلمان کامیاب ہوا۔ باقی ساتوں ہندو تھے حالانکہ اس قصبہ کی 50 فیصد سے زائد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی جبکہ چار سرکاری ارکان بھی ہندو تھے۔ پنجاب کونسل کی تشکیل ہوئی جو 9 سرکاری اور 15 غیر سرکاری ارکان پر مشتمل تھی۔ غیر سرکاری ارکان میں 5 ہندو' 5 مسلمان' 3 سکھ اور 2 انگریز تھے۔ اس طرح غیر سرکاری اکثریت کا نصف سے زیادہ حصہ ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھا جن کی مجموعی آبادی 43 فیصد سے زیادہ نہیں تھی۔ مسلمانوں کی آبادی 55 فیصد تھی لیکن انہیں غیر سرکاری عنصر کا ایک تہائی یعنی 15 سے 5 ممبران کا حصہ ملا تھا۔

مسلمانوں کی مسلم اقلیتی صوبوں میں سیاسی برتری

1946ء کے الیکشن میں کل 495 مسلمان ارکان اسمبلی کامیاب ہوئے اور اسی انتخابی نتائج کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا۔ ان انتخابات میں پنجاب' سندھ اور سرحد سے مسلمانوں

کے کل 159 امیدوار کامیاب رہے، جبکہ ہندوستان بشمول بنگال سے کل 336 مسلمان کامیاب ہوئے۔

صوبہ	مسلم نشستیں	کامیاب مسلم لیگی امیدوار
پنجاب	86	73
بنگال	119	113
آسام	34	31
سندھ	34	27
یوپی	66	54
سرحد	36	17
بمبئی	30	30
مدراس	29	29
سی پی	14	13
اڑیسہ	4	4
بہار	40	34

متحدہ ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بھی صورتحال کچھ مختلف نہ تھی متحدہ ہندوستان کو تین سیکشن میں تقسیم کیا گیا تھا۔ سیکشن (اے) میں مدراس، بمبئی، بہار اور سی پی شامل تھے یہاں سے کل 20 مسلمان کامیاب ہوئے سیکشن (بی) میں پنجاب، سرحد اور سندھ شامل تھے یہاں سے 22 مسلمان کامیاب ہوئے، جبکہ سیکشن (سی) میں بنگال اور آسام شامل تھے یہاں سے 36 مسلمان کامیاب ہو کر مرکزی قانون ساز اسمبلی پہنچے، یوں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں کل 78 مسلم ارکان میں سے پاکستان کے موجودہ جغرافیہ سے 22 ارکان جبکہ ہندوستان کے باقی صوبوں سے کل 56 مسلمان ارکان کامیاب ہوئے تھے۔

1946ء کے انتخابات میں پنجاب' سندھ اور سرحد سے صرف 159 مسلمان ارکان صوبائی اسمبلی کامیاب ہوئے، جبکہ ہندوستان کے وہ علاقے جو پاکستان کا حصہ نہیں ہیں وہاں سے 336 مسلمان ارکان صوبائی اسمبلی کامیاب رہے۔ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان معاشی اور اقتصادی طور پر زیادہ خوشحال بلکہ سیاسی طور پر زیادہ باشعور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک آزادی کی جدوجہد کا مرکز مسلم اقلیتی صوبے ہی تھے۔

☆☆☆☆☆

بانیان پاکستان کی
لازوال قربانیاں اور گراں قدر خدمات

پاکستان مسلمانان برصغیر کے خوابوں کی تعبیر ہے جو خواب مجدد الف ثانی، ٹیپو سلطان، شاہ ولی اللہ، سرسید احمد خان، سید احمد بریلوی، جمال الدین افغانی، حسرت موہانی، محمد علی جوہر اور متعدد سربرآوردہ اکابرین صدیوں سے دیکھ رہے تھے۔ مسلمانوں کے علیحدہ وجود، ان کے قومی وقار اور علیحدہ مملکت کی ضرورت کے متعدد اسباب تھے۔ مسلمان ہندوستان میں ایک ہزار سال سے زیادہ قیام پذیر رہنے کے باوجود دوسرے مذاہب کی پیروؤں کی طرح ہندومت میں خلط ملط نہیں ہو سکے تھے ان کا الگ اور علیحدہ وجود اور سیاسی، ثقافتی، سماجی اور معاشی زندگی میں ان کا منفرد اور نمایاں اعزاز، انقلاب زمانہ کے باوجود بدستور موجود اور متعین تھا۔ تہذیب و ثقافت اور فکر و نظر کے درمیان یہ کشاکش متحدہ ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں میں زیادہ موجود تھا۔

1857ء کی ناکام جدوجہد آزادی کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہوگئی تھی مگر اس سے قبل اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے بغاوت کو منظم کرنے اور اس کو قومی بنیادوں پر حرکت دینے میں ہی نہیں، بلکہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے اور میدان جنگ میں جوہر دیکھانے میں بھی پہلی صف میں نظر آئے۔ احیائے اسلام کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت حافظ ضامن شہید، حضرت شاہ حسن عسکری شہید، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا داہاج الدین، مفتی عنایت احمد کاکوردی، مولوی رضی

اللہ بدایونی، شاہ غلام بولن سیوہاروی ،مولوی کفایت علی کافی، مولانا یحییٰ علی،مولانا عنایت علی،مولانا فیض بدایونی، مولانا سید عالم علی،مولانا علاؤالدین،مولانا جلیل،مولانا واعظ الحق اور سید محمد امین غازی جیسے ہزاروں مجاہدین نے جنگ آزادی میں جانی و مالی بیش بہا قربانیاں پیش کیں۔تمام مفکرین نے یہی کوشش کی کہ وہ اسلام اور کفر کے فرق کو نمایاں کریں۔شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر وہ ہندوستان میں باعزت اور کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کفر اور اسلام کے مابین مفاہمت سے گریز کرنا ہوگا اور بحیثیت مسلمان اپنے وجود کو علیحدہ رکھنا ہوگا۔آگے چل کر شاہ ولی اللہ کی تحریک کے سرگرم کارکن مولانا محمد قاسم نانوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے دیوبند تحریک کا آغاز کیا۔دوسری طرف سر سید احمد خان اور ان کے احباب نے مدرستہ العلوم علی گڑھ کے قیام کے ذریعے مسلمانوں میں جدید علوم کے حصول کا جذبہ پیدا کیا۔ان دونوں تحاریک کی بنیادی کوشش یہی تھی کہ مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان اپنا علیحدہ وجود قائم رکھنا ہے۔دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی کے ذریعہ مسلمانوں کو باصلاحیت اور قابل فخر لیڈر اور کارکن مہیا ہوئے۔جن میں مولانا محمود الحسن،مولانا اشرف علی تھانوی،مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسرت موہانی،مولانا محمد علی جوہر اور مولانا محمد شوکت علی،نواب محسن الملک،نواب وقار الملک وغیرہ شامل تھے۔1857ء کی آگ دب گئی تھی لیکن اس کی چنگاریاں خاموش نہیں ہوئیں تھیں۔دراصل پاکستان اُسی وقت کے بوئے ہوئے بیج کا درخت ہے جو 1947ء کو پھل لایا۔

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو منظم کرنے کے لئے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا پہلا اجلاس 1886ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا اس ادارے نے پورے ہندوستان میں سالانہ اجلاس منعقد کر کے مسلمانوں میں اجتماعی شعور بیدار کیا ان جلسوں کی صدارت ہر علاقے اور ہر طبقے کے مشاہیر نے کی۔یوپی اور دلی سے مولوی سمیع خان،نواب اسحاق خان،منشی امتیاز احمد کاکوروی،نواب محسن الملک،مولوی حشمت اللہ بریلوی،سر علی محمد خان،

راجہ آف محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، سر شاہ سلیمان، سر داس مسعود، سر سید رضی علی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور نوابزادہ لیاقت علی خان تھے۔ بنگال سے جسٹس سید امیر علی، جسٹس شریف الدین، نوابزادہ سر سلیم اللہ، سر عبدالرحیم، مولوی اے کے فضل الحق اور سر عزیز الحق۔ بمبئی سے سر آغا خان، جسٹس بدرالدین، طیب جی، علامہ عبداللہ، یوسف علی، محمد ابراہیم، رحمت اللہ، سر ابراہیم ہارون اور ہارون جعفر۔ مدراس سے نواب سید عبدالحکیم، حیدرآباد دکن سے نواب عمادالملک، سر اکبر حیدری، نواب کمال یار جنگ اور نواب ظہیر یار جنگ جیسے اکابرین نے ان جلسوں کی صدارت کی۔ ان تمام اکابرین کے پیش نظر ملک گیر متحدہ مسلم قومیت کا تصور تھا۔

سر سید احمد کہا کرتے تھے کہ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے کبھی نہیں رہ سکتے اور ملک کی ترقی کے لئے مشترکہ طور پر کوئی کام نہیں کر سکتے نفرت اور دشمنی بڑھ رہی ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ اس کے نتائج دیکھ لے گا۔ 20 سال کے اندر اندر سر سید احمد خان کا یہ یقین اور بھی پختہ ہوگیا تھا وہ ہندوستان کو ملک نہیں بلکہ براعظم قرار دیتے تھے۔ انہوں نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اس براعظم میں دو قومیں آباد ہیں اور دونوں کا مساوی حیثیت سے ایک ہی خطے میں رہنا ناممکن ہے۔ سر سید احمد خان نے جو تحریک شروع کی تھی اسے مولانا حالی، مولانا عبدالحلیم شرر، سید امیر علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب سلیم اللہ، مولانا شبلی نعمانی، آغا خان، محمد علی جوہر اور حسرت موہانی نے آگے بڑھایا۔

عبدالحلیم شرر نے بھی صحافتی اور ادبی میدان میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت پر انگریزی افکار اور عیسائیت کی یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انہوں نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''تہذیب'' میں ہندو مسلم فسادات پر ایک اداریہ لکھا جس کی ہر سطر محل نظر ہے۔ ''ہمارے خیال میں اگر ایسا وقت آ گیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین کے بغیر پوری نہیں ہوتیں تو ہندوستان کے اضلاع کو آپس میں تقسیم کرلیں اور اپنی اپنی آبادی علیحدہ کرلیں۔'' مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ''کامریڈ'' میں جو ادارتی مقالے سپرد قلم کئے ان میں انہوں نے بار بار

کہا کہ اس نعرے میں ہمارا کوئی اعتقاد نہیں کہ ہندوستان متحد ہے۔ آپ نے لکھا کہ ''ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کر دینا چاہئے۔ شمالی ہند مسلمانوں کے حصے میں آئے گا اور جنوبی ہندوستان ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے'' (10 مئی 1913ء)

تحریک پاکستان کے سلسلہ میں ایک اہم کردار جامع عثمانیہ حیدر آباد کے پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدر آبادی کا ہے جنہوں نے اپنی تاریخی کتاب ''ہندوستان کا تہذیبی مستقبل'' میں جو مارچ 1938ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ہندو مسلم اختلافات کے اصل اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کے قیام کا مشورہ دیا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی مسلم لیگ کے قائدین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور 29 جنوری 1939ء کو لاہور کے ایک جلسہ میں پاکستان کے قیام کے سلسلہ میں جن اسکیموں پر غور کیا گیا ان میں پروفیسر لطیف کی اسکیم کو خاص اہمیت دی۔

ان تمام باتوں کو تحریر کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ متحدہ ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبے شروع ہی سے علیحدہ وطن کے حامی تھے۔ مسلم اقلیتی صوبوں کے قائدین نے ہی مسلمانان ہند کے لئے ایک علیحدہ وطن کی تحریک شروع کی تھی۔ ان رہنماؤں کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں 23 مارچ 1940ء کو جو قرارداد منظور ہوئی اس قرارداد کو اس منزل تک لانے اور اس قرارداد کو منظور کرنے کا سہرا بھی مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان قائدین کے سر جاتا ہے۔ بنگال سمیت دیگر صوبوں کے قائدین نے بھی تحریک پاکستان کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ قرارداد پاکستان جن مسلم قائدین نے متفقہ طور پر منظور کی ان میں بھی ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنماؤں کی واضح اکثریت تھی۔ 23 مارچ 1940ء کو مولانا ابوالقاسم فضل الحق کی تحریک اور چوہدری خلیق الزماں کی تائید اور مولانا ظفر علی خان ایم ایل اے (سینٹرل)، خان بہادر نواب اسمٰعیل خان ایم ایل اے (بہار)، قاضی محمد عیسیٰ (صدر بلوچستان صوبائی مسلم لیگ)، عبدالحمید ایم ایل اے (مدراس)، آئی آئی چندریگر ایم ایل اے (بمبئی)، سید عبدالرؤف شاہ ایم ایل اے

(سی پی)، سید ذاکر علی (یو پی)، بیگم صاحبہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالحامد قادری (یو پی) کی حمایت سے قرارداد پاکستان متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ یہ قرارداد ہی تکمیل پاکستان کی بنیاد تھی۔ اس قرارداد میں ایک مملکت کے تصور کو پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ مملکت کی جگہ مملکتوں کا لفظ تھا اس قرارداد میں کہا گیا تھا

''جغرافیائی حیثیت سے متصل اراضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کر کے ان کو جداگانہ علاقوں میں منقسم کیا جائے، لیکن جیسا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے ان رقبہ جات میں جہاں بہ لحاظ تعداد مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً شمالی، مغربی اور ہندوستان کے مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اس طرح متحد کرنا چاہئے کہ ان میں سے ہر وحدت خود مختار ہو۔ ان آزاد اور خود مختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق کی حفاظت کے لئے ان ہی کی اکثریت سے معین اور موثر تحفظات فراہم کرنے چاہئیں''۔

(حوالہ۔ سید الاحرار۔ سید اشتیاق اظہر)

15 اگست 1941ء کو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں قرارداد لاہور کو مسلم لیگ کے آئین میں شامل کر لیا گیا اور اس قرارداد کو مسلم لیگ کا نصب العین قرار دیا گیا۔ یہاں بھی مملکت کی جگہ مملکتوں کا لفظ تھا۔ یہ تاریخی ترمیم بھی مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان رہنماؤں کے ہاتھوں منظور ہوئی۔ اس تاریخی ترمیم کو نواب لیاقت علی خان ایم ایل اے (سینٹرل) نے پیش کیا اور حاجی سیٹھ عبدالستار اسحاق ایل ایم اے (سینٹرل) نے اس کی تائید کی۔ بی داؤد شاہ (مدراس)، قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان)، نواب سر محمد یوسف ایم ایل اے (مدراس)، سر عبداللہ ہارون ایم ایل اے (سینٹرل)، محمد عثمان (بنگال) اور مولانا عبدالوہاب بخاری (مدراس) نے اس کی حمایت کی۔

1947ء کو دنیا کے نقشہ پر نمودار ہونے والا پاکستان چند سالوں کی جدوجہد یا چند

انسانوں کی قربانیوں کا نتیجہ نہیں تھا۔ دوقومی نظریہ کی پُو پھٹنے سے لے کر تشکیل پاکستان کی صبر آزماء طویل جدوجہد میں مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے جنگ آزادی اور تحریک پاکستان کی جدوجہد اور تقسیم ہند کے وقت جس ظلم اور ستم، درندگی اور بربریت، جبر اور تشدد کا جوانمردی سے مقابلہ کیا اس کی تاریخ میں مثال ملنا مشکل ہے۔ تحریک آزادی کی جدوجہد میں لکھنؤ، بمبئی، جے پور، علی گڑھ، الہ آباد، رامپور، آگرہ، حیدرآباد دکن، بنارس، احمد آباد، بھوپال، میسور، بنگلور، مراد آباد، اجمیر، بلند شہر، جمشید پور، شاہ جہاں پور سمیت دیگر مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو آگ اور خون کے سمندر سے گزرنا پڑا، یہاں کے مسلمانوں پر نئے نئے ظلم ڈھائے گئے، درندگی اور حیوانیت کی انتہا کر دی گئی، ان کو دہکتی ہوئی سلاخوں سے مارا گیا، برہنہ کر کے تمام جسم سلاخوں سے داغا گیا، سنگینوں سے چھید کر ہلکی آگ میں بھونا گیا، سینکڑوں بے گناہوں کو گرفتار کر کے بغیر تحقیق و تفتیش کے پھانسی کا حکم ہوتا اور قطار میں کھڑا کر کے باری باری پھانسی دی جاتی تھی۔ ان میں بے شمار عورتیں، بچے، بوڑھے اور معذور لوگ شامل ہوتے تھے۔ پھانسی کے بعد بھی ان کی لاشیں کئی روز تک سرعام لٹکی رہتی تھیں جو شخص اس طرف دیکھتا تھا وہ بے اختیار رونے لگتا تھا۔ پھانسیوں کا نظارہ دیکھنے اور بے گناہوں کی تکالیف سے لطف اندوز ہونے کے لئے انگریز مرد اور عورتیں کرسیاں بچھا کر پھانسی کے نظارے دیکھتے تھے۔ جن لوگوں کو پھانسی دی جاتی یا جنہیں گولی ماری جاتی انہیں دفنانے کی بجائے میدانوں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ان مردوں کی لاشوں کو کتے کھاتے اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع ہوتے، جو ان کے گوشت کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہوتے تھے۔

جو بدقسمت زندہ بچ جاتے تھے ان کو مع اسباب کے اس طرح گرفتار کیا گیا کہ گھر کا تمام سامان مردوں کے سروں پر اور عورتیں اور بچے روتے پیٹتے ان کے پیچھے، بے پردگی کی حالت میں بے چاریاں ٹھوکریں کھا کھا کر گرتی تھیں، بچے گود سے گرے جاتے تھے اور سپاہی ناقابل بیان سختی سے ان کو آگے چلنے کے لئے دھکے دیتے تھے۔ اس حالت میں ان کو فوجی گورنر کے سامنے

پیش کیا جاتا۔سینکڑوں بچے بھوک اور پیاس سے مر گئے اور کتنے ہی بے کسوں نے ان مصیبتوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ ہزاروں عورتوں نے کنوؤں میں ڈوب کر جان دی اور بے شمار کنوئیں ان زندہ اور مردہ لاشوں سے اٹ گئے ۔ایک اندھی جوان لڑکی پر جب گوروں نے حملہ کیا تو وہ اپنے گھر کے کنوئیں میں کود پڑی ساتھ ہی اس کی ماں نے بھی چھلانگ لگا دی جس کے جوان بیٹے کو اس کے سامنے کاٹ ڈالا گیا تھا۔زندہ مسلمانوں کو سور کی کھالوں میں سیا جاتا' پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی چڑھائی جاتی اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ بلندشہر میں مسلمانوں کو گرفتار کر کے ان کے گلوں میں مرے ہوئے کتے باندھے گئے اور پھر پھانسی دے دی گئی ۔امروہہ میں حریت پسندوں کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیئے گئے۔ان کے مکانات مسمار اور جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔مرادآباد میں سینکڑوں حریت پسندوں کو طرح طرح سے اذیت دے کر ہلاک کیا گیا۔کئی بے گناہ مسلمانوں کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر گھسیٹا گیا اور پکتے ہوئے چولے میں ڈال دیا گیا ہزاروں مسلمانوں کو کالا پانی کی سزا دی گئی بریلی میں جب انگریز فوجیں داخل ہوئیں تو جوان کے ہاتھ آیا اسے موت کے گھاٹ اتار گیا مکانات کو آگ لگا دی گئی۔ شاہجہاں پور میں بھی اس ہی طرح کی مصیبتیں ٹوٹیں' کانپور میں ہر چیز کو تہس نہس کر دیا گیا۔لکھنؤ میں انسانیت سوز مظالم کی انتہا کر دی گئی تھی جن میں سے چند تاریخی حقائق کو بعض انگریزوں نے خود اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے۔

لکھنؤ پر قبضے کے بعد قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا گیا ہر ہندوستانی کو قطع نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی بے دریغ تہہ تیغ کیا گیا یہاں تک کہ نہ کوئی سوال کیا جاتا نہ کسی قسم کا تکلف روا رکھا جاتا کہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کی کافی دلیل سمجھی جاتی۔ بے گناہ شہریوں کو جو ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کرتے انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو جن کے جسم رعشے سے کانپ رہے تھے کاٹ کر رکھ دیا گیا۔لندن ٹائمنر کا نامہ نگار اپنی ڈائری میں لکھتا ہے"جب محلات میں قتل عام ہو رہا تھا تو ایک چھوٹا بچہ ایک بوڑھے کی رہنمائی کرتا

ہوا افسران کے سامنے آیا اور رو رو کر گڑگڑاتے ہوئے بوڑھے نے درخواست کی کہ اس کو نہ مارا جائے اس عاجزانہ اور رقت انگیز التجا کا جواب دینے کے لئے انگریز افسر نے اپنا پستول اٹھایا اور اس کی کنپٹی کا نشانہ لگا کر فائر کیا، مگر نشانہ چوک گیا اس نے پھر ٹریگر دبایا مگر پستول نے پھر معصوم بچے کو مارنے سے انکار کیا۔ چوتھی بار۔ یہ ''بہادر'' افسر کامیاب ہو گیا اور بچے کا خون اس کے قدموں پر بہہ گیا۔ ایک شخص کو اس کے گھر سے کھینچ کر ریتیلے میدان میں لایا گیا جہاں اس کو لٹا کر اس کے جسم اور چہرے پر سپاہیوں نے سنگینیں بھونکیں، جبکہ کچھ دوسرے سپاہیوں نے ایندھن جمع کر کے آگ جلائی اور اس کو زندہ بھوننا شروع کیا۔ بہت سے انگریز افسر اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے رسل لکھتا ہے۔ اس شیطانی ظلم کی دہشت ناکی اور بربریت اس وقت اور بڑھ گئی جب اس پریشان حال بدنصیب نے آدھا جل چکنے کے بعد اس آگ سے بچ نکلنے کی بے اختیار کوشش کی۔ اس نے اچانک طور پر تڑپ کر چھلانگ لگائی اور چند گز تک اس حالت میں بھاگا اس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا، مگر وہ پکڑ لیا گیا، واپس لایا گیا اور پھر آگ پر رکھ دیا گیا اور وہاں سنگینوں سے اس کو روکا گیا یہاں تک کہ جو کچھ باقی بچا تھا وہ جل گیا۔ ایک اندازے کے مطابق لکھنؤ کی سرزمین سے ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کا خون بہایا گیا۔ شاہی محلات یعنی قیصر باغ وغیرہ کو نہایت بیدردی سے لوٹا گیا۔ الہ آباد میں ایک شخص کو اس کے 25 ساتھیوں سمیت بیدردی سے پھانسی دی گئی۔ اس کے مکان کو مع خاندان کے آگ لگا دی گئی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جو اس ہنگامے میں موجود تھے۔ وہ ان دردناک داستان کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''شہر دہلی کے گرد و نواح کے رئیسوں کو قتل کرنا ان کی جائیدادیں، عمارتیں، مویشی، مال و متاع، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور ہتھیاروں وغیرہ کو لوٹنا شروع کیا۔ اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ ان کے اہل و عیال کو بھی قتل کر ڈالا گیا۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی، سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے پھر چادر، تہہ بند، قمیض، پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے، اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا

دیتے وہ ان کے لئے قتل یا پھانسی کا فیصلہ کرتے جوان، بوڑھے، شریف سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا نہ کوئی عالی خاندان فرد بچ سکا نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔ پھر اطراف واکناف ملک میں لشکر بھیجے جنہوں نے قتل و غارت گری کی انتہا کر دی، بہت سی صبح کی سہاگن عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں۔ اور شب کے آغوش پدر میں سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر اٹھے۔ کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی ہیں اور کتنے ہی مردوں کی آنکھوں سے آنسو کا دریا جاری تھا۔ شہر چٹیل میدان بن گئے غارتگری اور پھانسی کا بازار گرم کر دیا، بے شمار مرد اور پردہ نشین عورتیں موت کے گھاٹ اتار دی گئیں۔''

وطن میں آئے اپنے جلا وطن ہو کر

ریاسی تشدد اور بربریت کے باوجود مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے حوصلے اور جذبے میں ذرا برابر کمی واقع نہیں ہوئی۔ انہوں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لئے علیحدہ اسلامی مملکت کی بھی جدوجہد جاری رکھی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے الگ آزاد وطن اور خودمختار مملکت کے قیام کے لئے جتنی جدوجہد کی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اس مٹی کو لاکھوں حریت پسندوں نے اپنے خون سے سینچا، لاتعداد ماؤں اور بہنوں اور بیٹیوں کی عزت اور سہاگ کی قیمت پر یہ ملک حاصل ہوا۔ قیام پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر ہجرت کے اس موقع پر مسلم اقلیتی صوبوں کے بے بس، مجبور اور نہتے مسلمان مرد، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بڑی بے رحمی اور سنگدلی سے قتل کیا گیا۔ مال و اسباب لوٹ لینے کے علاوہ نوجوان مسلمان لڑکیوں کو اپنے والدین اور رشتہ داروں سے چھین لیا گیا، بلکہ ان کی آتش انتقام اور ظلم و زیادتی کا یہ عالم تھا کہ یہ بے رحم ہندو اور سکھ چھوٹے چھوٹے مسلمان بچوں کو قتل کرتے اور ان کی نعشوں کو نیزوں پر ٹانگ کر ہوا میں لہراتے اور کہتے ''یہ تمہارے پاکستان کا جھنڈا ہے''۔

ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان جن میں بیشتر خاندان قبل صاحب ثروت تھے، آسودہ حال تھے ان کے پاس جاگیریں، باغات اور بڑے بڑے مکانات تھے، مگر انہوں نے اپنی جاگیریں، جائیدادیں، یادگاریں، مکانات، بزرگوں کے مزارات اور اپنا سب کچھ پاکستان کے لئے چھوڑ دیا اور ہجرت کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے لاکھوں افراد تو ہجرت کے دوران ہی بیدردی سے شہید کردیئے گئے، ٹرینوں کی ٹرینیں مہاجروں کے خون سے نہلادی گئیں۔ قافلوں کے قافلے مٹادیئے گئے۔ ہجرت کر کے آنے والی ہزاروں معصوم بیبیوں کی عصمتیں لوٹ لی گئیں۔ ہزاروں معصوم بیبیوں نے اپنی عصمتوں کو بچانے کے لئے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر جانیں دیدیں۔ مہاجروں کے جو لٹے پٹے اور خون میں نہائے ہوئے قافلے پاکستان پہنچے وہ اپنی آبادکاری کے انتظار میں مہینوں تک مختلف مہاجر کیمپوں، سڑکوں اور میدانوں میں کھلے آسمان تلے پڑے رہے جن میں سے ہزاروں مہاجر رہائشی سہولت میسر نہ ہونے کے باعث مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوگئے۔ صرف لاہور کے والٹن مہاجر کیمپ میں جہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے لاکھوں مہاجروں نے پناہ لی تھی 19 ہزار مہاجر بیماری، پریشانی، اور خستہ حالی کے سبب کیمپ میں پہنچنے کے بعد انتقال کر گئے۔ جو ہجرت سے قبل ہندوستان میں جائیدادوں اور جاگیروں کے مالک تھے۔ عالیشان حویلیوں میں رہتے تھے وہ ہجرت کے بعد پاکستان میں مہینوں تک سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈتے رہے۔ ہجرت کر کے آنے والے خانماں بربادوں پر کیا گزری اس کا اندازہ صرف اس ایک واقع سے لگایا جاسکتا ہے کہ" 29 جون 1948ء کو لاہور کے ایک مقامی مجسٹریٹ چوہدری قادر بخش کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ اس مقدمہ میں والٹن مہاجر کیمپ میں مقیم مہاجر میاں بیوی پر ایک بوسیدہ خیمے کا کچھ کپڑا چوری کرنے کا الزام لگایا گیا تھا جب اس مہاجر جوڑے کو عدالت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے عدالت کو بتایا کہ ہمارے جسموں پر کپڑے پرانے ہوکر اس طرح پھٹ چکے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی عریانی دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے محض اپنا ستر

چھپانے کے لئے ایک خیمے کا کچھ کپڑا کاٹ لیا تھا''۔

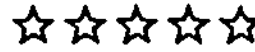
رئیس راندہ درگاہ وانجمن ہو کر
شکستہ پاؤ زبوحال خستہ تن ہوکر
الٰہی صدمہ ہجرت ہمیں گوارہ ہو
وطن میں آئے ہیں اپنے جلاوطن ہوکر

ایک آگ وخون کا دریا تھا جسے پار کر کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے اس سرزمین پر ہجرت کی جوان کے خوابوں کی تعبیر تھی، جس خواب کی تعبیر میں ان کے آباؤ اجداد کا خون شامل تھا۔ بانیان پاکستان اور مجاہدین وطن ہجرت کے تمام دکھ، غم، پریشانیاں بھلا کر ایک بار پھر پاکستان کی تعمیر وترقی میں سرگرم ہو گئے، مگر انہیں بار بار یہ احساس دلایا گیا کہ یہ تمہارا وطن نہیں، تم فرزندز مین نہیں۔تم اس سرزمین پر بن بلائے مہمان ہو۔مہاجروں سے سرکاری افسر یہ پوچھتے تھے کہ''اے مہاجرو! تمہیں پاکستان کس نے بلایا ہے!''ان سوالوں کے جواب میں رئیس امروہوی کو یہ کہنا پڑا۔

اگرچہ بسمل و مجروح دل فگار ہیں ہم
خدا گواہ کہ اس قوم کا وقار ہیں ہم
عروس قوم و وطن کو پناہ دی ہم نے
پناہ گیر نہیں ہیں پناہ گار ہیں ہم

مہاجروں کو قدم قدم پر اجنبیت کا احساس دلایا گیا۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر مہاجروں کو اس بات کا دکھ تھا کہ جس دوقومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا اس نظریہ کو فراموش کرتے ہوئے مسلم اقلیتی صوبوں سے پاکستان آنے والے مسلمانوں پر پابندی لگادی گئی۔ پاکستان بنانے والوں پر ہی اپنے وطن آنے پر پابندی لگا کر دوقومی نظریہ سے کھلم کھلا انحراف کیا گیا۔ مہاجر قائدین کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ نوزائیدہ مملکت کے صوبوں کے درمیان

پاکستانی قومیت کا جذبہ ہے اور نہ ہی مسلم قومیت کا تصور دلوں میں موجود ہے۔ ایک جانب مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان دوریاں اور فاصلے موجود تھے تو دوسری طرف مغربی پاکستان میں صوبوں کے درمیان عصبیت اور لسانیت کا جذبہ فروغ پا رہا تھا۔ اور تیسری جانب جاگیردار اور وڈیرے نوزائیدہ مملکت میں فیوڈل سسٹم کی جڑوں کا مضبوط اور مستحکم کرنے میں مصروف تھے۔



تحریک پاکستان میں سندھ کا حصہ

سندھ کے حریت پسند مسلمانوں نے برصغیر میں چلنے والی ہر تحریک میں دل و جان سے حصہ لیا۔خواہ وہ جنگ آزادی ہو، ریشمی رومال تحریک ہو، خلافت تحریک ہو یا تحریک پاکستان کی جدوجہد، ان تمام ہی تحاریک میں سندھ کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو یہاں کے غیور مسلمانوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے تن من دھن کی بازی لگا دی اور اپنے دیرینہ خوابوں کی تعبیر ''پاکستان'' کے حصول کیلئے ایک ایسا مثالی کردار ادا کیا کہ جسے تاریخ کے صفحات میں جلی حروف سے لکھا گیا۔سندھ کے مسلمانوں نے جنگ آزادی سے لیکر تکمیل پاکستان تک جو مثالی تاریخ رقم کی ہے اسے محقق اور تاریخ نویس کئی ہزار تصانیف میں محفوظ کر چکے ہیں اگر یہاں سندھ کی رہنماؤں کی خدمات کا مختصراً بھی ذکر کروں تو کئی سو صفحات بھی کم پڑ جائیں گے۔مگر یہاں صرف چند واقعات کو تحریر میں لا رہا ہوں جن کا اس کتاب کے پس منظر میں ذکر ضروری تھا۔

کراچی برطانوی دور کی ابتداء ہی سے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور صحافتی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔سندھ میں سب سے پہلے سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کراچی ہی سے ہوا۔سندھ کی تاریخ کا سب سے پہلا اخبار کراچی سے جاری ہوا۔اس شہر سے جاری ہونے والے مسلم اخبارات نے سندھ کے مسلمانوں میں نہ صرف آزادی کا غیر متزلزل جذبہ پیدا کیا بلکہ انہیں ہر میدان میں ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دی۔سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ بننے سے لے کر قیام پاکستان تک

کراچی کے اخبار ''الوحید'' کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

مسلم لیگ کی سب سے پہلی شاخ کراچی میں غلام محمد بھرگڑی کی کوششوں سے یکم نومبر 1917ء کو قائم ہوئی۔ حاجی عبداللہ ہارون نے مسلم لیگ کو پروان چڑھانے میں دامے، درمے، سخنے حصہ لیا۔ تحریک پاکستان میں اہل کراچی کا جوش وخروش قابل دید تھا۔ مسلم لیگ کی ہائی کمان نے بھی اہالیان کراچی کے اس جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے کراچی کو خصوصی اہمیت دی مسلم لیگ کے کئی اہم اجلاس اسی شہر میں منعقد ہوئے۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کی تاریخی کانفرنس اسی شہر میں 8 اکتوبر تا 12 اکتوبر 1938ء زیر صدارت قائداعظم محمد علی جناح منعقد ہوئی تھی۔ کراچی میں منعقد ہونے والی اس تاریخ ساز کانفرنس میں برصغیر میں پہلی مرتبہ مسلم اکثریت والے صوبوں کا ایک وفاق بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ یہ تجویز شیخ عبدالمجید سندھی نے پیش کی اور سر عبداللہ ہارون نے اس کی تائید کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا

''سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس وسیع وفراغ براعظم ہند میں قیام امن کے مفاد میں بے روک ٹوک ثقافتی، تعمیر وترقی، معاشی اور سماجی بہبود اور دونوں قوموں جو ہندو اور مسلمان کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں، سیاسی حق خود اختیاری کے مفادات کے پیش نظر یہ چیز قطعی طور پر ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان کو دو وفاقوں میں منقسم کر دیا جائے۔ یعنی مسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق۔ چنانچہ یہ کانفرنس کل ہند مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ وہ دستور کی ایسی اسکیم وضع کرے کہ جس کے تحت مسلم اکثریتی صوبے ایک وفاق کی شکل میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔ مزید برآں ہندوستانی سرحدوں کے پار واقع دوسری کسی بھی مسلم ریاست کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اس وفاق میں شامل ہو سکے۔ غیر مسلم اقلیتوں کے لئے ہر قسم کے تحفظات کے ساتھ ساتھ ہند کے غیر مسلم وفاق میں مسلم اقلیتوں کو بھی تحفظات دیئے جا سکتے ہوں۔''

خواجہ رضی حیدر نے روزنامہ جنگ کراچی کے 12 اگست 1987ء کے ایڈیشن میں

لکھا تھا کہ اس کانفرنس میں برصغیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ''پاکستان زندہ باد'' کا پروقار نعرہ بلند کیا گیا تھا۔ گویا کراچی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس سرزمین سے ''پاکستان زندہ باد'' کے دعائیہ نعرے کی ابتداء ہوئی اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ دعا بالآخر پوری ہوکر رہی۔ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں پیش ہونے والی تاریخی قرارداد کراچی میں تقسیم ہند کے بارے میں پیش کی جانے والی قرارداد پر مبنی تھی۔ چنانچہ اہالیان کراچی اس بات پر بھی فخر کر سکتے ہیں کہ قرارداد پاکستان یعنی قیام پاکستان کی تجویز سب سے پہلے ان کے شہر میں پیش کی گئی تھی اور یوں کراچی کو جدوجہد آزادی میں برصغیر کے تمام شہروں پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔

انگریزوں کی غلامی کا طوق اتار پھینکنے اور برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کے سلسلے میں مسلمانان کراچی کے دلوں میں جو بیکراں جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا اس کی ترجمانی کرتے ہوئے شیخ عبدالمجید سندھی نے اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل قرارداد بھی پیش کی تھی:

''اگر کانگریس نے مسلمانوں کے حقوق کے لئے کچھ نہ کیا تو پھر مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہوگا کہ وہ پاکستان کے منصوبے کی جانب قدم اٹھائیں اور پھر کراچی کے مسلمانوں کو کوئی بھی طاقت نہیں روک سکے گی کہ وہ قومی خودمختاری کے حصول کیلئے کراچی سے کلکتہ تک مارچ کریں۔''

قائداعظم کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا اکتیسواں سالانہ اجلاس 24 تا 26 دسمبر 1943ء کو کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر مسلمانان کراچی نے اپنے محبوب قائد کا کراچی آمد پر تاریخی استقبال کیا تھا اور اپنے عظیم قائد کی رہبری میں کراچی کی اہم شاہراہوں سے ایک عدیم المثال جلوس نکالا تھا۔ جی ایم سید سمیت سندھ کے تمام چوٹی کے مسلم لیگی رہنما اس جلوس میں شریک تھے۔ نواب صدیق علی خان اور حاجی عبدالکریم باڈی گارڈ کی حیثیت سے قائداعظم کے ساتھ ساتھ تھے۔ کراچی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس شہر میں صوبائی اسمبلی سندھ نے 3 مارچ 1943ء کو برصغیر کی تمام مسلم اکثریتی صوبوں سے پہلے مطالبہ پاکستان کی حمایت میں ایک قرارداد

پیش کی تھی۔ جس کے محرک جی ایم سید تھے۔

سندھ اسمبلی کی پاکستان کی حمایت میں قرارداد

سندھ اسمبلی کے بجٹ اجلاس میں سینئر مسلم لیگی لیڈر جی ایم سید نے مطالبہ پاکستان کی حمایت میں مندرجہ ذیل قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا۔

''میں ایوان کے سامنے یہ قرارداد پیش کرنے کیلئے آیا ہوں کہ یہ اسمبلی سندھ سرکار کی طرف سے وائسرائے ہند کی معرفت بادشاہ سلامت کو مسلمانان سندھ کے جذبات اور امنگوں سے واقف کرا دینا چاہتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان مذہب، فلسفہ، حیات، معاشرتی رسموں اور اقتصادی عقیدوں کی وجہ سے ہندوؤں سے مختلف ہیں اور اس کا سبب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک جداگانہ قوم کی حیثیت میں ہندوستان کے خطوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے، خودمختار قومی حکومت کے قائم کرنے کے حقدار ہیں۔ ان کے مستقبل میں آزادانہ زندگی گزارنے اور ان کے نظریہ حیات کے مطابق ترقی کرنے کے لئے ایسی کوششیں ان کے لئے ہرگز قابل قبول نہ ہوں گی جن کے ذریعے انہیں زبردستی ایک مرکزی حکومت کے تحت رکھا جائے گا۔''

سندھ اسمبلی میں پیش کردہ تاریخی قرارداد بھاری اکثریت منظور کر لی گئی اور آگے چل کر یہی قرارداد قیام پاکستان کی بنیاد بنی۔ اس قرارداد کو سندھ اسمبلی میں پیش کرنے کا پس منظر یہ تھا کہ برطانوی حکومت نے قائداعظم کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ ہندوستان کے کسی بھی مسلم اکثریت والے صوبے کی اسمبلی سے پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کروالیں تو پاکستان کا مطالبہ منظور کرایا جائے گا۔ چنانچہ انگریز حکومت کے اس چیلنج کے جواب میں قائداعظم کی ہدایت پر بھرچونڈی شریف (سندھ) کے روحانی پیشوا پیر عبدالرحمن نے سندھ اسمبلی کے مسلم اراکین کو پاکستان کی تائید میں قرارداد پیش کرنے اور اس کی حمایت کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

سندھ اسمبلی کے اجلاس میں جب یہ قرارداد پیش ہوئی تو اس وقت اسمبلی میں کل 27 ارکان موجود تھے، جن میں سے 24 اراکین نے اس قرارداد کی حمایت میں اور 3 ہندو اراکین نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیئے تھے۔ اس تاریخ ساز قرارداد کے منظور ہونے پر مرکزی مسلم لیگ کونسل نے صوبہ سندھ کے اس اقدام کی بے حد تعریف کی اور دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں سے سفارش کی کہ وہ بھی ایسی ہی قراردادیں اپنی اسمبلیوں میں منظور کرائیں۔ مگر 1946ء تک مسلم اکثریتی صوبے کی اسمبلیوں نے پاکستان کے حق میں کوئی قرارداد منظور نہیں کی۔ سندھ اسمبلی کا پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کرنا ہی پاکستان کے قیام کی بنیاد بنا اور پھر 14 اگست 1947ء کو مسلمانان برصغیر نے اپنی آنکھوں سے دنیا کے نقشے پر پاکستان کو ابھرتے ہوئے دیکھا جو ان کے صدیوں پرانے خواب کی تعبیر تھا اور پھر کراچی کے مسلمانوں کی خوشی کی تو انتہاء نہ تھی کیونکہ اس نوزائیدہ مملکت خداداد کا دارالخلافہ بننا ان کے شہر کے حصے میں آ گیا تھا۔ تحریک پاکستان کے سلسلے میں کراچی کے مسلمانوں کے زبردست جوش و جذبے کے بارے میں کراچی بلدیہ کے میئر حکیم محمد احسن مرحوم بتاتے ہیں

انگریز جون 1948ء میں پاکستان کے قیام کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہندو جو پاکستان کے منصوبے کو یکسر ناکام بنانے کے درپے تھے انھوں نے انگریزوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے انہیں 1948ء کے بجائے 14 اگست 1947ء کو یعنی ایک سال قبل ہی برصغیر کو آزاد کرانے پر راضی کر لیا تھا۔ دراصل اس سازش کے تحت ہندو چاہتے تھے کہ پاکستان کے مجوزہ دارالحکومت کراچی میں حکومت پاکستان کے مختلف محکموں اور ضروری اداروں کیلئے عمارات کی تعمیر بروقت مکمل نہ ہو سکے اور اس طرح پاکستان کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جائے مگر مسلمانان کراچی نے انگریزوں اور ہندوؤں کی اس گھناؤنی سازش کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔ انھوں نے اس ضمن میں نہ صرف اپنی طرف سے مالی وسائل فراہم کئے بلکہ معماروں اور مزدوروں کے ساتھ مل کر شب و روز کام میں مصروف رہے اور اپنے پر خلوص جوش و جذبے کی بدولت پاکستان سیکریٹریٹ کی عمارت کو

14 اگست 1947ء سے قبل ہی تیار کرلیا''

قیام پاکستان کے سلسلے میں کراچی کے مسلمانوں کے زبردست جوش و خروش کی ایک مثال 14 اگست 1947ء سے قبل کراچی میں پہلے ریڈیو اسٹیشن کا قیام بھی ہے۔ 14 اگست 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناح کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھانا تھا۔ اہالیان کراچی نے اس تاریخ ساز دن کو عدیم المثال طور پر منانے کیلئے ہفتوں پہلے سے ہی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ قائداعظم کی حلف برداری کی تاریخی تقریب کو ریڈیو سے نشر ہونا چاہئے تھا مگر ایسا ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ اس وقت تک کراچی میں ریڈیو اسٹیشن قائم نہیں ہوا تھا ایسے میں جذبہ آزادی سے سرشار کراچی کے کچھ نوجوانوں نے 14 اگست کی اس تاریخی کارروائی کو ریڈیو سے نشر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ حالانکہ ریڈیو اسٹیشن کے بغیر ایسا کرنا ایک چیلنج سے کم نہ تھا مگر ان پاکستان کے دیوانوں نے اللہ توکل یہ فیصلہ کرڈالا اور یہ خبر اخباروں میں بھی چھپوادی کہ 14 اگست کو قائداعظم کی حلف برداری کی تقریب کو ریڈیو سے نشر کیا جائے گا۔ ریڈیو اسٹیشن کے قیام میں سب سے اہم مسئلہ ایک ٹرانسمیٹر کا حصول تھا۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں امریکیوں نے جے اے ہال میں ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر نصب کیا تھا جس کے ذریعے وہ فوجیوں کی تفریح کے لئے پروگرام نشر کیا کرتے تھے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد امریکی فوج وہ ٹرانسمیٹر وہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے اسے شاید ٹھیک ٹھاک کر کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ ان نوجوانوں نے وہ ٹرانسمیٹر دیکھا مگر امریکی فوج جاتے وقت اسے اس قدر توڑ پھوڑ گئے تھے کہ اب اسے دوبارہ کارآمد بنانا محال تھا۔ بہرحال اس ٹیم نے ہمت نہ ہاری اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک ٹرانسمیٹر خود تیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کام کیلئے انہیں شیر شاہ میں کباڑیوں کی دکانوں پر ٹرانسمیٹر کے بہت سے چھوٹے موٹے آلات مل گئے چنانچہ 20 جولائی 1947ء کو کراچی کے نوجوانوں نے ٹرانسمیٹر بنانے کے کام کا آغاز کیا۔ 10 روز کی مختصر مدت میں شب و روز محنت کر کے پاکستان کے شیدائیوں نے ٹرانسمیٹر کے ساتھ ساتھ اسٹوڈیوز بھی تیار کرلئے اور ان میں سرخ اور سبز بتیاں

بھی نصب کر دیں۔ مگر انہیں اس وقت سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب یکم اگست 1947ء کو انھوں نے تجرباتی طور پر اس ریڈیو اسٹیشن سے نشریات کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انہیں سب سے بڑی پریشانی اس بات کی تھی کہ وہ ریڈیو کی نشریات کے بارے میں پہلے ہی اخباروں میں خبریں شائع کرا چکے تھے اور کراچی کے مسلمان نہایت بے چینی سے ان نشریات کا انتظار کر رہے تھے۔ ان نوجوانوں نے ہمت نہ ہاری اور ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا۔ 5 اگست 1947ء کو تجرباتی ریڈیو اسٹیشن قائم ہو گیا۔ اس کا نام ''سندھ گورنمنٹ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن'' رکھا گیا۔ 10 اِگست سے باقاعدہ نشریات کا آغاز ہوا اور بالآخر ریڈیو اسٹیشن سے وہ کام لیا گیا جس کیلئے اسے قائم کیا گیا تھا یعنی 14 اگست 1947ء کو قائداعظم کے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھانے کی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا گیا۔ یہ تاریخی کارنامہ قیام پاکستان کے سلسلے میں مسلمانان کراچی کے جوش و جذبے کی عکاسی کرتا ہے بلکہ حصول پاکستان کیلئے ان کی جدوجہد کو اجاگر کرتا ہے۔

حق پرست اور حق گو شاعر

جاگیرداروں اور ان کے آباؤ اجداد نے سلطنت برطانیہ کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہی سب سے زیادہ تاج برطانیہ کے وفادار ہیں انہیں عرضداشت پیش کیں۔ جس میں انھوں نے تاج برطانیہ سے اپنی وفاداری اور تابعداری کا اقرار کرتے ہوئے محبت، عقیدت اور اعتقاد کا برملا اظہار کیا۔ یہ وہ دور تھا جب پورے برصغیر میں انگریز سامراج کے خلاف تحریک شروع ہو چکی تھی اس دور میں آزادی کے متوالے، تحریک آزادی کی شمع روشن رکھنے اور حریت پسندوں کی حوصلہ افزائی کیلئے کچھ یوں لکھ رہے تھے۔

حکم حاکم ہے کہ فریاد زبانی رک جائے
دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے

قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے
پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے
دل تڑپتا ہے کہ سوراش کا پیغام ملے
کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے

تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کیلئے جہاں ہر شعبہ حیات سے منسلک مسلمانوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا تھا، وہاں کراچی کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس تحریک کو کامیاب و کامران بنانے کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ کراچی کے ادیبوں نے تحریک پاکستان پر مبنی اپنے مضامین، افسانوں، کہانیوں اور ڈراموں کے ذریعے اور شعراء نے مسلم قومیت کے جذبے سے سرشار نظموں، ترانوں، قطعات اور رباعیوں کے ذریعے مسلمانوں میں نہ صرف آزادی کا بے مثل جذبہ بیدار کیا بلکہ قیام پاکستان کے لئے برصغیر کی سطح پر راہ ہموار کی۔ ان ادیبوں اور شاعروں میں مولانا دین محمد وفائی، شمس الدین بلبل، حکیم فتح محمد سہوانی، مولانا محمد عبدالحیٔ حقانی، مولانا ظہور الحسن درس، حبیب اللہ فکری، عبدالکریم عزمی، حافظ نیاز احمد نیاز وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا شمس الدین بلبل اپنی سندھی تصنیف ''جام جم'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں

> (ترجمہ) ''خدا کے دربار میں فریاد ہے کہ وہ مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان سیاسی میدان میں ہرگز نہ آئیں اور کاہل بن کر سو جائیں۔ نہیں، نہیں وہ شد و مد سے سیاست میں حصہ لیں...... لیکن اپنے جداگانہ مذہبی اور ملکی حقوق مانگیں...... وہ محکوم نہ رہیں بلکہ آزادی کی طلب کریں...... ہماری قومیت سب سے اعلیٰ ہونی چاہیے...... ہندوؤں سے ہمارے سیاسی حقوق صد بار زیادہ ہیں۔''

حکیم فتح محمد سہوانی کی قومی نظموں نے پورے سندھ میں دھوم مچا دی تھی۔ آپ کی شاعری نے مسلمانوں میں انمٹ جذبہ آزادی پیدا کر دیا تھا۔ آپ کی قومی نظموں میں سے ایک سندھی نظم کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

''اے مسلمان تیری شان سب سے بلند ہے.....تو اپنی گردن سے غلامی
کے طوق کو نکال پھینک اور غور کر کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے......لیل و نہار کی
گردش پر نظر رکھ اور دیکھ کہ ساری دنیا میں انقلاب کی لہر جاری ہے......
اے مسلمان! تو اپنے قوت بازو سے اپنے وطن کے دشمنوں کو تباہ کر دے
اور کسی بھی دشمن کو اپنے وطن کی آزادی سے کھیلنے کی اجازت نہ دے......
دشمن کے وعدے پر اعتبار نہ کر۔ کاہلی اور سستی کو اپنے قریب نہ آنے دے
کیونکہ اس لعنت نے قوموں کو ہمیشہ تباہ و برباد کیا ہے۔''

کراچی کے شعراء ابتدا ہی سے تحریک خلافت سے متاثر ہو کر جذبہ آزادی کو اپنی شاعری کا موضوع بنا رہے تھے جب مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی جوہر سمیت دوسرے مسلمان رہنماؤں پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا اور انہیں گرفتار کر کے کراچی جیل میں قید کیا گیا اس نازک موقع پر کراچی کے شعراء نے اپنا پورا حق ادا کیا۔ انھوں نے بڑھ چڑھ کر تحریک خلافت کے حق میں لکھنا شروع کیا۔ اس دور میں کئی منظوم مجموعے بھی شائع ہوئے جو عوام و خواص میں بے حد مقبول ہوئے۔ خاص طور پر ''برگ گل'' اور ''قومی ذخیرہ'' کے نام سے جو مجموعے شائع ہوئے اس میں دل ہلا دینے والی اور آزادی کی روح پھونکنے والی نظمیں شامل تھیں۔ جنھیں قومی نظمیں قرار دیا گیا۔ مسلمان قوم کا شاعری کے ذریعے بھی شعور بیدار کیا جا رہا تھا اور پیغام دیا جا رہا تھا کہ انگریز سرکار کی غلامی کسی طور قبول نہیں اور آزادی کے حصول تک جدوجہد جاری رہے گی۔ جنگ آزادی میں کراچی کے شعراء کا کردار بہت مثالی رہا۔ انھوں نے قوم میں جذبہ جہاد بیدار کرنے اور آزادی کے متوالوں کی حوصلہ افزائی کے لئے بے شمار مثالی نظمیں لکھیں اسی دوران جوہر برادران کی گرفتاری پر ''اسیران کراچی کو مبارکباد'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی۔ اس نظم میں جنگ آزادی کا جذبہ اور انگریز سرکار سے جنگ جاری رکھنے کی پیغام ملتا ہے۔

حق ہی کہتے جائیں گے جب تک یہ جاں میں جان ہے
حق پرستوں کیلئے زینت یہی زندان ہے
آزمائش ہے خدا کے خاص بندوں کی ابھی
اک طرف ہے مال و دولت اک طرف ایمان ہے
یوسف مصری کی مانند آج جو ہیں جیل میں
کل انھوں کے واسطے نبی گنج شائگان ہے
مرد غازی ہو گیا ثابت کہ ہے محمد علی
دیکھ کر مردانگی جس کی جہاں حیران ہے
قابل تحسین کہلو شیر دل شوکت علی
کہہ دیا کورٹ کو اپنا فیصلہ قرآن ہے
حضرت آقا مجدد شاہ سرہندی مرحبا
سندھ والوں کی ترے دم نے بچالی آن ہے

خلافت تحریک کے دنوں میں ہی یوپی سے ہجرت کر کے کراچی آنے والے نامور شاعر افسر صدیقی امروہوی نے مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر نظم لکھ کر اپنا حق ادا کیا اور کراچی کے شعراء کا سربلند کیا۔

غلامی کی دنیا میں واپس نہ آیا
جو منہ سے کہا تھا وہی کر دکھایا
طلسمات عالم سے دھوکا نہ کھایا
نمود و نمائش کے بس میں نہ آیا
لیاقت کا ہر سمت ڈنکا بجایا
سیاست کا مواج دریا بہایا

گل نو بہار وطن ہو کے چمکا
چمن زار ملت پہ بو ہو کے چھایا
گریبان باطل کے پرزے اڑائے
حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا
نہ اعلان حق سے زباں ہچکچائی
نہ راہ عمل میں قدم ڈگمگایا

1921 میں کراچی کے مشہور شاعر غلام احمد اصغر نے ''قومی زخیرہ'' کے نام سے جو شعری مجموعہ شائع کیا اس مجموعے میں آزادی کے نامور سپاہیوں میں علی برادران کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، مولانا آزاد سبحانی، مولانا سلیمان ندوی، شاہ سلیمان فاخر (الہ آبادی) مولانا عبدالماجد بدایونی، مظہر الحق، مولانا عبدالباری' مولانا حسرت موہانی' حکیم اجمل خان، سید حبیب جلال پوری، پیر غلام مجدد سرہندی، مولانا نثار احمد کانپوری، ڈاکٹر کچلو اور جان محمد جونیجو وغیرہ کے نام اشعار میں سموئے گئے تھے۔ اس مجموعے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں تحریک خلافت سے متعلق ان متعدد مطبوعات کی فہرست موجود ہے۔ جو اہالیان کراچی کے لئے نومبر 1921ء میں مہیا کی گئی تھی۔ ان کاوشوں سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک خلافت نے کراچی کے عوام میں کس درجہ قومی بیداری اور جذبہ آزادی کو فروغ دیا تھا۔ نیز شعروادب کو عام ڈگر سے ہٹا کر بیداری اور آزادی کے عنوانات سے سجا دیا تھا۔ اس مجموعے کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں جس میں برطانوی سامراج کو ہندوستان چھوڑنے کا پیغام دیا گیا۔

اٹھا کر بسترا چلتے ہیں عمال برطانی
بہت مدت رہے اب ہند میں رہنا ہے نادانی
یہاں کا بچہ بچہ اپنی آزادی کا خواہاں ہے
خیال سلطنت سے اب اٹھاؤ گے پشیمانی

مولانا عبدالحیٔ حقانی نے اپنی قومی نظموں کے ذریعے تحریک پاکستان کو بے مثال جلا بخشی تھی۔ان کی ایک نظم ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' تاریخ ساز نظم ثابت ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر بھر میں کانگریسی تحریک عروج پر تھی اور مسلمان کانگریس پروپیگنڈے سے بے حد متاثر تھے۔ ایسے میں مولانا حقانی کی اس نظم نے کمال کر دکھایا۔ اس نظم نے نہ صرف کانگریسی پروپیگنڈے کے سحر کو توڑ کر رکھ دیا بلکہ مسلمانوں کی غیرت ملی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دینے کیلئے اس نظم نے انقلاب آفرین کام کر دکھایا۔ یہ نظم نہ صرف کراچی اور سندھ بلکہ برصغیر کے گوشے گوشے میں مسلمانوں کی پسندیدہ نظم بن گئی تھی جبکہ برصغیر میں ہر جگہ اسی نظم سے مسلم لیگی جلسوں کا آغاز ہوتا تھا۔

ترانہ مسلم لیگ

وحدت کا ترانہ شوق سے گا
کثرت سے نہ ڈر تیرا ہے خدا
تنظیم میں مضمر راز تیرا
مرکز سے سرک کر دور نہ جا
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

اسلام کا جھنڈا لہرا کر
ایمان کا جذبہ پیدا کر
انجانے کی راہ نہ دیکھا کر
کعبہ کی طرف منہ اپنا کر
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

باطل پہ اڑے ہیں یہ کانگریسی
کرتے نہیں حق کی داد رسی
کچھ اور ہے ان کے جی میں بسی
ہاں چھوڑ کے ان کی ہم نفسی
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

مولانا ظہور الحسن درس نے بھی تحریک پاکستان کو مقبول عام کرنے کیلئے قومی نظمیں کہیں۔ ان نظموں نے مسلمانوں میں پاکستان سے والہانہ عشق پیدا کر دیا تھا۔ پاکستان کے موضوع پر ان کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

لب پہ ساقی کے ہے جاری نام پاکستان پاک
اب کوئی دم میں ملے گا جام پاکستان پاک
ہے نگاہوں میں شروع کام پاکستان پاک
دل ہے سب سمجھا ہوا انجام پاکستان پاک
پڑھ کر بسم اللہ اٹھے، گام پاکستان پاک
سارے عالم پر عیاں ہو نام پاکستان پاک
ہمت مسلم نے پہنچایا در مقصود تک
اور ہے دو ہاتھ اونچا بام پاکستان پاک

تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے علماء اور مشائخ نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ پاکستان کے مطالبے کی حمایت میں سب سے پہلے سندھ اسمبلی میں قرارداد منظور کرانے کا سہرا بھی پیر حضرت عبدالرحمن بھرچونڈی شریف کے سر تھا اور یہ بات بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دوقومی نظریئے کے سب سے اول داعی مجدد ملت حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی تھے۔ کراچی کے ایک عالم دین اور پیر طریقت حضرت مولانا شاہ محمد غلام رسول قادری نے بھی تحریک

پاکستان کو کراچی میں پروان چڑھانے میں یادگار کردار ادا کیا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل آپ نے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی نوید یوں دی تھی۔

یا الٰہی کر مدد اسلام کی ایمان کی
ہو حکومت مستقل آزاد پاکستان کی
لفظ پاکستان کی یارب سمجھ بھی کر عطا
اصل پاکستان عمل ہے مرد پاکستان کا
اور عمل بھی وہ کہ جس میں روح ہو اخلاص کی
کر عطا نعمت یہ یارب تیرے فضل خاص کی

آزادی کے علمبردار جرائد ورسائل

سندھ کے حریت پسند دانشوروں، صحافیوں اور اہل قلم نے سندھ کی عوام میں سیاسی، سماجی اور دینی شعور پیدا کرنے میں نا قابل فراموش کردار ادا کیا۔ ان کی زیر ادارت شائع ہونے والے اخبارات و جرائد کی خدمات کو کسی طور فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سندھ دھرتی کے حریت پسند اور بے باک سپاہیوں نے اپنے قلم کی طاقت سے انگریزوں کے خلاف بے مثال اور کامیاب جہاد کی۔ ان اخبارات اور جرائد نے سندھ بھر میں تحریک آزادی کے جذبہ کو جوان رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان اخبارات میں روزنامہ ''الوحید'' کو سب سے زیادہ عوامی مقبولیت اور پذیرائی ملی۔ اس اخبار کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ جنوری 1920ء میں حیدرآباد میں مولانا غلام محمد ملکانی کی زیر صدارت خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس وقت برصغیر میں خلافت تحریک پورے زور و شور سے جاری تھی۔ سندھ میں خلافت تحریک کو تقویت بخشنے کیلئے ایک اخبار کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس وقت سندھ میں مسلمانوں کا اپنا کوئی اخبار نہ تھا، جو ان کے موقف کی ترجمانی کرتا۔ چنانچہ اس کانفرنس میں خلافت تحریک کو سندھ میں مقبول بنانے کیلئے ایک اخبار شروع کرنے کا

فیصلہ کیا گیا۔اس اخبار کا نام ترکی کے خلفیہ سلطان وحید الرحمٰن کے نام پر ''الوحید'' تجویز کیا گیا۔ عبداللہ ہارون جو پہلے ہی خلافت تحریک کو سندھ میں مقبول بنانے کیلئے اپنا سرمایہ بے دریغ خرچ کرر ہے تھے، انھوں نے اس اخبار کیلئے بھی سرمایہ فراہم کرنے کا اعلان کیا۔جس کے نتیجے میں مارچ 1920ء سے روزنامہ ''الوحید'' شیخ عبدالعزیز سلمان کی زیرادارت کراچی سے شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار انگریز سامراج کی پالیسیوں کی سخت مذمت کرتا تھا چنانچہ انگریز سرکار نے اسے اپنے خلاف ایک تازیانہ خیال کرتے ہوئے اشاعت کے چند مہینے بعد ہی بند کر دیا۔کئی مہینے بعد اس کی دوبارہ اشاعت کا آغاز ہوسکا اس کے تمام مدیر آزادی کے علمبردار اور انگریز سامراج کے سخت دشمن تھے۔اس اخبار کے پہلے ایڈیٹر عبدالعزیز سلمان کو حکومت پر تنقید کرنے کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔شیخ عبدالمجید سندھی نے بھی اس اخبار کی دل و جان سے خدمت کی۔اس اخبار کے دوسرے نامور ایڈیٹروں میں مولانا دین محمد وفائی، میر اللہ بخش، قاضی خدا بخش، نبی بخش سرکی، دین محمد علیگ، سید جمال الدین، مولانا ہدایت اللہ، عبدالغفور سیتائی اور مشتاق ابڑو شامل ہیں۔ شیخ عبدالرحیم اس کے آخری ایڈیٹر تھے۔اس اخبار نے سندھ کے عوام میں سیاسی، سماجی اور دینی شعور پیدا کرنے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔سندھ کو بمبئی پریذیڈینسی سے جدا کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنانے کیلئے ''الوحید'' نے دلیرانہ قلمی جہاد کی۔شیخ عبدالمجید سندھی نے اس اخبار کے ذریعے مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ ابھارنے اور تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کیلئے نہایت اہم کردار ادا کیا۔اس اخبار کا تمام مواد یعنی خبریں، مضامین اور ادارے آزادی کے بے کراں جذبے سے سرشار ہوتے تھے۔''الوحید'' نئے شائع ہونے والے اخبارات کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔کئی اخبارات نے اپنی مالی مشکلات کے باوجود مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے نظریہ پاکستان کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔الوحید کے علاوہ مندرجہ ذیل اخبارات بھی سندھ میں تحریک آزادی کی جدوجہد میں شریک رہے۔

حاجی نذیر الدین نے اردو کا روزنامہ ''حیات'' 1928ء میں نکالا۔اس کے مدیر مشہور

ادیب و شاعر احمد الدین انجم تھے۔ یہ اخبار تحریک پاکستان کو مقبول بنانے کیلئے جاری کیا گیا تھا۔ روزنامہ حیات مسلم لیگ کی حمایت کے علاوہ مسلم مفاد کی ترجمانی بھی کرتا تھا۔

روزنامہ ''نظام'' یہ اخبار 1928ء میں شائع ہوا اس اخبار کا مقصد مسلم مفاد کا تحفظ کرنا تھا۔ اس کے مدیر سید غلام نبی اوج کراچی کے ادبی اور سماجی حلقوں میں بہت مقبول تھے وہ مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کے زبردست حامی تھے۔

ہفت روزہ ''ملت'' اس اخبار کا اجراء بیسویں صدی کے آغاز پر ہوا تھا، یہ اخبار مسلمانوں کے مفاد کا ترجمان تھا اس میں چھپنے والے مضامین مسلم قومیت کی ترجمانی کرتے تھے اس کے مدیر ایک کہنہ مشق ادیب و شاعر منشی مولا بخش ہمدن تھے۔

ہفت روزہ ''ذوالفقار'' یہ ہفت روزہ مسلم لیگ کے نظریات کا حامی تھا اس کے مدید سید ہادی حسن تھے جو کٹر مسلم لیگی تھے۔ ہفت روزہ ''جمہور'' جو اکھنڈ بھارت کا حامی اور مسلمانوں کے علیحدہ وطن کا مخالف تھا اس کے برعکس ''ذوالفقار'' مسلمانوں کے علیحدہ وطن کا ترجمان تھا۔ اس میں مسلمانوں کے حقوق کی تائید میں مضامین شائع ہوتے تھے۔

ہفت روزہ ''رہبر سندھ'' یہ اخبار مسلم مفاد کی آزادانہ ترجمانی کرتا تھا اس میں اردو اور سندھی دونوں زبانوں میں مضامین شائع ہوتے تھے۔

ہفت روزہ ''عصر جدید'' یہ بھی ایک سیاسی اخبار تھا یہ مسلم مفاد کا حامی تھا۔

ہفت روزہ ''نصرت'' اس اخبار کے مدیر کراچی کے مشہور لیگی رہنما عبدالحیٔ حقانی تھے یہ اخبار بھی مسلم مفاد کا حامی اور مسلم لیگ کا ترجمان تھا۔

اس کے علاوہ سندھی زبان میں شائع ہونے والے رسائل ''توحید'' اور ''ترقی'' اپنے سرورق پر مسلمانوں اور جدوجہد آزادی کے حوالے سے شعر لکھا کرتے تھے۔ توحید کے سرورق پر اردو کا یہ شعر درج ہوتا تھا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اسی طرح ماہنامہ "ترقی" کے سرورق کی تزئین بھی اردو کے اس شعر سے کی جاتی تھی۔

منزل اوج ترقی گر تمہیں کرنی ہے طے
لو اٹھو باندھو کمر آمادہ ہو تیار ہو

سندھ سے شائع ہونے والے اخبارات اور ان کے مدیران نے تحریک آزادی کے ہر کڑے وقت میں جرأت مندی اور بہادری سے اپنا کردار ادا کیا۔ جبکہ اس دور میں جاگیرداروں اور یونینسٹ پارٹی نے پنجاب کے اکثر اخبارات کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے انہیں قومی کردار ادا کرنے نہیں دیا۔ سندھ کے اخبارات اور جرائد، حریت پسند صحافیوں اور دانشوروں نے تحریک آزادی میں اپنا ناقابل فراموش کردار ادا کرتے ہوئے اپنی حب الوطنی کا مکمل ثبوت دیا۔



تحریک آزادی میں
خواتین کی گراں قدر خدمات

تحریک پاکستان کی جدو جہد میں مسلم اقلیتی صوبوں اور سرزمین سندھ کی بلند حوصلہ اور روشن خیال خواتین نے روزِ اول سے اپنے سیاسی شعور اور فہم و فراست کا ثبوت دیتے ہوئے سیاسی سماجی اور فلاحی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دے کر اپنا نام ہمیشہ کے لئے تاریخ میں سنہرے حرف میں رقم کیا۔ ان خواتین نے تحریک آزادی کے طویل اور کٹھن سفر میں ہمیشہ باہمت اور جرات مند عورت ہونے کا ثبوت دیا۔ ان مسلم خواتین نے تحریک پاکستان کی جدو جہد میں بھرپور حصہ لے کر اپنی فہم و فراست' سیاسی شعور' روشن خیالی' وسیع القلبی' خوش مزاجی' بلند حوصلے اور باکردار ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

ہندوستان کی پہلی سیاسی عورت کے بارے میں تحقیق کی جائے اور تاریخ کے اوراق کھنگالے اور عرق ریزی کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی پہلی سیاسی شخصیت کا تعلق بھی سرزمین سندھ سے تھا۔ یہ خاتون سندھ کے حاکم عمرو بن محمد کی اہلیہ فاطمہ تھی جو محمد بن قاسم کی بہو اور حجاج بن یوسف کے خاندان کا سب سے روشن ستارہ تھیں۔ عمرو بن محمد کی اہلیہ فاطمہ کی طرح سندھ کی قدیم حکمران گھرانوں کی خواتین بھی سیاست میں شامل رہیں۔ سومرو خاندان سے تعلق رکھنے والی شہزادی تاری (زینت) نے سندھ میں کافی عرصہ آزادانہ حکومت کی۔ شہزادی تاری کے بعد

ہموں بائی نے بھی سندھ میں حکومت کی۔ دونوں حکمران خواتین کا سندھ کی سیاست میں اہم مقام رہا۔ اس کے علاوہ سمہ دور حکومت میں مدینہ ماچھانی نے سیاسی حوالے سے کافی عزت اور شہرت پائی۔ مدینہ ماچھانی کا تعلق میر پور خاص کے قریب ماچھی قبیلے سے تھا۔ مائی جاماں کا تعلق سندھ کے آخری کلہوڑہ حکمراں خاندان سے تھا۔ مائی جاماں کی سیاسی خدمات سندھ میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ بیگم میر کرم علی خان کو تالپوروں کے عہد حکومت میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ سیاست اور خدمت کا جو جذبہ سندھ کے قدیم خاندانوں اور حکمرانوں سے چلا آ رہا تھا وہی سلسلہ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں بھی نظر آتا ہے۔

ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کی خواتین بھی جدوجہد آزادی میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ جنگ آزادی، تحریک خلافت، تحریک آزادی اور تکمیل پاکستان یعنی کہ ہر وہ تحاریک جو مسلمانوں کے حصول حقوق اور آزادی کیلئے شروع ہوئی اس کی ابتدا متحدہ ہندوستان کے اقلیتی صوبوں سے ہی ہوئی۔ تحریک پاکستان میں خواتین کا جو مثالی کردار رہا اس میں بھی مسلم اقلیتی صوبوں کی خواتین سرفہرست نظر آئیں گی متحدہ ہندوستان کی خواتین حرمت، عزت بہادری و شجاعت کی علامت تھیں۔ یہی اولین دستہ مسلمان خواتین کیلئے مشعل راہ بنا۔ مسلم اقلیتی صوبوں کی قابل قدر خواتین کا نام تاریخ میں ہمیشہ سنہری حرفوں میں لکھا جاتا رہے گا جنہوں نے مسلمان خواتین کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اپنی لیاقت اور صلاحیتوں سے بیدار کیا۔

مسلمان خواتین میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنے کا سہرا بی اماں، امجدی بیگم، نشاط النساء بیگم، خورشید آرا بیگم، بیگم خورشید حفیظ، فاطمہ جناح، بیگم رعنا لیاقت، لیڈی ہدایت اللہ، لیڈی ہارون، صغرا ہدایت اللہ، بیگم حسین شہید سہروردی اور بیگم شمس النساء محمود کو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ میں بیگم شہاب الدین، کلکتہ سے بیگم اصفہانی اور بھوپال سے بیگم بھوپال نے لیڈی ونگ کو وسیع تر کیا۔ دہلی بھی مسلم لیگ لیڈیز ونگ کا بڑا مرکز تھا جہاں نور الصباح بیگم نے مسلم لیگ لیڈیز ونگ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں جبکہ بیگم عبداللہ اور بیگم شائستہ اکرام اللہ نے دہلی میں مسلم خواتین

میں زبردست سیاسی شعور بیدار کیا۔

سندھ میں بیگم صغریٰ' بیگم ہدایت اللہ' بیگم نصرت عبداللہ' لیڈی ہارون، مریم زمانی بیگم اور مسز جی الانہ (جینو بائی) مسلم خواتین ونگ کی روح رواں تھیں جنہوں نے مسلمان خواتین میں دوقومی نظریہ اور تقسیم ہند کے تصور کو دلوں میں روشن اور ذہنوں میں بیدار کیا۔ نیز انہوں نے مسلمان خواتین کو اس نقطہ نظر کا حامی بنایا کہ ہندو مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں ان کی جداگانہ حیثیت ہے۔ اپنے عقائد کی درستگی' مذہبی فرائض کی بجا آوری' معاشرتی روابط اور معاشی اقتصادی حالات کے لئے ہندوستان کا تقسیم ہونا ناگزیر ہے۔

علی گڑھ تحریک سے وابستہ نواب محسن الملک' مولانا محمد علی جوہر' شوکت علی جوہر' نواب وقار الملک' صاحبزادہ آفتاب احمد خان اور نواب اسحاق جیسے جلیل القدر مسلم رہنماؤں کے ذریعہ دوقومی نظریہ خواتین تک پہنچا۔ مولانا محمد علی جوہر گھر اور باہر احباب سے مسلمانوں کی زبوں حالی' عظمت رفتہ اور مستقبل کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ بی اماں نے اپنے دونوں بیٹوں کی زبانی دوقومی نظریہ کی بات سن کر سب سے پہلے لبیک کہا۔ بی اماں ایک سمجھدار اور وضع دار خاتون تھیں اپنی بے پایاں خدمات پر انہیں ''ام الاحرار'' کا لقب ملا۔ بی اماں نے پردوں میں مقید عورتوں کو آزادی کا درس دیا بلکہ ان میں آزادی کی روح پھونک دی۔ سب سے پہلے یوپی اور سی پی کی خواتین آزادی کی شمع لیکر میدان عمل میں اتریں۔ بی اماں کی آواز میں آواز ملانے والی خواتین میں ان کی بہو امجدی بیگم بھی شامل تھیں۔ بی اماں کی قیادت اور دوقومی نظریہ کے خمیر سے مسلمان خواتین کا ایک منظم قافلہ تیار ہوا جسے صف اول کا دستہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس نے اپنے تعمیری اور تحریکی کردار سے مسلمان خواتین میں جذبہ تقلید پیدا کیا اور تکمیل آزادی کے سفر میں انتھک محنت کی۔

دوقومی نظریہ کی پہلی کرن پھوٹنے سے لیکر تکمیل پاکستان کے طویل اور کٹھن سفر میں متحدہ ہندوستان کی نامور مسلمان شخصیات سرسید احمد خان' سید احمد شہید' نواب وقار الملک' مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی جوہر' نواب محسن الملک' لیاقت علی خان' مولانا حسرت موہانی جیسی

قابل احترام شخصیات اور محمد علی جناح جیسے مدبر قائد نے تحریک آزادی اور تکمیل پاکستان کی جدوجہد میں لازوال جانی اور مالی قربانیاں دیں ان شخصیات کے ساتھ مسلمان خواتین نے بھی شانہ بشانہ جدوجہد میں حصہ لیا۔

آبادی بیگم (بی اماں والدہ مولانا محمد علی جوہر)

تحریک خلافت میں ایک نمایاں نام بی اماں کا ہیں قوم کے لئے ان کا سب سے گراں قدر تحفہ ان کے بیٹے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی تھے جنہوں نے تحریک خلافت میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ بی اماں کی ہمت وجرات، صبر واستقلال اور فہم وفراست کی مثال پورے ہندوستان میں ملنا مشکل تھی آپ کی فہم وفراست کا قائل پورا ہندوستان تھا آپ جدوجہد آزادی کی سرگرم رکن تھیں آپ کا نام خلافت تحریک کے چند بڑے اور مرکزی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ آپ نے قدم قدم پر اپنے دونوں بیٹوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ بالغ نظر مشورے بھی دیئے، دونوں بیٹوں کی گرفتاری کے بعد آپ نے تحریک کو زور وشور سے جاری رکھا۔ آپ کی یہ نظم مسلمانوں کے دل کا ترانہ بن گئی تھی۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا

بی اماں جیسی عظیم دانشور خاتون نے خواتین میں دوقومی نظریہ اور آزادی کا شعور بیدار کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنے خاندان کی عورتوں، محلے کی خواتین اور جانے والی

خواتین کو آزادی کا مفہوم سمجھایا۔ بی اماں نے اپنے زور خطابت اور خلوص سے عورتوں کا ایک بڑا گروپ جمع کرلیا۔ انہوں نے نہ خواتین کو آزادی کا سبق پڑھایا بلکہ انہیں میدان عمل میں نکلنے کا پیغام دیا۔ آپ کے پیغام کی وجہ سے خواتین میں سیاسی شعور بیدار ہوا۔ بی اماں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ خواتین میں وہ سب سے پہلے دوقومی نظریہ اور آزادی کی شمع لے کر میدان عمل میں اتریں۔

امجدی بیگم (بیگم مولانا محمد علی جوہر)

بیگم مولانا محمد علی جوہر کو خدا نے سیاسی ذہن عطا کیا تھا وہ ذہین اور فعال خاتون تھیں۔ اسی لئے ان کے گرد ہزاروں خواتین جمع رہتی تھیں۔ آپ ایک جوہر شناس اور دانا و بینا خاتون تھیں۔ آپ نہایت ہی فصیح و بلیغ انداز بیاں میں خواتین کی سیاسی تربیت کرتی تھیں۔ آپ واحد خاتون تھیں جو آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں۔ قائداعظم کی قیادت میں ایک قافلہ دلی سے روانہ ہوکر راس کماری تک پہنچا۔ اس قافلہ میں آپ بھی شریک تھیں آپ کی وجہ سے دوسری خواتین میں بھی ہمت اور جرات پیدا ہوئی۔ امجدی بیگم کی حوصلہ افزائی اور جرات مندانہ اقدام نے عورتوں میں سیاسی بالیدگی کو جنم دیا۔ آپ دور دراز علاقوں کا سفر کر کے عورتوں کے بڑے بڑے جلسے جلوسوں میں خطاب کرتیں آپ نے مولانا محمد علی جوہر کی زندگی میں تحریک خلافت میں برابر حصہ لیا۔ جب مولانا جیل میں ہوتے تو آپ تمام سیاسی کاموں کو دیکھتیں۔ بیگم محمد علی کو یہ بھی اعزاز ہے کہ آپ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے تحریک پاکستان میں عملی حصہ لیا۔ 1938ء میں قائداعظم نے آپ کو آل انڈیا خواتین مسلم لیگ سب کمیٹی قائم کرنے کا حکم دیا چنانچہ آپ نے تمام صوبوں کی خواتین کو یکجا کیا اور تمام صوبوں کی خواتین پر مشتمل کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی کا صدر بھی قائداعظم کی مرضی سے آپ ہی کو بنایا گیا مولانا محمد علی جوہر کی گرفتاری کے بعد آپ نے تحریک میں پہلے سے زیادہ بڑھ کر حصہ لیا آپ مسلم لیگ کی میٹنگوں اور اجلاسوں میں برابر شریک ہوتی تھیں۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر فن خطابت کی بھی ماہر تھیں سیاست پر انہیں ایسا کامل عبور تھا کہ تمام لیڈر بشمول قائداعظم ان کی ذہانت و فراست اور لیاقت کے گرویدہ تھے اور جب بھی

کوئی کانفرنس یا جلسہ ہوتا' امجدی بیگم بھی اسٹیج پر نظر آتیں۔

نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی)

آپ اودھ کے ایک معزز سادات خاندان میں پیدا ہوئیں۔ آپ کو اردو' فارسی اور عربی سے خاص واقفیت تھی۔ بیگم حسرت موہانی کا تحریک آزادی کی ان خواتین میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا۔ آپ برصغیر کی پہلی پردہ شکن خاتون تھیں جنہوں نے روایتی پردہ کو چھوڑ کر سیاست میں قدم رکھا تحریک آزادی کے جلسے اور جلوسوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ حسرت موہانی برصغیر کے مسلمانوں میں پہلے سیاسی قیدی ہوئے تو نشاط النساء بیگم نے اس سیاسی خلا کو پر کرنے کی بھرپور کوشش کی انہوں نے حسرت موہانی کو گرفتاری کے تین روز بعد ہی اپنے شوہر کو خط لکھا' اس میں تحریر کیا۔

> ''اگر بیٹی یا گھر کی محبت میں ذرا بھی پائے استقامت میں لغزش آئی تو سمجھ لینا کہ اس گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں۔''

حسرت موہانی کی گرفتاری کے وقت ان کی بیٹی شدید علیل تھی مگر اس کے باوجود بیگم حسرت موہانی نے حیرت انگیز حوصلہ استقلال کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے کل ہند خواتین وفد کی بھی نمائندگی کی۔ بیگم حسرت موہانی اپنے صبر و استقلال اور بے مثال جانثاری میں حسرت موہانی سے آگے نظر آتی ہیں شوہر کے قید و بند کے بعد ان کا کوئی مونس مددگار نہیں تھا ہر قسم کی مشکلات اور پریشانیوں کا جس بہادری سے آپ نے مقابلہ کیا شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کا مقابلہ کر سکے۔

بیگم حسن آراء

آپ نے تحریک پاکستان میں نمایاں خدمات انجام دیں اور خواتین کو تحریک پاکستان کے مقاصد سے روشن کرنے اور منظم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا آپ کو قائداعظم کی جانب

سے 3 جون 1947ء کے مسلم لیگ کے اہم اجلاس میں مدعو کیا گیا آپ اس اجلاس میں واحد خاتون کونسل ممبر تھیں۔ آپ آل انڈیا مسلم ویمن کانفرنس کی ممبر رہیں مگر مسلم لیگ کے اعلان کے بعد مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی آپ کو یہ بھی اعزاز ہے کہ آپ کی کوششوں کی بدولت 25 فروری 1946ء میں قائداعظم نے پہلی بار خواتین کے جلسے میں شرکت فرمائی اور اس جلسہ میں بیگم حسن آراء نے کلکتہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کی صدر کی حیثیت سے سپاسنامہ پیش کیا۔

بیگم خورشید آراء (بیگم نواب صدیق علی خان)

آپ قائداعظم کے قابل اعتماد رفیق قائد ملت لیاقت علی خان کے پولیٹکل سیکریٹری نواب صدیق علی خان کی اہلیہ تھیں۔ تحریک پاکستان میں جن خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا ان میں بی اماں' امجدی بیگم' بیگم جہاں آراء اور بیگم خورشید آراء صدیق علی خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں' آپ نے نہ صرف تحریک کے سالار کی بیگم کی حیثیت سے۔ اپنے فرائض انجام دیئے بلکہ آپ کی انفرادی خدمات اتنی ہیں کہ تاریخ میں آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ نے ہندوستان میں مسلمان خواتین کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے مسلم گرلز اسکول کھولے۔ ان اسکولوں میں مسلم لڑکیوں کو ملازمت دی ان اسکولوں کے قیام سے یہ فائدہ ہوا کہ خواتین کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا ان خواتین نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ کام کیا مہاجرین جو بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان آرہے تھے اور کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہے تھے ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ بیگم رعنا لیاقت کے ساتھ مل کر گل رعنا کلب کی بنیاد رکھی اور ایک انڈسٹریل ہوم کھولا آپ نے خورشید گرلز کالج بھی قائم کیا۔

بیگم خورشید حفیظ

آپ نے قیام پاکستان میں اس وقت حصہ لیا جب مسلم لیگ کی قیادت قائداعظم نے

سنبھالی اسی زمانے میں خواتین سب کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ آپ نے محترمہ فاطمہ جناح کے زمانہ صدارت میں خدمات انجام دیں آپ کی ذاتی کوششوں کی بدولت صوبہ یوپی اور دیگر اضلاع میں کئی لاکھ خواتین نے مسلم لیگ کی رکنیت حاصل کی۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کی خواتین کمیٹی کی جنرل سیکریٹری بھی رہیں۔ بیگم حفیظ حیدرآباد دکن اسمبلی کی رکن بھی تھیں اس حیثیت سے انہوں نے اصلاح معاشرہ کے لئے بہت کام کئے۔ جس کے اعتراف میں نظام دکن نے حکومت کا سب سے بڑا اعزاز ''تمغہ خسروئے دکن'' عطا کیا آپ پہلی خاتون تھیں جنہیں اس اعزاز سے نوازا گیا آپ تحریک پاکستان کی سرگرم کارکن تھیں قیام پاکستان کے بعد بھی ان کی سماجی خدمات اسی طرح جاری رہیں آپ کا ایک اہم کام مہاجرین کی آبادکاری بھی ہے اس سلسلے میں ''انجمن خواتین مہاجر آبادکار ایسوسی ایشن'' قائم کی۔

بیگم رعنا لیاقت علی خان

آپ حصول پاکستان کی جدوجہد میں قائد ملت کے شانہ بشانہ شریک رہیں خواتین کے جلسے جلوس کی قیادت اور ان کے انتظام آپ ہی سنبھالتی تھیں۔ آپ نے قائد ملت کی شریک حیات ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے ہندوستان سے کوئی چیز لانا گوارہ نہیں کی بلکہ اپنی کوٹھی پاکستان کے سفارت خانہ کیلئے وقف کردی۔ قیام پاکستان کے بعد ایک طرف سیاسی حالات دگرگوں تھے تو دوسری جانب سماجی مسائل پہاڑ کی طرح کھڑے تھے ایسے میں قائداعظم اور قائد ملت کے مشورے سے بیگم رعنا لیاقت علی نے سماجی مسائل حل کرنے کے لئے گھر سے قدم باہر نکالا۔ یہ آپ کی شخصیت کا کمال تھا کہ آپ کی اپیل پر بے شمار معزز اور تعلیم یافتہ گھرانوں کی خواتین اور لڑکیاں رضاکارانہ طور پر سماجی کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ آپ نے اپوا جیسی خواتین تنظیم کی بنیاد ڈالی بلکہ اس کی ملک اور بیرون ملک شاخیں قائم کیں۔ آپ تنظیم، لگن اور خلوص کے ساتھ بڑے سے بڑے منصوبے کو آسان بنادیتی تھی بیگم رعنا لیاقت قیام پاکستان

کے بعد خلوص نیت سے خواتین کی بھلائی کیلئے کام کرتی رہیں۔انہوں نے خواتین کی ترقی اور بہتری کے جو خدمات انجام دیں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔مگر جماعت اسلامی نے اپوا کے قیام کے بعد رعنا لیاقت کے خلاف شدید منفی پروپیگنڈہ کیا۔ان پر بے بنیاد الزامات لگائے۔بیگم رعنا لیاقت علی نے اپنے شوہر کی شہادت کے عظیم ترین صدمے کو صبر کے ساتھ برداشت کیا' بلکہ خواتین کی ترقی اور بہتری کے لئے سرگرم رہیں۔

مادرملت فاطمہ جناح

آپ نے تحریک پاکستان سے تعمیر پاکستان تک ایک باوقار اور یادگار کردار ادا کیا۔ آپ کی شخصیت کا اہم پہلو آپ کی سچائی' آپ کے کردار کی پاکیزگی' آپ کی اصول پسندی اور خلوص تھا۔فاطمہ جناح کی ذہانت وفراست تعمیری کاموں کے لئے وقف تھی آپ ان خواتین کی نمائندہ تھیں جو باکردار' باصلاحیت' اصول پسند اور حق پرست ہوتی ہیں۔فاطمہ جناح نے تحریک پاکستان میں جس عزم و ہمت اور مجاہدانہ ایثار وحوصلے سے کام لیا اس کی مثال شاید ہماری پوری تاریخ بھی نہ پیش کر سکے۔آپ نے نہ صرف مسلم خواتین میں سیاسی شعور بیدار کیا بلکہ انہیں سماجی اور تعلیمی میدان میں بھی اپنے روشن خیالات سے مستفید کیا۔قائداعظم نے فاطمہ جناح کے بارے میں فرمایا تھا کہ ''مس جناح میرے لئے مدد اور حوصلہ کا ایک سرچشمہ ہیں۔'' آپ قائداعظم کی صرف بہن ہی نہیں بلکہ ان کی دست راست بھی تھیں اپنی فطری ذہانت کے سبب خواتین کے علاوہ مردوں میں بھی احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں جب قائداعظم نے مسلم لیگ خواتین ونگ کی بنیاد رکھی تو فاطمہ جناح نے اس کے فروغ میں بھرپور کردار ادا کیا۔قائداعظم نے تحریک پاکستان میں جو شب وروز انتھک محنت کی آپ بھی اس میں برابر شریک تھیں آپ قائداعظم کے کاموں میں ہاتھ بٹھا کر ان کے بوجھ اور ذمہ داریوں کو کم کرنے کی ہرممکن کوشش کرتی تھیں۔

بیگم نصرت عبداللہ

آپ کا تعلق ہارون خاندان سے تھا جس نے سندھ میں تحریک آزادی اور تکمیل پاکستان میں گراں قدر خدمات انجام دیں یہ خاندان عزت و دولت کے اعتبار سے بڑی شہرت اور ساکھ رکھتا ہے۔اس خاندان کی بیگم محمد ہارون' بیگم سعید ہارون اور بیگم یوسف ہارون نے تحریک خلافت سے لیکر تحریک آزادی تک قدم قدم پر مسلمانوں کی دامے درمے سخنے مدد کی۔بیگم نصرت عبداللہ کی کوششوں کی بدولت سندھ میں خواتین میں سیاسی شعور اجاگر ہوا۔آپ کے خاندانی اثر ورسوخ اور بے لوث خدمات کا سندھ کی خواتین پر گہرا اثر ہوا۔بیگم یوسف ہارون گرلز نیشنل گارڈ کی انچارج بھی رہیں۔ہارون خاندان کی خواتین نے تحریک خلافت میں بی اماں کی جس طرح مالی اور سیاسی حمایت کی اور تحریک کو منزل تک پہنچانے کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

لیڈی ہدایت اللہ

آپ کا تعلق سندھ کے ایک سیاسی گھرانے سے تھا آپ نے سول نافرمانی کے موقع پر لاہور کی خواتین کی قیادت سنبھالی تھی جب پنجاب کے سول سیکریٹریٹ پر مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم لہرایا گیا اس جلوس کی قیادت بھی سندھ کی بیٹی لیڈی ہدایت اللہ کے ہاتھوں میں تھی آپ تحریک پاکستان کی سرگرم رہنما تھیں آپ نے سندھ کے علاقے میں خواتین کو منظم کیا اور انہیں سیاسی پلیٹ فارم پر مربوط طریقے سے لائیں لیڈی ہدایت اللہ ''اسم با مسمیٰ'' تھیں۔وہ اپنی آنے والی نسل کو ہدایت دیا کرتی تھیں بے شمار خواتین کو انہوں نے سیاسی شعور دیا انہیں تحریک میں سرگرم کیا۔آپ کے شوہر غلام حسین ہدایت اللہ کو قائداعظم سے والہانہ لگاؤ تھا آپ دونوں نے سندھ میں تعلیم کی شمع جلانے اور عورتوں کو گھر سے باہر لا کر تحریک پاکستان میں شامل کرنے کا بھی فریضہ ادا کیا۔اسی خاندان کی بیگم دولت ہدایت اللہ اور بیگم صغریٰ ہدایت اللہ نے سندھ میں سیاسی حالات کا

رخ بدل ڈالا۔ لیڈی ہارون اور بیگم ہدایت اللہ نے تحریک پاکستان کے اغراض و مقاصد کی تشریح کی اور خواتین میں آزادی کا احساس دلایا جس کے بعد سندھ میں بھی مسلم لیگ کا لیڈی ونگ جوش و جذبہ سے کام کرنے لگا۔

جنیوابائی

آپ جی الانہ کی اہلیہ اور پیار علی الانہ کی والدہ تھیں۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ نے 1937ء کے الیکشن میں کامیابی حاصل کر کے سندھ اسمبلی کی پہلی مسلمان خاتون بننے کا شرف حاصل کیا۔ آپ نے سندھ کی سیاست میں حصہ لیا بلکہ فلاحی اور ترقیاتی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔



وحدانی نظام حکومت
اور سندھ کے تحفظات

انگریز سامراج کی سرپرستی کی بدولت جاگیردار طبقہ کا سلوک عام مسلمانوں کے ساتھ بہت حاکمانہ اور جابرانہ تھا وہ کمزور قوموں کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ جس طرح جاگیرداروں نے پنجاب کے غریب کسانوں اور مسلمانوں کے عام طبقہ کو اپنا محکوم بنایا ہوا تھا ان کی خواہش تھی کہ جہاں جہاں مسلمان معاشی اور اقتصادی طور پر کمزور ہیں انتظامی طاقت کے بل بوتے پر انھیں بھی اپنا غلام اور محکوم بنالیں۔ جاگیردار طبقہ اپنی استبدادی سوچ کے وجہ سے سندھ کو پنجاب کے ساتھ ملانا چاہتا تھا یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے موروثی سیاست دانوں اور جاگیرداروں نے صوبوں کی گروپ بندی کے منصوبہ کی حمایت کی تھی۔ جاگیرداروں کا مزاج دیکھتے ہوئے سندھ اسمبلی کے رکن حسن علی آفندی نے سندھ کی پنجاب کے ساتھ ادغام کی مخالفت اس بنیاد پر کی تھی کہ:

''پنجاب کی انتظامیہ فوجی افسروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے استبدادی تھی۔ پنجاب نان ریگولیٹڈ علاقہ تھا اس لئے اس صوبے کے ضلعی، ڈویژنل اور صوبائی حکام کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہیں تھے۔ بالالفاظ دیگر پنجاب میں ایک طرح سے فوجی آمریت قائم تھی۔'' (حوالہ: سندھ: مسئلہ خودمختاری کا آغاز)

جب سے سندھ بمبئی سے الگ ہوا۔ تب سے وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی حلقے کی طرف سے

سندھ اور پنجاب کی گروہ بندی کی کوشش کی جارہی تھی۔ جن دنوں برطانیہ کے وزارتی مشن کا گروپنگ پلان زیر بحث تھا۔ انہی دنوں سندھ پروگریسو مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک کانفرنس شیخ عبدالمجید کی زیر صدارت سیہون میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں سندھ اور پنجاب کی گروہ بندی کی مخالفت کی گئی تھی۔ اس موقع پر جی ایم سید نے کہا تھا ''سندھ کو بڑی جدوجہد اور مشکلات کے بعد بمبئی سے علیحدگی کا حق ملا ہے۔ اگر سندھ کو پنجاب سے ملا دیا گیا تو اس سے مسلمانان سندھ کو بہت تکلیف ہوگی'' پیر علی محمد راشدی نے کہا تھا ''سندھی مسلمان پنجاب کے ساتھ مل کر گروپ بنانے کو تیار نہیں'' نچل داس وزیرانی نے سندھی مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ'' وہ مجوزہ شمال مغربی گروپ میں شامل ہونے سے انکار کردیں کیونکہ اس گروپ میں اکثریت پنجابی مسلمانوں کی ہوگی اور پنجابی مسلمانوں کی ذہنیت سب کو معلوم ہے وہ سندھیوں کو اپنا اجیر بنانے کی کوشش کریں گے مثلاً نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ہی پنجابیوں نے کسی سندھی کو نہیں گھسنے دیا''

''سندھ کی پنجاب کے ساتھ گروپ پلان میں شامل نہ ہونے کی کئی وجوہات تھیں مگر سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فوج اور پولیس میں پنجابیوں کی تقریباً اجارہ داری تھی اس لئے سارے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق ومفادات کی تقسیم کے فیصلے ان کے حق میں ہوتے۔ سب کو معلوم تھا کہ اسلامی اخوت ومساوات کے بلند وبانگ نعروں کے باوجود بھینس اسی کی ہوگی جس کے پاس لاٹھی ہوگی۔ زمانہ قدیم کے اس معاشرتی قانون کے پیش نظر برصغیر کے بعض مسلم حلقوں کی رائے یہ تھی کہ علامہ اقبال نے دسمبر 1930ء میں شمالی مغربی ہندوستان میں صوبجات بلوچستان، سندھ، پنجاب اور سرحد کو یکجا کرکے ایک خودمختار مسلم ریاست قائم کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی اور پھر جولائی 1939ء میں پنجاب کے وزیراعظم سکندر حیات خان نے اپنی زونل اسکیم پیش کی تھی ان دونوں کا مقصد دراصل ایک ''پنجابی سلطنت'' قائم کرنا تھا۔ سندھ کے مسلمانوں کے چھوٹے سے درمیانہ طبقہ کو پنجابیوں کے ان عزائم کا عملی تجربہ 1932ء کے بعد سکھر

بیراج کے علاقے میں ہو چکا تھا۔اس علاقے میں جن پنجابیوں نے زمینیں حاصل کی تھیں ان کے جارحانہ طرز معاشرت اور احساس برتری نے سندھی عوام میں کوئی اچھے اثرات مرتب نہیں کئے تھے۔غالباً اسی وجہ سے سندھ میں پنجابیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہا اگر تم ایک پنجابی کو اندر آنے کی اجازت دو گے تو دوسرا لازمی طور پر چپکے سے آجائے گا اور جب یہ دو اکٹھے ہو جائیں تو اپنی ذات اور اپنے گھر کا خیال رکھو......اگر سانپ اور پنجابی نظر آجائیں تو سانپ کو چھوڑ دو اور پنجابی کو مارو۔پنجابیوں کے کردار میں ایک نقص یہ ہے کہ جہاں کہیں پنجابی جاتا ہے وہ اپنی ایک پنجابی بستی اور پنجابی انتظامیہ قائم کر لیتا ہے اور صرف پنجابیوں کو ملازم رکھتا ہے وہ اپنے سارے رشتہ داروں کو بلا لیتا ہے اور پھر اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی تقرریوں کے لئے اپنے سارے اختیارات استعمال کرتا ہے۔'' (حوالہ:۔سندھ: مسئلہ خودمختاری کا آغاز)

ون یونٹ کی سازش

مغربی پاکستان کے ایک متحدہ صوبے (ون یونٹ) کا تصور اتنا ہی پرانا تھا جتنی کہ خود پاکستان کی مملکت تھی۔ابتدائی طور پر ون یونٹ کا تصور 1948ء میں پیش کیا گیا تھا اس کا جواز پنجاب کے سیاستدانوں اور نوکر شاہی نے یہ بتایا تھا کہ ون یونٹ کے قیام سے انتظامیہ زیادہ مستعد اور بہتر ہو جائے گی۔اقتصادی حالت بہتر ہوگی اور اس سے صوبائی عصبیت کی روک تھام میں مدد ملے گی۔ون یونٹ کے تصور کو 2 مارچ 1949ء کی دستور ساز اسمبلی میں پیش کرتے ہوئے ملک فیروز خان نون نے کہا تھا ''اس وقت ملک کے مغربی حصہ میں چار صوبے ہیں۔ہر صوبے کی قانون ساز اسمبلی اتنی چھوٹی ہے کہ صوبہ میں ایک مستحکم حکومت کا قیام تقریباً ناممکن ہے۔اس صورتحال کو بہتر بنانے کا ایک راستہ یہ ہے کہ تمام صوبوں کو باہم مدغم کر دیا جائے۔دوسرا راستہ یہ ہے کہ سندھ اور پنجاب کو باہم مدغم کر دیجئے اور دوسری طرف صوبہ سرحد اور بلوچستان کو باہم ملا دیجئے اگر تمام صوبوں کو ملا کر ایک ''واحد مغربی پاکستان'' قائم کرنا چاہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض

نہیں ہوگا۔ ملک فیروز خان نون سے اتفاق رائے کرتے ہوئے بیگم جہاں آراء شاہنواز نے اس بات پر زور دیا کہ: ''مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو یکجا کر کے ان کا ایک صوبہ بنا دیا جائے کیونکہ اس طرح انتظامیہ کے اخراجات میں کمی ہوگی۔ اگر مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ایک انتظامیہ میں مدغم کر دیا جائے تو انتظامیہ میں بہتری پیدا ہوگی جس سے باآسانی اور خوش اسلوبی سے چلایا جاسکتا ہے۔ اگر ہم ان چاروں صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنالیں تو ہم ایوان زیریں میں ہر صوبے کو آبادی کی بنیاد پر اور ایوان بالا میں ''یونٹ'' کی بنیاد پر نمائندگی دے سکتے ہیں''

پنجاب کے سیاسی رہنماؤں خصوصاً چوہدری محمد علی' میاں مشتاق احمد گورمانی اور میاں ممتاز دولتانہ مشرقی پاکستان کے ساتھ کسی بھی آئینی مفاہمت سے قبل ''ون یونٹ'' کے قیام کی شرط پیش کر رہے تھے۔ جنرل ایوب خان جس کا تعلق ضلع ہزارہ سے تھا اس کے جاگیرداروں اور نوکر شاہی سے گہرے مراسم تھے۔ اس نے غلام محمد' مشتاق احمد گرمانی' چوہدری محمد علی اور ممتاز دولتانہ وغیرہ کے علاوہ نوکر شاہی سے گٹھ جوڑ کر لی تھی۔ ایوب خان اس بات پر مکمل آمادہ تھا کہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو ون یونٹ میں متحد کر دیا جائے۔ اسی طرح کی ایک تجویز جولائی 1939ء میں جاگیرداروں کے سرپرست اعلیٰ سر سکندر حیات خان نے ہندوستان کے آئینی مستقبل کے بارے میں پیش کی تھی اس اسکیم میں بھی چاروں صوبوں پر مشتمل ایک زونل فیڈریشن کی تجویز موجود تھی۔ اس پس منظر میں محمد اعظم چوہدری لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں ایک آزاد مسلم ریاست کے بجائے شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں کے انضمام کا تصور پیش کیا تھا جس کو 1952ء کے ون یونٹ کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے۔'' (حوالہ: تحریک پاکستان میں پنجاب کا کردار)

جب مغربی پاکستان کے صوبوں کو ادغام کرنے کی بات ہو رہی تھی اس وقت ''نوائے وقت'' نے بھی بیگم شاہنواز کی تجویز کی پرزور حمایت کرتے ہوئے لکھا تھا: ''ہم اس وقت دستور ساز اسمبلی کی ارکان سے بالعموم اور ارباب حکومت سے بالخصوص صرف یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ یہی

وقت اس فیصلے کے موزوں ہے نیا آئین بن رہا ہے اگر اس میں ان چاروں صوبوں کو توڑ کر ایک صوبہ بنا دیا جائے تو عوام اس کا خیر مقدم کریں گے اگر اس وقت یہ ضروری قدم نہ اٹھایا گیا تو پھر شاید پچاس برس بعد بھی ایسا کرنا آسان نہ ہوگا۔"

ون یونٹ کے قیام کی تجاویز قائداعظم کے وفات کے بعد وقتاً فوقتاً پیش کی جاتی رہیں مگر لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ون یونٹ کے قیام کے سازشیں تیز ہوگئی تھی۔ پنجاب کے موروثی سیاستدانوں کے نزدیک سب سے اہم کام مغربی پاکستان کے صوبوں کو مدغم کر کے ون یونٹ کا قیام تھا۔ چوہدری محمد علی' میاں مشتاق احمد گورمانی' میاں ممتاز دولتانہ اور غلام محمد ون یونٹ کے قیام میں سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ ان سیاستدانوں نے مغربی پاکستان کے صوبوں کو ادغام کے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کی تو صوبہ سرحد اور سندھ کے رہنماؤں نے ون یونٹ کی شدید مخالفت کی۔

سندھ' بلوچستان اور سرحد میں ون یونٹ کی مخالفت مضبوط اور وسیع تر تھی ان صوبوں کو یقین تھا کہ ون یونٹ میں شامل ہونے کے بعد یہ صوبے اپنی انفرادیت کھو بیٹھیں گے۔ پنجاب جو ایک بڑا یونٹ ہے' ان پر حاوی ہو جائے گا۔ ون یونٹ اسکیم پر عمل درآمد کے لئے جو حکمت عملی تیار کی گئی تھی اس کے باعث بھی ان صوبوں کے خدشات میں اضافہ ہوا۔ "ون یونٹ دستاویزات" میں مغربی پاکستان کے صوبوں کے ادغام میں جس طرح قوت اور عیاری کے استعمال کی "سفارش" کی گئی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس اسکیم کے مصنف نے اپنا منصوبہ "میکاولی" انداز میں ترتیب دیا تھا۔ ون یونٹ دستاویزات کے باعث بنگالیوں میں سخت شکوک وشبہات پیدا ہوگئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ون یونٹ کی خفیہ دستاویزات ممتاز دولتانہ اور غلام محمد نے تیار کی تھی۔ ون یونٹ کی اسکیم کا مقصد مغربی پاکستان میں پنجاب کی بالادستی قائم کرنا تھا۔ ون یونٹ کے دستاویزات میں ایک جگہ یہ واضح طور پر لکھا تھا:

"ون یونٹ کے منصوبے کی ناکامی سے پنجاب کو ہی نقصان پہنچے گا کیونکہ دوسری

صورت میں مشرقی بنگال مغربی پاکستان میں چھوٹے بھائیوں کیلئے ''بڑے بھائی'' کا کردار سنبھال لے گا۔'' اسی خفیہ دستاویزات میں تحریر تھا ''ہمیں اپنے دوستوں کی حماقتوں کا سدباب کرنا چاہئے بعد میں پنجاب کو ہی قیادت سنبھالنا ہوگی' مجھے توقع ہے کہ اس وقت تک مرکز اور لاہور میں ایک دانشمند پنجابی قیادت اپنے قدم پوری طرح جما چکی ہوگی''

(حوالہ: اسکندر مرزا ایک صدر کا عروج وزوال)

جو طبقہ ون یونٹ کی حمایت کرر ہا تھا اور چھوٹے صوبوں کے سیاستدانوں کی مخالفت کرر ہا تھا اس طبقہ کے بارے میں خان عبدالغفار خان نے کہا تھا ''یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ جن لوگوں نے انگریز کو یہاں سے نکالا آج انہیں ایسے لوگ غدار قرار دے رہے ہیں جو نسل در نسل انگریزوں کے پٹھو رہے ہیں'' خان عبدالغفار خان کے مطابق ون یونٹ کا منصوبہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی بجلی' بلوچستان کی معدنی دولت اور سندھ کی اراضی ہتھیانے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ خفیہ دستاویزات میں کہا گیا تھا:

''پختونوں کے پاس بجلی' بلوچستان کے پاس معدنی دولت اور سندھ میں وسیع زرعی اراضی موجود ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد کی بجلی سے مستفید ہو۔ بلوچستان کی معدنی دولت اور قبائلی علاقہ میں پائی جانے والی بجلی کے حصول سے عام آدمی کی زندگی میں مساوات قائم ہوگی۔ قبائلی خاندانوں کو سندھ اور بہاولپور کی زرعی زمینوں پر آباد کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ کام تو پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ ہاں بعض مشکلات ضرور ہیں جنہیں دور کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ یہ کام منظم طریقہ سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جائے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت تک ناقابل حصول رہے گا جب تک صوبوں کو ختم نہیں کیا جاتا۔ یہ صوبے جغرافیائی اعتبار سے اس طرح ہیں کہ ان میں سے صرف ایک خودکفیل ہے اور باقی صوبوں کا ایک دوسرے پر

انحصار ہے۔ یہ اسی طرح کا زندگی بھر کا تعلق ہے جیسا سود خور مہاجن اور قرضدار کے درمیان ہوتا ہے“

(حوالہ: اسکندر مرزا ایک صدر کا عروج وزوال)

سکندر مرزا نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ”سرحد کے پٹھان ون یونٹ اسکیم کے مضبوط مخالف تھے۔ میرے دل میں پٹھانوں کے لئے بڑی ہمدردی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ ہم سرحد اور بلوچستان سے ایک ایک لیفٹیننٹ گورنر مقرر کریں گے لیکن میں اس تجویز پر اتفاق رائے حاصل نہ کرسکا کیونکہ پنجابی عنصر اس بات کا شدید مخالف تھا۔“

سندھ سے ون یونٹ کی مخالفت

29 جولائی 1955ء کو خدائی خدمت گار تحریک اور عوامی لیگ کی ایک کانفرنس میں عبدالغفار خان اور پیر صاحب مانکی شریف کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ون یونٹ اسکیم پر عمل درآمد کی مزاحمت کے لئے مناسب انتظام کریں۔ ون یونٹ کے خلاف سرحد سے خان عبدالغفار خان اور پیر مانکی شریف، عبدالصمد اچکزئی، سندھ سے جی ایم سید، حیدر بخش جتوئی سمیت دیگر سیاستدانوں نے ون یونٹ کی شدید مخالفت کی۔ سندھ پر پنجاب کے غلبہ کا خدشہ صرف جی ایم سید یا ان کے ساتھیوں کو ہی نہیں تھا بلکہ بہت سے سندھی مسلم زعماء کو بھی اس کا خدشہ لاحق تھا۔ جس کا اظہار دبے لفظوں میں کرتے رہتے تھے فرق صرف یہ تھا کہ جی ایم سید نے کھل کر اس خدشہ کا اظہار کرنا شروع کردیا تھا کہ اگر پاکستان میں وحدانی نظام حکومت قائم کیا گیا تو سندھ پر پنجاب کا غلبہ ہو جائے گا وہ سندھ کو اپنی کالونی بنالے گا۔ پاکستان میں جب ”وحدانی نظام حکومت“ قائم کرنے کی سازش کی جارہی تھی اس موقع پر کراچی کے سیاسی رہنما ہاشم گزدر نے ”پاکستان ٹائمز“ کے ایک طویل مضمون میں لکھا تھا۔

”23 مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان سے انحراف کیا جارہا ہے جو سندھ سمیت

چھوٹے صوبوں کے ساتھ سراسر ناانصافی اور زیادتی کے مترادف ہے۔ اگر سندھ سمیت چھوٹے صوبوں کو صوبائی خودمختاری نہیں دی گئی تو پنجاب کی سندھ، بلوچستان اور سرحد پر بالادستی قائم ہو جائے گی جو قرارداد پاکستان کے سراسر منافی ہے۔ پورے پاکستان یا مغربی پاکستان میں وحدانی نظام حکومت کی تجویز سراسر غیر جمہوری ہے اور یہ ان وعدوں کے بھی منافی ہے جو 1940ء کی قرارداد پاکستان اور 12 مارچ 1949ء کی قرارداد مقاصد میں کئے گئے ہیں۔ ان قراردادوں میں غیر مبہم الفاظ میں یہ وعدہ موجود ہے کہ پاکستان میں اقتدار اعلیٰ کی حامل آزاد ریاستوں پر مشتمل وفاقی نظام حکومت قائم ہوگا لیکن اگر پنجاب نے محض اپنی اکثریت کے بل بوتے پر چھوٹے صوبوں کے عوام کے جذبات و احساسات کو نظر انداز کر کے اس وعدے کی خلاف ورزی کی تو یہ انتہائی غیر منصفانہ اقدام ہوگا۔ ممکن ہے کہ انہیں وقتی طور پر کامیابی ہو جائے لیکن یہ آمرانہ رد یہ بالآخر اپنے مقصد میں ناکام ہوگا اور اس امر کا امکان ہے کہ اس طرح قومی ریاست کا ڈھانچہ کمزور ہو جائے گا کیونکہ اس قسم کے نظام حکومت کے نفاذ کا مطلب یہ ہوگا کہ چھوٹے صوبوں کے عوام کو بزور قوت غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جائے گا۔ آئین کی تاریخ اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ 1940ء کی قرارداد پاکستان کا احترام کیا جائے۔ ملک کے چھوٹے یونٹوں کی آزادی کو بزور قوت سلب نہیں کرنا چاہئے۔ اگر یونٹوں کی آزادی میں کوئی کمی ضروری ہو تو وہ ان یونٹوں کی آزادی رضا و رغبت سے ہونی چاہئے۔ اگر مرکز کی وحدانی حکومت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مختلف صوبوں کے مقامی معاملات سے محض اس لئے نبٹ سکے گی کہ ہم سب مسلمان ہیں تو دنیا کے سارے مسلم ممالک کی ایک وحدانی حکومت قائم کیوں نہیں کی جاتی اور ایک ایسے بادشاہ کا تقرر کیوں نہیں کیا جاتا جو سارے مسلم علاقوں کا نظم و نسق چلائے۔ اگر ہمیں واپس غیر جمہوری طرز حکومت کی طرف ہی جانا ہے تو پھر مغربی

پاکستان یا پورے پاکستان میں ''بادشاہی'' طرز کی حکومت کیوں نہیں قائم کی جاتی ' پارلیمنٹ اور وزراء وغیرہ کو ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ جس کسی کو بھی آزادی عزیز ہے وہ کبھی اس قسم کی پوزیشن کو قبول نہیں کرے گا کیونکہ اس کا مطلب مکمل طور پر افسر شاہی کی حکومت ہوگا۔''

اگر اس تجویز پر عمل ہوا تو ایسے مسائل پر توجہ نہیں دی جا سکے گی جو واضح نسلی اختلافات، مخصوص ثقافت، رسم و رواج، روایات، طرز زندگی اور مقامی ضروریات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جمہوری ممالک میں چھوٹے بڑے سارے یونٹوں کے عوام کو اپنے مسائل خود حل کرنے کیلئے مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو جمہوریت ایک ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہے کوئی مرکزی حکومت مقامی مسائل پر توجہ نہیں دے سکتی''

ان ہی دنوں سندھ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس سید علی اکبر شاہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک واحد یونٹ میں مدغم کرنے کی تجویز کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ قرارداد میں اس تجویز کو غیر جمہوری قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ ''اس پر عمل کرنے سے مطلق العنان حکومت اور آمریت قائم ہو جائے گی اور تصادم ہونے کا بھی امکان ہے۔ 1940ء کی قرارداد پاکستان میں یونٹوں کو مکمل خود مختاری اور حق خود ارادیت کا یقین دلایا گیا تھا لیکن اب صوبوں کے ادغام کی تجویز پیش کر کے اس یقین دہانی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔''

نوائے وقت نے مغربی پاکستان کے صوبوں کو ادغام کی مخالفت کرنے والے سندھی سیاستدانوں کے بارے میں ''دشمنان پاکستان'' کے لفظ استعمال کرتے ہوئے شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا تھا: ''زمانہ بڑی تیزی سے آگے نکل رہا ہے، دنیا نیشنلزم تک سے بیزار ہو رہی ہے...... خود پاکستان کے مسلمانوں میں اب یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ صوبائی حد بندیاں ختم کر کے پاکستان میں ایک ہی مرکزی حکومت قائم کر دی جائے۔''

نوائے وقت قرارداد پاکستان کے مطابق ترکیبی یونٹوں کوخود مختاری دینے پر آمادہ نہیں تھا بلکہ مذہب کے نام پر بلوچوں، سندھیوں اور پٹھانوں کے حقوق غصب کرنے کا عزم رکھتا تھا اور مسلم قومیت کے نام پر ایک پنجابی سلطنت قائم کرنے کا متمنی تھا، اگر کوئی بلوچوں، سندھیوں اور پٹھانوں کے حقوق کی بات کرتا اسے وہ کمیونسٹ اور اسلام دشمن قرار دیتا لیکن جب وہ خود پنجابیوں کے مخصوص مفادات کے تحفظ کیلئے واویلا کرتا تو اسے اپنے اس علاقائی شاونزم (Chauvinism) اور اسلامی مساوات واخوت کے اصول میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا۔ پنجاب کے مفادات کے تحفظ کیلئے اس کے موقف اور پنجابی جاگیرداروں کے موقف میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے علاوہ یہاں کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے استحصالی عزائم کی بھی ترجمانی کرتا تھا۔"

(حوالہ: مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقا)

23 مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان میں صوبوں کو مکمل خود مختاری دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ مسلمانان ہند صرف اس دستوری خاکے کو قبول کریں گے جو مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مرتب کیا جائے گا۔

Resolved that it is the considered view of this session of the All-India Muslim league that no constitutional plan would be workable in this country or acceptable to the Muslim, Unless it is designed on the fallowing basic principles, viz, that geographically contiguous units are demarcated into regions which should be so constitued with such territorial readjustments as may be necessary. that the areas in which Muslims are numerically in a majority as in

the north-western and eastern zones of India should be grouped to constitute Independents States in which the constituent units shall be autonomous and sovereign.

1940ء کی قرارداد پاکستان میں Independed States اور Autonomous and Sovereign یعنی آزاد اور خودمختار یونٹس کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ پہلی آئین ساز اسمبلی میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے جو قرارداد پیش کی اس کی روح 1940ء کی قرارداد کے عین مطابق تھی 12 مارچ 1949ء کو آئین ساز اسمبلی کی قرارداد مقاصد (Objective Resolution) لیاقت علی خان کے زیر قیادت منظور ہوئی اسکے الفاظ تھے:

Where in the terrtories now included in or in accession with Pakistan and such other terrtories as may hereafter be included in or accede to Pakistan shall form a federation where in the units will be autonomous with such bounderies and limitaion on their powers and authority as may be prescribed.

بانیان پاکستان نے پہلی آئین ساز اسمبلی کے سیشن میں جس قرارداد مقاصد کو منظور کیا اس میں واضح طور پر تحریر ہے کہ علاقے خودمختار ہوں گے اور پاکستان ایک فیڈریشن کی مانند ہوگا۔ بانیان پاکستان نے قرارداد مقاصد کو منظور کر کے قرارداد پاکستان کی روح کو زندہ رکھا۔ مگر نوکر شاہی اور جاگیرداروں نے ذاتی مفادات کی خاطر اور صوبوں کی مرضی اور منشاء کے بغیر پاکستان میں وحدانی نظام حکومت قائم کر کے نظریہ پاکستان سے سراسر انحراف کیا بلکہ قرارداد پاکستان کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی گئی۔

☆☆☆☆☆

دارالحکومت کی پنجاب منتقلی

لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد نوکر شاہی نے جب اقتدار پر قبضہ کیا تو کئی چیزیں جو قائداعظم کے اصولوں کے مطابق تھیں اور جو فیصلے وہ اپنی زندگی میں کر گئے تھے ان فیصلوں کو نوکر شاہی ہر صورت میں مٹا دینا چاہتی تھی کیونکہ یہ فیصلے نوکر شاہی کے عزائم اور مفادات سے متصادم تھے۔ قائداعظم نے کافی غور و خوض اور توقف کے بعد یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ پاکستان کا دارالحکومت کراچی ہوگا۔ قائداعظم کوئی کام بھی سوچ بچار کے بغیر نہیں کرتے تھے وہ بہت دور اندیش رہنما تھے جلد بازی ان کی طبیعت میں شامل نہیں تھی۔ وہ پہلے سوچتے اور اس کے بعد فیصلہ کرتے تھے وہ اس شہر کو پاکستان کا دارالحکومت بنانا چاہتے تھے جو مختلف اجزائے ترکیبی کے باہمی ارتباط و اختلاط اور ہمرنگی کا آئینہ دار ہو اور اس کی مشترک شہری زندگی متحدہ قومیت کے تصور کو آگے بڑھانے اور فروغ دینے کا باعث بنے۔ قائداعظم نے کراچی کو ملک کا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا تھا۔

1:۔ وفاقی دارالحکومت عوام کے درمیان میں ہونا چاہئے تاکہ حکمران ہر وقت عوام کے دل کی دھڑکن سنتے رہیں اور ان سے گھل مل کر رہیں اور ایسی صورت پیدا نہ ہو کہ عوام اور حکمرانوں کے درمیان دوری کا احساس پیدا ہو۔

2:۔ کراچی پاکستان کے جملہ عناصر ترکیبی پر مشتمل ایک مشترک شہر تھا یہ شہر باقی پاکستان کی عکاسی کر رہا تھا اس کی مشترک شہری زندگی، متحدہ پاکستانی قومیت کے تصور کو آگے

بڑھانے کا موجب ہوسکتی تھی۔

3:۔ مسلم اقلیتی صوبوں سے آنے والے مہاجروں کے سیاسی شعور کا مظاہرہ قائداعظم تحریک پاکستان کی جدوجہد میں دیکھ چکے تھے انہیں یقین تھا کہ مہاجر پاکستان کی سیاست میں پروگریسو کردار ادا کریں گے۔ مہاجر ملکی سیاست میں عوامی اور جمہوری استحکام کا باعث بنیں گے بلکہ وہ مستقبل کی حکومتوں میں غیر جمہوری اور غیر مناسب رجعت پسندی کو روکنے کی صلاحیت کو بروئے کار لاسکیں گے۔ بالفاظ دیگر کراچی کے شہری ملک میں ایک جمہوری حکومت کے قیام میں اپنا بھرپور کردار ادا کرسکتے تھے اور مرکزی حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوسکتے تھے یہی وجہ تھی کہ قائداعظم کو کراچی کے عوام کے سیاسی شعور، ذہانت اور فکری دیانت پر کامل بھروسہ تھا۔

4:۔ نئے دارالحکومت کے ضرورت کے مطابق کراچی میں تمام دفاتر موجود تھے، قائداعظم قرض یا خیرات کے پیسے سے ایک آزاد ریاست کا دارالحکومت بنانے اور محل تعمیر کروانے کو آزادی کے تصور اور قومی شان اور نیک نامی کے منافی سمجھتے تھے۔

5:۔ کراچی کی آب وہوا معتدل تھی نہ زیادہ گرمی اور نہ ناقابل برداشت سردی، یہ آب وہوا مشرقی پاکستان کے لوگوں کیلئے خاص طور سے مناسب تھی۔

6:۔ مشرقی پاکستان میں پاکستان کی 56 فیصد آبادی تھی ان لوگوں کیلئے کراچی آنا آسان تھا، سمندر کے راستے غریب سے غریب بنگالی بھی کراچی پہنچ سکتا تھا۔ اس سہولت کی وجہ سے ان لوگوں میں اجنبیت کا احساس بھی جاتا رہتا۔ یہ مقاصد وفاقی دارالحکومت کو مغربی پاکستان کے کسی دور دراز صوبے کے بغل میں رکھنے سے حاصل نہیں ہوسکتے تھے۔

دارالحکومت منتقل کرنے کی سازش

قائداعظم کے انتقال کے بعد جاگیرداروں، مفاد پرست سیاستدانوں اور نوکرشاہی نے قائد کے اصولوں اور فیصلوں سے انحراف کرنا شروع کردیا تھا۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے

بعد موقع پرست جاگیرداروں' مفاد پرست سیاستدانوں اور اقتدار کی بھوکی نوکر شاہی نے مل کر غلام محمد کے سر پر گورنر جنرل کا تاج رکھ دیا۔ غلام محمد نے اقتدار پر قابض ہونے کے چار پانچ ماہ بعد ہی پاکستان کے اس بنیادی ڈھانچہ میں تبدیلی کا فیصلہ کرلیا۔ جسے قائداعظم نے بنایا تھا۔ نوکر شاہی نے دو منصوبے تیار کئے ان میں ایک منصوبہ ون یونٹ کا تھا اور دوسرا منصوبہ دارالحکومت کو کراچی سے اٹھا کر پنجاب لے جانے کا تھا۔ دارالحکومت کراچی کی منتقلی کی سازش غلام محمد کے دور میں شروع ہوئی تھی اس بارے میں پیر علی محمد راشدی لکھتے ہیں کہ

''میں اس زمانہ میں سندھ آبزرور کا ایڈیٹر تھا۔ ایک روز میرا چیف رپورٹر دارالحکومت والا کاغذ میرے پاس لے آیا اور کہا کہ فلاں صاحب نے (جو نوکر شاہی کی لابی کا سرغنہ تھا) بڑے رازدارانہ انداز میں اور کافی چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے مجھ سے استدعا کی ہے کہ میں دارالحکومت کو کراچی سے نکلوانے کے حق میں آبزرور میں ایڈیٹوریل لکھواؤں اس افسر کا خیال یہ تھا کہ چونکہ سندھ کی رائے عامہ شروع میں دارالحکومت کو کراچی میں رہنے کیخلاف تھی۔ لہٰذا یہی مناسب رہے گا کہ دارالحکومت کے شفٹ کرانے کی مہم کی ابتداء بھی سندھ کے اخبار آبزرور کی طرف سے ہو۔ وہ افسر غالباً یہ بات بھول گیا تھا کہ شروع میں بھی سندھ کی رائے عامہ کیخلاف یہ اخبار اس بات کے حق میں تھا کہ وفاقی دارالحکومت کراچی میں رہے (یعنی جب تک یار لوگ اس کو یہاں رہنے دیں) مجھے شک تھا کہ قائد کا یہ فیصلہ دیرپا ثابت نہیں ہوگا۔

میں نے کوئی ایڈیٹوریل تو نہیں لکھا البتہ میری باتیں اس بارے میں مرحوم الطاف حسین ایڈیٹر ڈان سے ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ سازش بہت گہری ہے اور اوپر سے چلی ہوئی ہے اس مہم کو چلانے کیلئے ''فالتو صحافیوں'' کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔ ''فالتو صحافیوں'' سے الطاف حسین کی مراد وہ لوگ تھے جن کا کسی موقر اخبار سے تو تعلق نہیں تھا مگر وہ بحالت بے روزگاری خود کو صحافی بتا کر سرکاری سرپرستی کی تلاش

میں رہتے تھے۔انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ ایسا ہی کاغذ ''ایک فالتوصحافی'' ان کے پاس بھی لے آیا تھا مگر انھوں نے اس کوڈانٹ کر اپنے یہاں سے بھگا دیا تھا۔''

اس کاغذ کو، جو میرے پاس میرا چیف رپورٹر لے کر آیا تھا مضمون کیا تھا؟ مضمون یہ تھا کہ وفاقی دارالحکومت کو کراچی میں رکھنا نہیں چاہئے کیونکہ:

☆ کراچی کی آب وہوا میں سرکاری اہلکار بیمار پڑ جاتے ہیں۔

☆ دفاع کے لحاظ سے بھی کراچی کا ساحلی شہر غیر موزوں ہے۔

☆ یہ صنعتی شہر ہے اور یہاں کے صنعت کار سرکاری افسروں سے غلط کام لے سکتے ہیں

☆ کراچی کی گنجان آبادی اور شوروشر میں نوکر شاہی کا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کرسکتا۔

(حوالہ: روداد چمن از پیر علی محمد راشدی)

ابتدائی دنوں میں دارالحکومت کی منتقلی کے منصوبے پر اس وجہ سے بھی عمل نہ ہوسکا کہ اس وقت کسی نہ کسی شکل میں جمہوریت باقی تھی اور ٹوٹی پھوٹی پارلیمنٹ موجود تھی جس کی منظوری کے بغیر دارالحکومت تبدیل نہیں ہوسکتا تھا۔اس منصوبے پر عملی جامہ پہنانے والے بخوبی جانتے تھے کہ مشرقی پاکستان اور کراچی کے نمائندے کسی صورت میں بھی دارالحکومت کی منتقلی کی اجازت نہیں دیں گے۔ پارلیمنٹ میں بنگالی سیاست دان اس پر بہت زیادہ احتجاج کریں گے۔ دارالحکومت کی منتقلی کی سازش میں جو ٹولہ شریک تھا وہ تمام تر کوشش کے باوجود رائے عامہ کو اپنے فیصلہ سے مطمئن نہ کرسکا۔مشرقی پاکستان اور کراچی کے اخبارات اور بزنس مین اس منصوبے کی تائید کے لئے تیار نہ تھے مگر پنجاب کی نوکر شاہی نے ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت ایوب خان کو اقتدار میں آنے کی دعوت دی۔نوکر شاہی نے اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کیلئے ملک میں مارشل لاء لگوایا اور پھر یہی لوگ مارشل لاء کے سائے میں دارالحکومت کو کراچی سے اٹھا کر راولپنڈی لے گئے۔یہ کارروائی مارشل لاء کے تحت کرائی گئی جس کی وجہ سے نہ پارلیمنٹ کی منظوری کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ کسی آئینی خانہ پری کی۔دارالحکومت کی کراچی سے پنجاب منتقلی کا منصوبہ پنجاب

کے بیوروکریٹ غلام محمد نے تیار کیا تھا جسے پنجاب کے جاگیرداروں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ مارشل لاء کے پہلے ہی سال دارالحکومت کراچی کو صوبہ پنجاب کے بازو اسلام آباد لے جایا گیا جہاں نئے دارالحکومت کی تعمیر پر اربوں روپے خرچ ہوئے۔ اس قلعہ نما دارالحکومت میں سیاستدان اور نوکرشاہی قلعہ بند ہوکر بیٹھ گئی۔

دارالحکومت کراچی کی اسلام آباد منتقلی کے بارے میں جو دلائل پیش کیے گئے تھے اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ دفاع کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ''کراچی کا ساحلی شہر دفاع کیلئے غیر موزوں ہے۔'' جبکہ دفاعی نقطہ نظر سے بھارت اور افغانستان کی سرحدوں سے اسلام آباد کا فاصلہ ہوائی جہاز سے صرف دو منٹ کا ہے۔ دوسرا جواز یہ بتایا گیا تھا کہ ''کراچی کی آب و ہوا میں سرکاری اہلکار بیمار پڑ جاتے ہیں۔'' کراچی کے موسم کے مقابلے میں اسلام آباد کا موسم زیادہ سخت ہے۔ صرف موسم کی وجہ سے دنیا کے کسی ملک میں دارالحکومت تبدیل نہیں کیا گیا۔ تیسرا جواز یہ بتایا گیا تھا کہ ''کراچی کی گنجان آبادی اور شور و شر میں نوکرشاہی کا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کرسکتا۔'' اگر شہری شور و شر سے سرکاری اہلکاروں کا دماغ خراب ہورہا ہوتا تو دنیا کے تقریباً تمام دارالحکومت جو بڑے شہروں میں واقع ہیں وہاں کام کرنے والے سرکاری اہلکار کب کے پاگل ہو چکے ہوتے۔ لندن، پیرس، بیجنگ، برلن، ٹوکیو، ماسکو، واشنگٹن اور دہلی کراچی سے بڑے شہر ہونے کے باوجود وہاں دارالحکومت قائم ہیں بلکہ سرکاری اہلکار ہمارے ملک کے سرکاری اہلکاروں سے بہت بہتر انداز میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دارالحکومت کی منتقلی کا فیصلہ کرنے والوں نے تین بنیادی باتوں کو نظرانداز کیا۔

قائداعظم کے فیصلہ سے انحراف

کراچی کو دارالحکومت بنانے کا جو فیصلہ قائداعظم نے کیا تھا اصولی طور پر اس فیصلہ کا احترام کیا جاتا اور اگر دارالحکومت کی تبدیلی اتنی ہی ناگزیر تھی تو یہ فیصلہ آئینی، قانونی اور عوامی

مشورے کے بعد کیا جانا چاہئے تھا۔مگر قائداعظم کے فیصلہ کو فوجی جنرل اور نوکر شاہی نے مسترد کرتے ہوئے عوام مرضی ومنشا کے بغیر نوکر شاہی کی خواہش کی تکمیل اور اپنے ذاتی مفادات کیلئے دارالحکومت کو کراچی سے اسلام آباد منتقل کرنے کا فیصلہ راتوں رات کرلیا۔

عوام کی پہنچ سے دور دارالحکومت

جن حکمرانوں نے اپنے دارالحکومت کو عوام اور شہروں سے دور لے جا کر اور نئے شہر بسا کران میں رکھے وہ سب انقلابات کی زد میں آ کر تباہ ہوگئے۔وہ علیحدہ بستیاں اب دنیا کیلئے عبرت گاہیں ہیں۔عوام کی پہنچ سے دور دارالحکومت لے جانے کا نقصان پاکستان کو بھی اٹھانا پڑا۔ دارالحکومت کی اسلام آباد منتقلی کے چند سال بعد ہی عوامی انقلاب کی صورت میں پاکستان دولخت ہوگیا۔پاکستان کا ایک صوبہ الگ ہوکر بنگلہ دیش بن گیا۔

مشرقی پاکستان کی عوام پر منفی اثرات

قائداعظم نے مشرقی پاکستان کی عوام کی سہولت کو دیکھتے ہوئے کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا تھا تاکہ انہیں دوری کا احساس نہ ہو بنگالیوں نے بھی کراچی کو ایک مشترکہ ملکی میراث سمجھ کر یہاں کاروباری دفاتر اور جائیدادیں خریدنا شروع کردی تھیں۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ایک بنیادی وجہ کراچی سے دارالحکومت کی منتقلی بھی بنی۔اس فیصلہ کو بانی پاکستان محمد علی جناح کے فیصلے سے بغاوت کے رنگ میں دیکھا گیا۔قائد کی بصیرت نے اسے ایک طرف مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان اتحاد کی کڑی بنایا اور دوسری طرف انتظامی لحاظ سے کسی بھی صوبے کی گرفت سے آزاد اور بالاتر رکھا تھا۔مشرقی پاکستان میں اس فیصلہ کے خلاف سب سے زیادہ شدید ردعمل ہوا۔تمام مورخین نے اسے علیحدگی کے اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا۔

پنجاب کی نوکر شاہی نے شروع دن سے بنگالی قوم کے ساتھ غیر منصفانہ، غیر جمہوری اور غیر اخلاقی رویہ رکھا۔ جس کی وجہ سے بنگالیوں اور پنجابیوں میں ایک نفرت پروان چڑھ رہی تھی مگر جب غلام محمد کے منصوبے کی تکمیل جنرل ایوب خان کے ہاتھوں انجام پائی اور پاکستان کے دارالحکومت کو پنجاب لیجایا گیا تو پہلے سے موجود فاصلے مزید بڑھ گئے۔ نئے دارالحکومت کے قیام کے بعد جب مشرقی پاکستان کے رہنما اجلاس میں شرکت کیلئے پنجاب جایا کرتے تھے تو وہاں انہیں اجنبیت کا احساس دلایا جاتا تھا۔ نوکر شاہی بنگالی رہنماؤں سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتی تھی۔ پنجاب کی بیورو کریسی نے اپنے متعصبانہ رویہ سے بنگالی قوم کے دل میں اجنبیت کا احساس پیدا کیا۔ ایک عام بنگالی جو کراچی پہنچ کر اپنا کام کرالیتا تھا۔ اسلام آباد پہنچنا اس کیلئے مشکل تھا تو دوسری طرف پنجاب کے نوکر شاہی بنگالی سے ملنا پسند نہیں کرتی تھی اس رویہ نے بھی نفرت اور دوریوں کو مزید بڑھایا۔

ایوب خان کا اقتدار میں آنا

دارالحکومت کراچی کی منتقلی کی سازش تو ملک غلام محمد نے تیار کی تھی مگر اس منصوبے کو جنرل ایوب خان نے نوکر شاہی کی مدد سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ کیوں کہ جنرل ایوب خان کا تعلق بھی ضلع ہزارہ سے تھا اس وجہ سے ان کے پنجابی جاگیرداروں اور نوکر شاہی سے گہرے مراسم تھے اس تعلقات اور مشترکہ مفادات کے تحت جنرل ایوب خان نے دارالحکومت کی منتقلی کی اس سازش پر عمل کیا جو ملک غلام محمد نے تیار کی تھی۔ ملک غلام محمد نے گورنر جنرل بنتے ہی کمانڈر انچیف ایوب خان کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کی۔ ایوب خان بھی گورنر جنرل ملک غلام محمد سے قریبی رابطہ رکھنا چاہتے تھے کیونکہ فوج کے اندر ان کی پوزیشن ابھی تک مستحکم نہیں ہوئی تھی ان کی تقرری سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے عمل میں آئی تھی۔ ''راولپنڈی سازش کیس'' کی تلوار بھی ان کے سر پر لٹک رہی تھی۔ اس صورتحال میں یہ ایوب خان کی مجبوری تھی کہ وہ گورنر جنرل ملک غلام محمد کے ہر

حکم کی تعمیل کریں۔ کئی تاریخی واقعات اس بات کے ثبوت ہیں کہ غلام محمد نے ایوب خان کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا اور انہیں اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی۔

☆...... ایوب خان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''غلام محمد اس پر وقتاً فوقتاً زور ڈالتا رہا تھا کہ فوج اقتدار پر قبضہ کر لے''۔

☆...... ایوب خان نے مارشل لاء لگاتے ہی پہلے روز یعنی 8 اکتوبر 1958ء کو اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں بار ہا غلام محمد کی اس دعوت کو کہ میں ملک پر قبضہ کرلوں'' ٹھکراتا رہا تھا۔

☆...... 1954ء میں جب غلام محمد اور محمد علی بوگرہ کے مابین جھگڑا ہوا تو بوگرہ امریکہ کے دورے پر روانہ ہو گئے اس موقع پر غلام محمد نے ایوب خان کو امریکہ تک ان کے پیچھے بھگایا۔

☆...... محمد علی بوگرہ امریکہ سے واپس آئے تو ایوب خان انہیں کراچی ایئر پورٹ پر اترتے ہی غلام محمد کے پاس لیکر گئے۔

☆...... جس وقت غلام محمد پستول دکھا کر محمد علی بوگرہ سے آئین ساز اسمبلی تڑوا رہے تھے اس وقت بھی ایوب خان اقتدار کی منتقلی کے اس مرحلے پر موجود تھے۔

☆...... غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی توڑنے کے ساتھ مرکزی کابینہ میں ایوب خان کو وزیر دفاع بنوایا جبکہ وہ فوج کے کمانڈر انچیف بھی رہے۔

☆...... غلام محمد کی علالت کی وجہ سے جب ان کی جگہ سکندر مرزا کو قائمقام گورنر جنرل بنایا گیا تو یہ تقرری کابینہ نے فوجی کمانڈر انچیف ایوب خان کی تحریک پر ہی کی۔

ان کڑیوں کو ملائیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایوب خان کو اقتدار کی کرسی تک لانے

اور دارالخلافہ کو کراچی سے اٹھا کر اسلام آباد لیجانے میں نوکر شاہی اور ان کے سرکاری امام ملک غلام محمد کا ہاتھ تھا۔ پاکستان کے دارالحکومت کو کراچی سے اٹھا کر پنجاب لے جانے کا مقصد پاکستان کے نظم ونسق کو وہاں کی نوکر شاہی کے کنٹرول میں رکھنا اور دارالحکومت کو عوام کی پہنچ سے دور رکھنا تھا۔



فوج میں بھرتی ۔۔۔سندھ کا موقف

بنگال اور سندھ کا ہندوستان کے ان صوبوں میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے تاج برطانیہ کی وفادار فوج میں شامل ہونے سے انکار کردیا تھا اس بات کا تاج برطانیہ کے حکمرانوں کو بھی بخوبی احساس تھا کہ بنگالی قوم تاج برطانیہ کی وفادار نہیں ۔یہی وجہ ہے کہ جب جنگ عظیم اول کے دوران پورے ہندوستان سے رنگروٹوں کی بھرتی شروع ہوئی تو بنگال سے بامشکل 6 ہزار رنگروٹ برطانوی فوج میں شامل ہوئے جبکہ بنگال کی آبادی 480لاکھ تھی ۔بنگالی برطانیہ کی فوج میں شامل ہونا اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ فوج تاج برطانیہ اور اس کے مفادات کی وفادار تھی ۔بنگالی چونکہ برطانوی فوج میں شامل نہیں تھے اس لئے قیام پاکستان کے بعد ان کے بارے میں یہ کہا جانے لگا کہ بنگالی جنگجو قوم نہیں' ان میں اچھا سپاہی بنے کی صلاحیت نہیں' وہ عسکری نسل نہیں ہیں۔ بنگالیوں کے غیر عسکری نسل (Non Martial) کے جواب میں مشرقی پاکستان کے ممتاز صحافی اور مصنف تفضل حسین مانک نے لکھا ہے:

''مغربی پاکستان کے مفاد پرست ٹولے نے بنگالیوں کو بھی غیر عسکری نسل (Non-Martial) قرار دیتے ہوئے، مسلح افواج میں بنگالی نوجوانوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا۔تاج برطانیہ نے اپنی وجوہات کی بناء پر بنگالیوں کو مسلح افواج میں شامل نہیں کیا تھا صرف ہندوستان کے مغربی علاقے خصوصاً صوبہ پنجاب کے لوگوں کو مارشل نسل کی حیثیت سے افواج میں شامل کیا جاتا تھا۔ بنگالیوں کو غیر

عسکری نسل قرار دینے کی وجہ سیاسی تھی کیونکہ اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے وہ بیرونی حکمرانوں کے بھاڑے کی فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ تاج برطانیہ کو خوف تھا کہ وہ افواج میں شامل ہو کر کہیں بغاوت نہ کروادیں۔ جن ہندوستانیوں کو عسکری نسل کا خطاب دیا گیا وہ ہندوستانی لوگ تاج برطانیہ کی ہدایت پر اس کے مفاد کیلئے کوئی بھی ظلم کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ باغی شاعر نذرالاسلام 49 بنگال رجمنٹ میں شامل ہونے کے بعد اپنی صلاحیت کی بناء پر حوالدار کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن جنگ کے بعد ان کی ادبی کاوشوں کا ایک بڑا حصہ تاج برطانیہ کے خلاف تھا وہ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں اپنی تیز اور تیکھی تخلیقات کو لکھتے رہے اور شائع کرواتے رہے۔ تاج برطانیہ کی حکمرانی اور استحصال کے دوران اس کے جبر کیخلاف انکی طاقتور تحریروں نے برصغیر کے لوگوں کی تحریک آزادی میں بہت ہی جوش و جذبہ پیدا کیا۔ تاج برطانیہ کے خلاف اور اس کے ظلم و جبر کے خلاف بنگالیوں میں شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ اس نفرت کو محسوس کرتے ہوئے اور بنگالیوں میں استحصالی قوتوں کیخلاف بغاوت کے جذبہ کو دیکھتے ہوئے تاج برطانیہ کی وفادار فوج میں بنگالیوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔''

(حوالہ: متحدہ پاکستان کے 20 سال)

بنگال کی طرح سندھ میں بھی انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ سندھ میں حروں کی بغاوت نے انگریز سرکار کو کافی محتاط کردیا تھا۔ تاج برطانیہ نے اہلیان سندھ کی انگریز حکمرانوں سے نفرت اور حروں کے ساتھ ہمدردی کو دیکھتے ہوئے سندھ کے مسلمانوں کی انگریز فوج میں بھرتی پر غیر اعلانیہ پابندی عائد کی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر غلام علی الانہ نے 1857ء کی جنگ آزادی کے سلسلے میں کراچی میں رونما ہونے والی بغاوت کے واقع اور فوج میں بھرتی پر پابندی کے حوالے سے یوں تحریر کیا ہے۔

''کراچی میں حریت پسندوں نے کمشنر سندھ اور دوسرے انگریز افسران کو قتل کرنے کے کئی منصوبہ بنائے تھے مگر یہ تمام منصوبے راز فاش ہو جانے کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ حریت پسندوں نے کراچی میں صدر بازار کی فوجی چھاؤنی کے علاقے میں ایک اسلحہ کے ذخیرے کو بھی اڑا دیا تھا۔ بعد میں بغاوت میں شریک تمام مقامی فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے 26 جوانوں کا کورٹ مارشل کیا گیا اور تین جوانوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا بعد میں ان کی لاشوں کو تلوار سے ٹکڑے کر کے دریا میں بہا دیا گیا۔ ایک حوالدار اور متعدد سپاہیوں کو توپ کے منہ میں ڈال کر اڑا دیا گیا تھا۔ اس بغاوت میں شریک جو بھی مقامی فوجی باقی بچے تھے، ان کو کورٹ مارشل کے بعد فوج سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد مقامی لوگوں پر فوج کی ملازمت کے دروازے ہمیشہ کیلئے بند کر دیئے گئے۔

(حوالہ: پاکستان کی تحریک میں سندھ کا حصہ)

سندھ رجمنٹ کا مطالبہ

سندھ کے سیاستدانوں نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہ فوج میں صوبہ سندھ کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے اس کے باوجود سندھ کے لوگوں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جا رہا۔ 20 اپریل 1949ء کو لاڑکانہ میں مسلم لیگ کی دو روزہ کانفرنس کے موقع پر جس کی صدارت وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر کر رہے تھے۔ قاضی فضل اللہ نے یہ مطالبہ کیا کہ ''سندھیوں کو پاکستانی افواج میں بھرتی کیا جائے کیونکہ ان میں اچھا سپاہی بننے کی ساری صلاحتیں موجود ہیں۔'' مگر کسی نے اس مطالبہ پر توجہ نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھیوں کے لئے مرکزی سول سروسز کی طرح ملٹری سروسز کے دروازے بھی بدستور بند رہے۔ 17 جنوری 1951ء کو جنرل محمد ایوب خان کمانڈر انچیف بنے تو انھوں نے بھی برطانوی سامراج کے ''مارشل قوم'' کے تصور کی پوری طرح پابندی کی۔ انہوں نے بھی سندھیوں، بنگالیوں اور مہاجروں کو آبادی کے تناسب سے فوج

میں بھرتی نہیں کیا۔ایوب خان کا خیال تھا کہ ان کی صحت اور جسمانی قد وقامت ایسی نہیں کہ انہیں فوج میں بھرتی کیا جائے۔کمانڈر انچیف ایوب خان کے اس سامراجی اندازِ فکر سے اہلِ سندھ کو بڑی مایوسی ہوئی، چنانچہ سندھ مسلم لیگ کی کونسل نے 19 مارچ 1951ء کو ایک قرارداد میں اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ پاکستانی فوج میں سندھیوں کو بھرتی کیا جائے۔ایوب کھوڑو نے بار بار اپنی تقریروں میں سندھ رجمنٹ کی تشکیل کی تجویز پیش کی مگر ایوب کھوڑو کے مطالبہ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں سندھ کے رہنماؤں کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ صوبہ سندھ میں سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کے تحفظ کیلئے ضروری ہے کہ افواج پاکستان میں سندھیوں کو برابری کی بنیاد پر نمائندگی حاصل ہو۔کیوں کہ قیام پاکستان کے ابتدائی ایام سے ہی افواج پاکستان ایک مضبوط اور منظم ادارے کی صورت میں سامنے آئی تھی۔مملکت کے سب سے مضبوط ادارے میں پنجاب کی واضح اکثریت شامل تھی جبکہ سندھ کے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔اس لئے سندھ کے رہنماؤں نے حکومت پاکستان سے بار بار مطالبہ کیا کہ فوج میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کے لوگوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔17 اگست 1951ء کو ایوب کھوڑو نے لاڑکانہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ ''سندھیوں کو افواج پاکستان میں بھرتی کیا جائے۔انھوں نے پاکستانی فوج میں ایک سندھی رجمنٹ کی تشکیل کی ضرورت پر زور دیا، انھوں نے مطالبہ کیا کہ ''سندھی نوجوانوں کیلئے ایک فوجی ٹریننگ سینٹر کھولا جائے۔سندھی رجمنٹ کی تشکیل سے نہ صرف سندھیوں کی فوج سے جذباتی وابستگی کو تقویت ملے گی بلکہ ان میں جوش و جذبہ اور ''مارشل سپرٹ'' پیدا ہوگی۔انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ سندھی نوجوانوں کی سپاہیانہ صلاحیت کسی سے کم نہیں ہے۔''ایوب کھوڑو نے 1951ء کو سندھ رجمنٹ کی تشکیل کیلئے سیکریٹری دفاع اسکندر مرزا سے بھی بات چیت کی مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا کیوں کہ کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان سندھ کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کیلئے تیار نہیں تھے وہ سمجھتے تھے کہ سندھیوں میں ''مارشل اسپرٹ'' نہیں۔''جنرل ایوب خان کی نظر

میں فوج پر اولاً پنجابیوں اور ثانیاً ضلع کوہاٹ کے پٹھانوں کا حق ہے۔ان کے نزدیک پاکستان کے دفاع کیلئے''غیر مارشل نسل'' کے سندھیوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

سندھی قوم کی جنگجو اہلیت

سندھ کی عوام کے بارے میں اکثر یہ منفی پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ان میں مارشل سپرٹ نہیں، وہ دوران ٹریننگ فوج سے بھاگ جاتے ہیں، ان میں سختیاں برداشت کرنے کی عادت نہیں، ان الزامات کا جواب دیتے ہوئے ایک سندھی قوم پرست کالم نگار اور مصنف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

''جب بھی سندھیوں نے مطالبہ کیا کہ سندھیوں کو آبادی کے تناسب سے فوج میں نمائندگی دی جائے تو انہیں جواب میں کہا گیا کہ سندھی فوج میں بھرتی ہونا پسند نہیں کرتے اور یہ الزام لگایا کہ سندھی قوم میں جنگجو اہلیت (مارشل اسپرٹ) نہیں ہے جب کہ ہمارا موقف یہ رہا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے فوج میں اکثریت پنجاب کی رہی ہے۔فوج میں بھرتی کرنے اور ٹریننگ دینے کا اختیار ان ہی کے پاس ہے۔ ان کا رویہ دوسرے صوبوں سے آنے والوں کے ساتھ غیر مہذب اور غیر شائستہ ہوتا ہے جب ایک سندھی نوجوان حب الوطنی کے جذبہ کے تحت فوج میں بھرتی ہونے جاتا ہے، اس سے عجیب وغریب سوالات پوچھے جاتے ہیں کہ تمہارا سر گول کیوں ہے؟ ......ہمارے سروں کی طرح مستطیل کیوں نہیں ہے؟ ......تمہارے گھٹنے برابر کیوں ہیں؟......تمہارا قد چھوٹا کیوں ہے؟...... یہ سوالات سن کر سندھی پریشان ہوتے ہیں کہ وہ تو افواج پاکستان میں بھرتی کیلئے گئے تھے اور ان کے ساتھ غیروں جیسا سلوک ہو رہا ہے...... جو لوگ کسی نہ کسی طرح میڈیکل پاس کر کے فوج کی ٹریننگ میں چلے جاتے ہیں ان کیساتھ غیر مہذب اور غیر اخلاقی برتاؤ کیا جاتا ہے۔انہیں دوسروں سے

زیادہ سخت ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں تاکہ سندھی تنگ آکر اور مایوس ہوکر ٹریننگ چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ ہمارا موقف ہے کہ سندھی نوجوان پر مکمل سندھ رجمنٹ تیار کی جائے جسے ٹریننگ دینے والے بھی سندھی ہوں۔ اس کے علاوہ ٹریننگ کا مرکزی ہیڈکوارٹر سندھ کے کسی بھی ضلع میں ہونا چاہئے۔

''سندھیوں پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ سندھی جنگجو اہلیت نہیں رکھتے یا بزدل ہوتے ہیں۔ یہ سندھیوں کے خلاف پروپیگنڈا ہے تاکہ انہیں فوج میں بھرتی نہ کیا جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سندھی ہمیشہ غیروں اور لٹیروں سے لڑتے رہے ہیں چاہے حملہ آور عرب' ایرانی، مغل، ارغون یا خلجی ہوں جس نے بھی سندھ پر حملہ کیا سندھیوں نے اپنا سر قربان کر کے سرحدوں کی حفاظت کی ہے۔ اس دھرتی کے فرزند ہر طاغوتی طاقت سے ٹکراتے رہے ہیں۔ تاریخ میں رقم ہے کہ سندھی باہر سے آنے والے حاکموں کے خلاف تیر کمانوں، نیزوں، بھالوں، برچھیوں، تلواروں، کلہاڑیوں اور جذبۂ شجاعت سے لڑتے رہے ہیں۔ سندھ کے چپے چپے پر وطن کے بہادر بیٹوں نے غیروں سے جنگ کر کے اپنے ملک کی عزت و آبرو رکھی۔

''سندھ کے دفاع اور باہر سے آنے والوں کے خلاف سندھیوں نے جو جنگیں لڑیں اس بارے میں ہڈسٹین نے لکھا ہے کہ ''سندھ کی خودمختاری، سالمیت، بقاء اور دفاع کی جنگ ''سندھی ایسے لڑتا ہے جیسے کوئی آدمی اپنی ایسی چیز کیلئے لڑتا ہے جو اس کو زندگی سے زیادہ عزیز ہو۔'' تاریخ گواہ ہے کہ قومی غیرت وطنی وقار کے لئے سندھ کی ہر ذات سے تعلق رکھنے والے نے دشمنوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔

''سندھی کو یہ طعنہ دینا کہ وہ فوج میں بھرتی کے لائق نہیں ان پر سراسر غلط اور بے بنیاد الزام ہے۔ سندھ کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو سندھی دلیر اور بہادر نظر آئے گا۔ سندھ واحد سرزمین ہے جس پر شہید وطن پیر صبغت اللہ پگارا کی قیادت میں انگریزوں

کو نکالنے کیلئے دو بار گوریلا لڑائی لڑی۔

سندھیوں کو افواج پاکستان میں بھرتی کیلئے ہمارا مطالبہ ہے کہ فوج میں بھرتی کے قدیم طریقہ کار کو تبدیل کیا جائے، کیونکہ اب جنگیں روایتی ہتھیاروں کے بجائے ذہانت اور ٹیکنالوجی کی مدد سے لڑی جاتی ہیں۔ سندھی جرات، بہادری کے ساتھ ساتھ ذہانت اور ٹیکنالوجی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس لئے ان کی قابلیت کی بنیاد پر فوج میں بھرتی کیا جائے۔ ہمارا یہ بھی مطالبہ ہے کہ جو سندھ رجمنٹ قائم کی گئی ہے وہ صرف نام کی سندھ رجمنٹ ہے اس میں پنجاب اور صوبہ سرحد رجمنٹ کے کچھ یونٹ شامل کر کے سندھ رجمنٹ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ سندھیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے کیا گیا ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ سندھ کے مستقل باشندوں پر مشتمل سندھ رجمنٹ تیار کی جائے جو لوگ سندھ سے فوج میں بھرتی کیلئے جائیں انہیں تعصب کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔

''سندھ کی تقریباً 80 فیصد آمدنی فوج پر خرچ ہوتی ہے لیکن جب سندھ کے دفاع اور حفاظت کا سوال پیدا ہوتا ہے یا جنگ کے حالات پیدا ہوتے ہیں تو سب سے پہلے پنجاب کے بارڈروں کا دفاع کیا جاتا ہے اور سندھ کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے۔ 1965ء کی جنگ میں سندھ کے بڑے بارڈروں کے لئے صرف 10 ہزار فوج مخصوص کی گئی جبکہ پنجاب کے دفاع کیلئے ڈھائی لاکھ فوج بارڈر پر تعینات کی گئی۔ اسی طرح 1971ء کی جنگ میں سندھ کی حفاظت کیلئے صرف 15 ہزار فوج بارڈر پر کھڑی کی گئی جبکہ پنجاب کے لوگوں کی حفاظت کیلئے 3 لاکھ فوج تعینات کی گئی۔ یوں سندھ کی سرحدوں کو لاوارث چھوڑ دیا گیا۔''

(حوالہ: سندھیوں پر ستم کب تک)

سندھ کو اپنی آبادی کے تناسب سے فوج میں حصہ نہ ملنے کی شکایت 1947ء سے اب

تک رہی ہے۔اس کے باوجود کہ سندھ سے ذوالفقارعلی بھٹو،محمد خان جونیجو، بےنظیر بھٹو (دوبار) غلام مصطفیٰ جتوئی وزیراعظم کے عہدے پر رہے۔سندھ کی وزارت اعلیٰ ہمیشہ سندھی بولنے والوں کے پاس رہی ہے گورنرسندھ، وفاقی وزیر، اسپیکر قومی اسمبلی جیسے عہدوں پر بھی سندھی بولنے والوں کے پاس رہے ہیں مگروہ سندھ کی آبادی کے تناسب سے سندھی بولنے والوں کو فوج میں بھرتی نہیں کرسکے۔

مہاجروں کے ساتھ ناانصافی

مہاجر بھی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے انتہائی جذباتی ہے وہ افواج پاکستان میں شامل ہوکر ملک اورقوم کے دفاع کیلئے اپنی جان قربان کرنے کیلئے تیاررہتے ہیں کیوں کہ پاکستان کی تعمیر میں ان کے آباؤاجداد نے لازوال اورانمٹ جانی اور مالی قربانیاں پیش کی تھی۔پاکستان کی قدراور قیمت مہاجروں سے زیادہ کسے ہوگی مگر بدقسمتی سے بانیان پاکستان کی حب الوطنی پرشک کیا جاتا ہے۔متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین بھی فوج میں شامل ہونا چاہتے تھے مگر دوران ٹریننگ جس طرح ان کے ساتھ سلوک روارکھا گیا۔اس کا اندازہ الطاف حسین کی کتاب ''سفرزندگی'' کے ان اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

> ''میری آرزو یہ تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں لیکن 1965ء کی جنگ میں میرے خیالات میں تبدیلی آگئی اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں فوج میں شامل ہوں گا تاکہ ملک کے دفاع کی جو آرزو پیدا ہوئی ہے اس کی تکمیل ہوسکے۔یہ غالباً 1970ء کی بات ہے میں کراچی سٹی کالج میں انٹرسائنس کا طالب علم تھا۔یحییٰ خان کی حکومت نے ان دنوں لازمی فوجی سروس کی ایک ''نیشنل کیڈٹ سروس اسکیم'' شروع کی تھی جس کے تحت ہر میٹرک پاس نوجوان کو ایک سال تک لازمی طور پر فوجی خدمات انجام دینا تھیں۔ چنانچہ تمام کالجوں سے، پہلے کورس کیلئے لڑکے منتخب کرنے کی غرض سے کارروائی شروع ہوئی۔اس وقت میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کس طرح خود کو منتخب کرالوں کیونکہ نہ تو

میری کوئی سفارش تھی اور نہ ہی میرے والدین کوئی اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ فوج کی ٹیم لڑکوں کے انتخاب کیلئے ہمارے کالج میں بھی آئی انھوں نے ہمارے ٹیسٹ وغیرہ لئے، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں نے وہ ٹیسٹ کوالیفائی کر لئے ہیں اور میں بھی نیشنل کیڈٹ سروس اسکیم کیلئے منتخب کرلیا گیا ہوں تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ گھر واپس آ کر میں نے والدین سے ضد کر کے پیسے لئے اور اپنے محلے میں دوستوں اور دوسرے لوگوں میں مٹھائی تقسیم کی۔ سلیکشن کے بعد ہمیں ٹریننگ کیلئے بھیج دیا گیا۔

سونمیانی میں ہم دل و جان سے اپنی بارڈر ٹریننگ مکمل کرر ہے تھے لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس ٹریننگ کے دوران بہت سی چیزیں ایسی ہوتی تھیں کہ وہ فوری طور پر تو سمجھ میں نہیں آتی تھیں کہ یہ کیا ہیں لیکن جب بعض باتیں کھل کر سامنے آئیں تو انتہائی اذیت ہوئی۔ بارڈر ٹریننگ کے دوران دو ٹیمیں بنادی جاتی تھیں۔ رات کی ٹریننگ کا ایک حصہ یہ ہوتا تھا کہ دشمن پر کس طرح حملہ کیا جاتا ہے اور جب دشمن حملہ کرے تو دفاع کس طرح کیا جاتا ہے، جنگلوں میں جاکر دشمن کے مورچوں پر کس طرح حملہ کیا جاتا ہے ہم یہ دیکھتے تھے کہ ہمیں روزانہ اس ٹیم میں شامل کیا جاتا تھا جو پہاڑیوں اور جنگلوں میں سے ہوتی ہوئی ایک لمبا راستہ طے کر کے اس مورچہ تک آتی تھی جس پر ہمیں حملہ کرنا ہوتا تھا۔ پہلے تو ہم اس بات پر بہت خوش ہوتے تھے کہ ہمیں زیادہ اچھی ٹریننگ مل رہی ہے جس سے بہتر امیدیں وابستہ ہیں اسی سے زیادہ مشقت لی جارہی ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے کوئی اور چیز کارفرما ہے۔ ہمارے جو حوالدار صاحب تھے وہ اپنے خاص لوگوں کو کیمپوں کے قریب بنی ہوئی خندقوں میں بٹھا دیتے تھے اور دوسرے لوگوں کو طویل اور مشکل راستوں پر دوڑاتے تھے۔ پھر بھی ہم نے اس چیز کو کوئی اہمیت نہیں دی اور سوچا کہ اس محنت سے ہمیں فائدے ہی حاصل ہوں گے۔ ہماری تربیت زیادہ اچھی ہوگی۔ تربیت کے

دوران ایک ٹیم خندقوں میں چھپتی تھی اور دوسری چھپ کر اس پر حملہ آور ہونے کا مظاہرہ کرتی ہے۔ خندق کے قریب ایک لائن ہوتی تھی اگر حملہ کرنے والی ٹیم اس لائن کو کراس کر کے چارج کہہ دے تو اس کی کامیابی تھی اور اگر اس کے لائن کراس کرنے سے پہلے خندق میں چھپی ہوئی ٹیم اسے ''ہالٹ'' کہہ دے تو یہ اس ٹیم کی کامیابی تھی۔ ایک روز یہ ہوا کہ ہم نے بڑی محنت سے چھپتے چھپاتے کرالنگ کرتے ہوئے لائن کراس کی اور زور سے چارج کا نعرہ لگایا لیکن جیسے ہی ہم نے چارج کہا ویسے ہی خندق سے تھم یعنی ہالٹ کا نعرہ لگایا گیا۔ اس پر میں نے کہا کہ بھئی پہلے ہم نے چارج کہا ہے۔ ہمارے حوالدار بھی وہیں موجود تھے اس نے مجھے آواز دی

''اوئے الطافے کیا شور کرتا ہے۔''

میں نے اس سے کہا کہ استاد پہلے میں نے چارج کہا ہے۔

وہ کہنے لگا ''اوئے تو نے پہلے کیسے کہا''

اس کے بعد اس نے جو جملہ کہا میں فوری طور پر اس کا مطلب سمجھ نہیں سکا۔ اس نے کہا ''اوئے تم کیا جنگ کرو گے......تم ہندوستوڑے کیا کر سکتے ہو......تم کو فوج میں کس نے بھرتی کر لیا ہے،......تم کراچی میں رہنے والے......شہروں میں رہنے والے، چائے پینے والے......ٹیڈی پتلونیں پہننے والے......تم کیا جنگ کرو گے۔''

میں تو حیران ہو گیا کہ یہ ہندوستوڑے کسے کہہ رہا ہے اور پھر مجھے کہا کہ ''تم لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔'' میں کس جذبے کے تحت فوج میں گیا تھا اور مجھے گالیاں سننے کو مل رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ استاد آپ ایسی زبان استعمال نہ کریں تو حوالدار نے کہا کہ

''تم لوگوں کی لڑکیاں تو ٹیڈی کپڑے پہنتی ہیں۔''

اس نے اتنی بات کی تھی کہ میں نے کہا کہ ''استاد اس سے زیادہ بات نہ کرنا......''

اس حوالدار نے نہ صرف مجھے بلکہ شہر میں رہنے والوں کو اور ان کی ماؤں بہنوں کو نہ

جانے کن کن ناموں سے پکارا۔اس پر مجھے بے حد صدمہ ہوااور غصہ بھی بہت آیا۔اس کی باتیں سن کر میرے ذہن سے وہ سوچیں چلی گئیں جو بچپن سے میرے ذہن میں تھیں کہ میں فوج میں جاؤں گا اور پاکستان کی خاطر اپنی جان دیدوں گا۔اس حوالدار کی باتوں نے میرا سارا تصور چکنا چور کردیا۔میں کس خواہش، کس تمنا، کس آرزو کتنی شدت جذبات کیساتھ اور کتنی محبت وعقیدت کے ساتھ وہاں گیا تھا۔میرا مقصد صرف یہ تھا کہ وطن کی خاطر اپنی جان دیدوں۔

''میں نے صوبیدار میجر کو رپورٹ کی اور کہا کہ فوج کے جو اعلیٰ افسر ہمیں لیکچر دینے آتے ہیں وہ اپنی ہر تقریر میں کہتے ہیں کہ فوج ایسی جگہ ہے جہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پیتے ہیں۔میں نے صوبیدار میجر کو وہ تمام باتیں بتائیں جو حوالدار نے مجھے کہیں تھیں میں نے کہا کہ میں تو بڑے جذبہ اور بڑی عقیدت سے یہاں آیا تھا اور یہاں میرے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔میری رپورٹ پر حوالدار کو بلایا گیا۔میں خوش تھا کہ اب میرے ساتھ انصاف ہوگا۔میں فیصلہ کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا لیکن معلوم ہوا کہ ہمیں سزا کے طور پر دوسرے دن ''پٹھو پریڈ'' شروع کرادی گئی۔حوالدار کے بجائے ہمیں سزا دی گئی کہ تم نے نظم وضبط کی خلاف ورزی کی ہے۔چنانچہ میں ایک ہفتہ تک ''پٹھو پریڈ'' بھگتا رہا۔

''اس واقعہ کے بعد جب میں نے غور کرنا شروع کیا تو بہت سی باتیں سامنے آئیں۔حالانکہ احساسات بہت بری طرح مجروح ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں ہوا تھا۔خدانخواستہ میں نے اپنے ذہن میں کوئی منفی سوچ پیدا نہیں ہونے دی، نہ ہی کوئی منفی رویہ اختیار کیا۔''تربیت کے دوران میں نے پورے خلوص کے ساتھ یہ کوشش کی کہ میں تمام مشقوں کو اور تمام کاموں کو پوری دیانتداری سے انجام دوں، تاکہ میں اپنے اندر زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور استعداد پیدا کرسکوں اور کسی بھی

برے وقت میں وطن کے دفاع کیلئے اس ٹریننگ سے فائدہ اٹھا سکوں۔ حالانکہ اس دوران میں برابر یہ محسوس کرتا رہا کہ کچھ لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارا راشن اور دوسری ضروریات کا سامان جس جگہ سے آتا تھا وہ جگہ کیمپ سے فاصلہ پر تھی۔ وہاں سے لکڑیاں، راشن اور دوسرا سامان اٹھا کر کیمپ میں لانا پڑتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ یہ کام زیادہ تر ہمیں ہی کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ "ویک اینڈ" پر گھر جانے کیلئے جو نائٹ پاس جاری ہوتے تھے ان میں بھی امتیاز برتا جاتا تھا۔"

(حوالہ: سفر زندگی ۔۔الطاف حسین)

قیام پاکستان کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تمام قومی اداروں میں اور تمام شعبوں میں صوبوں کو برابری کی بنیاد پر نمائندگی دی جاتی مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ سندھی اور اردو بولنے والوں کی حب الوطنی کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس منفی رویہ کی وجہ سے سندھ میں شدید احساس محرومی نے جنم لیا۔ سندھ کی عوام میں پائی جانے والی احساس محرومی کو محسوس کرتے ہوئے الطاف حسین نے سندھ کے باشندوں پر مشتمل سندھ رجمنٹ کے قیام اور سندھ کی آبادی کے تناسب سے فوج میں حصہ دینے کا بار بار مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا "1940ء کی قرارداد کی روح کے مطابق نیا آئین تشکیل دیا جائے جس میں برابری کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے فوج سمیت تمام اداروں میں تمام صوبوں کو برابر نمائندگی دی جائے۔ دفاع کے محکمے میں کسی ایک صوبے کی اکثریت یا اجارہ داری نہ ہو بلکہ اس میں تمام صوبوں کا مساوی حصہ ہونا چاہئے۔ اگر فوج کسی ایک مخصوص صوبے یا علاقے کے لوگوں پر مشتمل ہو تو وہ علاقائی فوج تو کہلائی جاسکتی ہے لیکن قومی فوج نہیں کہلاسکتی۔"

☆☆☆☆☆

سرزمین سندھ کو کس نے لوٹا؟

برطانوی فوج میں واضح اکثریت' اپنی استبداری طاقت اور انگریز سامراج کی مکمل حمایت کی بدولت جاگیردار طبقہ کا مزاج حاکمانہ اور جابرانہ بن گیا تھا وہ اپنے سے کمزور قوموں کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل جاگیرداروں کی یہ کوشش تھی کہ پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان پر مشتمل ایک صوبہ تشکیل دیا جائے اس پس منظر میں جب جاگیردار طبقہ کی جانب سے وحدانی نظام حکومت کی تجویز آئی سندھ نے اس تجویز کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ

''پنجاب مسلم قومیت کے نام پر پنجاب سلطنت قائم کرنے کا متمنی ہے''

قیام پاکستان کے بعد سندھ کی زرعی اراضی اور بیراجوں کی زمین جاگیرداروں اور بیوروکریسی سے محفوظ نہ رہ سکی۔ خاص طور پر ملک غلام محمد' جنرل ایوب خان' اور جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں سندھ کی اراضی کی بندر بانٹ کا سلسلہ اپنے عروج پر رہا۔ سندھ کی قیمتی زمین غیر مقامی افراد میں کم قیمت پر یا تقریباً مفت تقسیم کی گئی' سندھ کے ہاریوں اور کسانوں کو اپنی زمینوں سے بے دخل ہونا پڑا اور ان زمینوں پر پنجاب سے ہاری اور مزدور بلا کر بٹھائے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد سندھ کی زمین کو جاگیرداروں اور بیوروکریسی نے مال غنیمت سمجھ کر لوٹا نیز مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے پنجابیوں کو بھی سندھ کے بیراج کے علاقوں میں آباد کیا گیا اور ہر خاندان کو پانچ سے لے کر بارہ ایکٹر اراضی دی گئی ہر خاندان کو ماہانہ الاؤنس کے علاوہ بیج ہل اور مویشی کی خریدار کے لئے الگ سے رقم دی گئی اس کے علاوہ انہیں نقدی قرضے بھی دیئے گئے۔

سندھ کی زمینوں پر قبضہ کی ابتداء تو اس وقت ہوئی تھی جب مشرقی پنجاب سے آنے والے پنجابی مہاجروں کو اے کلاس مہاجر کا درجہ دے کر کلیم کا پورا معاوضہ دیا گیا۔ سندھ کی زمینوں کی تقسیم کا کام بھی پنجاب کی نوکرشاہی کے سپرد کر دیا گیا تھا جنہوں نے سندھ کی زمینیں اپنے پنجابی بھائیوں میں تقسیم کیں۔ سندھ کی زمینوں کی لوٹ مار میں شدید اضافہ جنرل ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں ہوا جب غیر مقامی پولیس افسران کی زیر سرپرستی اور مارشل لاء کے سائے تلے غیر مقامی افراد کو سندھ کا وارث اور مالک بنایا گیا۔ ایوب خان کے دور حکومت میں زرعی اصلاحات کے نام پر بڑی تعداد میں سندھ کی زمین فوجی اور سول افسران میں تقسیم کی گئی اس دور میں شاید ہی کوئی جرنیل ایسا ہوگا جس نے سندھ کی زرعی اراضی حاصل نہ کی ہو۔ حقائق اور دستاویزاتی ثبوت کے مطابق سندھ کی جو زمین غیر مقامی افراد میں تقسیم کی گئی اس میں اکثریت سول اور فوجی افسران کی تھی۔ سائیں جی ایم سید (Struggle for New Sindh) میں زمین کی تقسیم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''سکھر بیراج دریائے سندھ پر قائم سب سے بڑا بیراج ہے جس کا زرعی کاشت کا رقبہ 2868562 ایکڑ پر مشتمل تھا۔ 1954ء کے آخر میں جب ون یونٹ قائم ہوا اس وقت صرف 642460 ایکڑ رقبہ بچا تھا۔ ون یونٹ سے قبل 2.2 ملین ایکڑ زمین کن لوگوں کو دی گئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر اتنا جانتے ہیں کہ یہ زمین غیر مقامی سندھیوں کو تقسیم کی گئی تھی۔ 1955 تا 1958 تک غیر سندھیوں کو سندھ کی قیمتی زمین کا 153620 ایکڑ رقبہ دیا گیا۔ سول اور ملٹری افسران اس میں سر فہرست رہے۔ اکتوبر 1958 سے مارچ 1963 تک ہر 100 میں سے 75 ایکڑ زمین غیر سندھیوں میں تقسیم ہوئی ملٹری افسران اور سول بیوروکریسی سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا فوجی ڈکیٹیٹر کے دور میں زرعی زمینوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا گیا۔ سکھر بیراج کی زیادہ تر زمین 1963ء میں دی گئی کل رقبہ میں سے 367000 ایکڑ زمین غیر

سندھیوں کو جبکہ 178000 ایکڑ زمین سندھیوں کو دی گئی جس کا مطلب ہے کہ سندھیوں کو آدھے سے بھی کم زمین دی گئی''

جنرل ایوب خان نے سندھ کی قیمتی زمینوں کو فوجی افسران اور من پسند سرکاری اہلکاروں میں کوڑیوں کے دام فروخت کیا اس کی ایک چھوٹی سی مثال سکھر بیراج اراضی کی بندر بانٹ ہے جنرل ایوب خان کے حکم پر فوجی افسران' بیوروکریسی اور من پسند افراد میں جو تقسیم کی گئی اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

بیگم فرخندہ بدرردنیازیدی 51 ایکڑ

بیگم محمد نواب خان 106 ایکڑ

ملک محمد رشید ولد کرنل میر باز خان 111 ایکڑ

ملک محمد نذیر خان ولد کرنل میر باز 81 ایکڑ

کرنل محمد افضل ولد کیپٹن شیر خان 89 ایکڑ

مسمات ثریا جبیں زوجہ وصی اللہ 60 ایکڑ

بیگم عاصم زوجہ ابوالنصیر کمشنر حیدرآباد 17 ایکڑ

نذیر احمد ولد قاضی محمد اسماعیل 29 ایکڑ

ریاض حسین ولد غلام محمد 48 ایکڑ

میر ولد محمد اسماعیل قاضی 48 ایکڑ

نذیر احمد ولد محمد اسماعیل قاضی 89 ایکڑ

طارق ولد نذیر احمد 16 ایکڑ

کرنل شیر خان ولد عبدالغفور 97 ایکڑ

کرنل شجاعت علی ولد اعظم علی 145 ایکڑ

محمد سعید ولد غلام محمد 36 ایکڑ

مسکین علی ولد محمد قاسم 24 ایکڑ

ممتاز الحق ولد چوہدری عبدالرحیم 141 ایکڑ

محمد زمان ولد محمد سعید خان 131 ایکڑ

صوبیدار میجر شیر محمد ولد میاں خان 66 ایکڑ

کافیہ ظفر زوجہ ابوظفر آئی جی پولیس 85 ایکڑ

کیپٹن محمد اشرف ولد اللہ بخش 50 ایکڑ

میجر محمد اکبر 56 ایکڑ

محمد نواز 85 ایکڑ

میجر محمد انور خان 26 ایکڑ

فتح خاتون زوجہ میجر اورنگزیب 70 ایکڑ

خالد زمان ولد میر افضل 16 ایکڑ

لطف علی شاہ 180 ایکڑ

محمد اختر میجر 101 ایکڑ

میر افضل 18 ایکڑ

محمد افضل میجر 99 ایکڑ

سانگھو خان 136 ایکڑ

میجر محمد اورنگزیب صالح محمد 47 ایکڑ

چمن آراء زوجہ عبدالوحید خان 13 ایکڑ
امیر لطف علی شاہ 184 ایکڑ
کرم الٰہی 35 ایکڑ
لطف علی شاہ 13 ایکڑ
محمد نقی میجر 13 ایکڑ
طاہرہ بیگم 204 ایکڑ
زبیدہ بیگم زوجہ کرنل محمد حنیف 212 ایکڑ
امداد علی شاہ 170 ایکڑ
علی اختر ولد میجر محمد علی 11 ایکڑ
محمد اختر 14 ایکڑ
زوجہ لیفٹیننٹ کرنل الطاف احمد خان 154 ایکڑ
... لیفٹیننٹ احمد خان 102 ایکڑ
صفیہ حسین شاہ 43 ایکڑ
عزیز الرحمٰن 37 ایکڑ
گلزار علی 18 ایکڑ
غلام سرور 7 ایکڑ
بابو خان 19 ایکڑ
لیفٹیننٹ کرنل شیر جنگ خان 244 ایکڑ
محمد حسن ولد جنرل محمد موسیٰ کمانڈر انچیف 231 ایکڑ
محمد ابراہیم ولد جنرل محمد موسیٰ خان 233 ایکڑ
مسماۃ اکرام زوجہ کیپٹن اکرم علی 140 ایکڑ
لیفٹیننٹ کمانڈر عبداللہ خان 15 ایکڑ

عبدالقادر ولد میجر غلام فاروق 120 ایکڑ
امجد محبوب 231 ایکڑ
میجر سی جی مہندہ 136 ایکڑ
گل زرین خان 43 ایکٹر
شہزاد محبوب 39 ایکر
اے آر اختر 136 ایکڑ
لیفٹیننٹ کمانڈر محمد افضل خان 25 ایکڑ
بیگم فرید عباسی اور دیگر 240 ایکڑ
جمشید بخاری 38 ایکڑ
محمد اکرم راولپنڈی 193 ایکڑ
مسماۃ فرخندہ بیگم 55 ایکڑ
عبدالکریم ولد عبدالرحیم 31 ایکڑ
محمد شریف ولد ڈاکٹر نبی بخش بلوچ 46 ایکڑ
میجر محمد اقبال 149 ایکڑ
میجر محمد بخش 200 ایکڑ
محمد ارشاد 71 ایکڑ
چمن آراء زوجہ عبدالوحید خان 142 ایکڑ
زاہدہ بیگم زوجہ انشاء اللہ خان 148 ایکڑ
زبیدہ زوجہ لیفٹیننٹ کرنل محمد حنیف 217 ایکڑ
محمود حسین 55 ایکڑ
سردار محمد عاشق 68 ایکڑ
جمعیت الدین 162 ایکڑ

نسیم جہاں خانم 166 ایکڑ
زوجہ لیفٹیننٹ کرنل مختار شاہ 166 ایکڑ
محمد احمد ولد لیفٹیننٹ جنرل افتخار احمد 166 ایکڑ
اسد امجد ولد لیفٹیننٹ جنرل افتخار احمد 166 ایکڑ
فاروق احمد ولد لیفٹیننٹ جنرل افتخار احمد 166 ایکڑ
مسماۃ شہزاد 110 ایکڑ
مسماۃ جان بی بی 113 ایکڑ
قادر بخش لارک ڈپٹی کلکٹر 158 ایکڑ
نادرہ بیگم زوجہ مبارک علی شاہ 130 ایکڑ
جان محمد 130 ایکڑ
زہرہ بیگم زوجہ ارشاد 115 ایکڑ
(حوالہ: سیاست دانوں کی قلابازیاں)

حر مجاہدین کی اراضی

قیام پاکستان کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ حر مجاہدین کو جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے صلہ میں نہ صرف ان کی اراضی واپس کردی جاتی 'انہیں انعام واکرام سے نوازا جاتا لیکن ان کے ساتھ الٹا سلوک کیا گیا۔ان کی اراضی سابقہ فوجیوں کی بحالی کے لئے مخصوص کر دی گئی یہ وہی سابقہ فوجی تھے جو جنگ عظیم دوئم میں برطانوی سامراج کے عزائم کی تکمیل کے لئے لڑے تھے۔مکھی جھیل کے علاقے میں ایک لاکھ پچاس ہزار ایکڑ اراضی فوجیوں کو قریب قریب مفت دے دی گئی۔انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کی املاک ان سے چھین کر غیر سندھی فوجیوں کے حوالے کردی گئیں بلکہ ان کی آبادکاری کا پورا خرچہ مرکزی حکومت اور بیشتر سندھ کی صوبائی حکومت کے ذمہ ڈال دیا گیا۔اس دوران حر جماعت نے مطالبہ کیا کہ مکھی کی اراضی اس کے اصل مالکوں کو لوٹادی جائے۔بالآخر 1957ء میں سندھ حکومت نے فیصلہ کیا کہ حروں کی آبادکاری کی جائے۔تاہم انہیں ان کی اصل زمین جواے ٹائپ کی بہتر زمین تھی نہیں دی گئی بلکہ انہیں سی ٹائپ زمین جو خراب حالت میں تھی دے دی گئی۔مغربی پاکستان اسمبلی میں 28 جنوری 1957ء کو غلام مصطفےٰ بھرگڑی نے وزیر خزانہ سے پوچھا کہ کیا حکومت اس سی ٹائپ زمین کو آباد کرنے کو تیار ہے تو نواب افتخار حسین خان ممدوٹ نے جواب دیا کہ حکومت کا کام زمین کو آباد کرنا نہیں ہے۔اس پر سوال کیا گیا کہ کیا فوج کو دی گئی زمین حکومت کو ملنے والی غیر ملکی امداد

سے آباد نہیں کی گئی۔ حکومت کی جانب سے جواب دیا گیا کہ جو غیر ملکی امداد فوج کو دی گئی تھی۔ اس کا سول انتظامیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ زمین کا یہ زرخیز حصہ صوبائی حکومت کے خرچ پر یعنی سندھی عوام کے ٹیکسوں سے آباد کیا گیا اور کچھ مرکزی حکومت کو ملنے والے غیر ملکی قرض سے جسے بمعہ سود پورے ملک کے لوگوں کو لوٹانا پڑا اس زمین کو آباد کر کے فوجی افسروں اور دیگر اہلکاروں کے حوالے کر دیا گیا اس طرح زمین کے اصل مالک غیر آباد شدہ اراضی پر دھکیل دیئے گئے۔

مکھی جھیل اور سندھ کے بیراجوں کی اراضی نوکر شاہی میں تقسیم کر کے مقامی آبادی کو زمین سے محروم رکھا گیا۔ ان زمینوں پر پنجاب سے ایسے زمیندار لا کر آباد کئے گئے جو با اثر تھے' افسر شاہی سے تعلق رکھتے تھے اور طاقت کے نشے میں چور تھے۔ یہ جاگیردار خود پنجاب کے عام آدمی سے جو رویہ اختیار کرتے ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ سندھی عوام کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہوں گے۔ ان لوگوں نے نہ صرف ناجائز طریقوں سے اراضی حاصل کیں بلکہ اسے سرکاری خرچ پر آباد کرایا ان لوگوں کے چک بجلی کی روشنی سے منور ہوئے' پختہ سڑکوں کا جال ان کی بستیوں کے گرد بچھا دیا گیا' ان کی زمینیں سارا سال جاری رہنے والی نہروں سے سیراب ہونے لگیں' ان کے کھیتوں کے نزدیک چینی کے کارخانے قائم کئے گئے جہاں وہ با آسانی گنے کی فصل پہنچا سکتے تھے' انہیں قرضے کی سہولتیں میسر ہوئیں جس سے یہ لوگ ٹریکٹر خرید سکتے تھے کھاد اور بیج وقت پر حاصل کر سکتے تھے' ان کے چک کے آس پاس جو سندھی آبادی تھی وہاں کی سڑکیں کچی تھیں اور نہروں میں پانی صرف چھ ماہ کے لئے آتا تھا کیونکہ ان کا کوئی ہم قوم افسر شاہی میں موجود نہ تھا انہیں نہ قرضے کی سہولت حاصل تھی اور نہ وہ وقت پر کھاد اور بیج خرید سکتے تھے۔ انہیں قدم قدم پر پنجاب سے آ کر بسنے والوں سے ایک ایسی دوڑ میں مقابلہ کرنا پڑا جہاں ان کی ٹانگیں پہلے سے باندھ دی گئی تھیں۔ پولیس افسر پنجابی تھے اسسٹنٹ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر پنجابی تھے مرکزی حکومت کے مختلف محکموں سے تعلق رکھنے والے بھی پنجابی تھے۔

کوٹری بیراج

کوٹری بیراج سندھ کا دوسرا بڑا بیراج ہے جو 1956ء میں مکمل ہوا جس کا قابل کاشت رقبہ 1653281 ایکڑ تھا جو حیدرآباد اور ٹھٹھہ پر مشتمل تھا جون 1958ء میں زمینوں کو تقسیم کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی بنائی گئی اس کمیٹی میں فیڈرل گورنمنٹ اور فوج کے افسران شامل تھے جبکہ مقامی افراد کو اس کمیٹی سے دور رکھا گیا جس سال کوٹری بیراج کی زمین کی فروخت شروع ہوئی اس سے دو سال قبل ہی کافی زمین فوجی جنرلوں کو الاٹ کردی گئی تھی۔

ہاریوں میں زمین کی تقسیم کے حوالے سے بیگم طاہرہ اعجاز حسین (ایم پی اے) نے (29 جنوری 1957ء) وزیر آبپاشی سے کوٹری بیراج کی زمین کے حوالے سے سوال کیا اس کے جواب میں متعلقہ وزیر قاضی فضل نے بتایا کہ کوٹری بیراج کی 100000 ایکڑز مین فوج کے لئے مختص کی گئی ہے جبکہ 25000 ایکڑ سے زیادہ زمین پہلے ہی الاٹ کردی گئی ہے کچھ الاٹیز کے نام درج ہیں۔

جنرل محمد ایوب خان	247 ایکڑ
میجر جنرل موسیٰ	250 ایکڑ
میجر جنرل محمد امراؤ	246 ایکڑ
بریگیڈیئر سعید احواس	242 ایکڑ
کرنل مظفر خان	153 ایکڑ
کرنل حیدر	130 ایکڑ

جن لوگوں میں زمین الاٹ کی گئی ان میں سب سے زیادہ پنجابی تھے دوسرے نمبر پر پٹھان تھے جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

پنجابیوں کو 107000 ایکڑز مین کوٹری بیراج میں الاٹ کی گئی۔

پٹھانوں کو 34000 ایکڑز مین کوٹری بیراج میں الاٹ کی گئی۔

جی ایم سید کے مطابق سندھ میں تعمیر ہونے والے تین بیراجوں سکھر، کوٹری اور گھی جھیل کی زمینوں میں سے 60لاکھ ایکڑ زمین پنجابیوں کے حوالے کردی گئی تھی۔

(بحوالہ Struggle for New Sindh)

ٹریکٹر اسکیم

ٹریکٹر اسکیم کے نام پر بھی سندھ کی زمین تقسیم کی گئی جن لوگوں کو زمین تقسیم کی گئی ان میں اکثریت غیر مقامی افراد کی تھی ٹریکٹر اسکیم مقامی افراد کو نہ دینے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ جن افراد (سول اور ملٹری افسران) کو یہ زمین الاٹ کی گئی ہے ان افراد کے پاس ایسے وسائل ہیں کہ وہ یہ زمین قابل کاشت بنا سکتے ہیں۔ مگر بعد میں حکومت سندھ کی جانب سے ٹریکٹر اسکیم کے تحت دی جانے والی زمین کے الاٹیز کو بے شمار فائدے دیئے جن افراد نے اس اسکیم سے بے شمار فائدے حاصل کیے ان میں آرمی، نیوی، پولیس اور سول افسران شامل تھے ان افراد نے یہ زمینیں اپنے ناموں کے علاوہ اپنے آباؤ اجداد کے نام سے بھی حاصل کیں ٹریکٹر اسکیم کے تحت تقریباً 257000 ایکڑ زمین الاٹ کی گئی تھی اس اسکیم کے تحت جن سول بیوروکریسی اور فوجی افسران نے زمینیں حاصل کیں ان میں چند بڑے فوجی افسران کے نام مندرجہ ذیل ہیں

نام اور عہدہ	زمین ایکڑز میں
میجر ایوب احمد خان	500
کرنل ضیاء اللہ	500
کرنل نورالٰہی (GHQ)	497
کرنل اختر حفیظ (سیالکوٹ کینٹ)	489
کیپٹن فیروز خان	243
میجر امیر گلستان	253
لیفٹننٹ کرنل بشیر	500

میجر خضر احمد	479
گروپ کیپٹن اے ایم مراد	496
کمانڈر ایم افضل خان	303
کرنل یعقوب	487
میجر غلام فاروق	458
میجر محمد لطیف	500
عباداللہ رحمان خان (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ملتان جیل)	487
ڈاکٹر جی اے اصغر	544
صبح صادق	401

(بحوالہ Struggle for New Sindh)

کمیٹی برائے استعمال اراضی

کمیٹی برائے استعمال اراضی کا دفتر لاہور میں قائم تھا سندھ کی زمین کی تقسیم اورالائمنٹ کے اختیارات پنجاب کی بیوروکریسی کے پاس تھے وہ جسے چاہتے اسے نواز دیتے تھے۔ اگست 1947ء سے 1948ء کے دوران لاکھوں ہندو سندھ میں جو جائیداد چھوڑ کر گئے تھے اس پر پہلا حق (متبادلہ قانون کے تحت) مہاجروں کا تھا مگر یہ زمینیں بھی وڈیروں اور غیر مقامی افراد جن میں اکثریت پنجاب کے بڑے جاگیرداروں کی تھی انہیں بانٹ دی گئیں۔

متحدہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجروں کے درمیان تفریق پیدا کی گئی مشرقی پنجاب سے آنے والے پنجابی کو اے کلاس مہاجر قرار دیا گیا جبکہ یوپی اور سی پی سمیت دیگر مسلم اقلیتی صوبوں سے آنے والے مہاجروں کو بی کلاس مہاجر کا درجہ دیا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو ''Agreed اور Non Agreed'' مہاجروں میں تقسیم کر دیا گیا پنجابی مہاجروں کو (Agreed) یا اے کلاس مہاجر کا درجہ دے کر کلیم کا پورا

معاوضہ دینا قانون قرار پایا جبکہ سی پی اور یو پی سے ہجرت کرنے والے مہاجروں کو اپنے کلیم کا آدھا معاوضہ دینا اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قانون ٹھہرا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مسلمانوں کے درمیان اے کلاس اور بی کلاس مہاجر کی تفریق پیدا کی گئی جبکہ سیکولر بھارت میں ہندو' سکھ مہاجروں (شرنارتھیوں) کے درمیان ایسا کوئی امتیاز اور فرق نہ رکھا گیا۔

پروفیسر عزیز الدین اپنی کتاب ''کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں'' میں لکھتے ہیں ''ایک ایسے صوبے میں جہاں لاکھوں کی تعداد میں بے زمین ہاری ایک جگہ سے دوسری جگہ دھکے کھاتے پھر رہے ہوں اور ان کا کوئی پرسان حال نہ ہو وہاں باہر سے آنے والے کسی شخص کو زمین الاٹ کرنے کا کوئی اخلاقی جواز باقی نہیں رہتا فوجی یا سول شاہی کے ارکان کو بیراج کے علاقوں میں زمین دینا قابل مذمت بات تھی جیسا کہ مغربی پاکستان اسمبلی کے ایک رکن نے پوچھا تھا کہ چونکہ فوج کی جرنیلی بھی کل وقتی کام ہے اور زمینداری کرنا بھی کل وقتی کام ہے تو بتایا جائے کہ آیا یہ جرنیل بیک وقت دونوں کام کیسے سرانجام دیں گے جرنلوں اور افسروں کو دوران ملازمت تنخواہیں ملتی ہیں اور بعد از ریٹائرمنٹ پنشن دی جاتی ہے انہیں اراضی کے عطیات سے نوازنے کا کیا جواز ہے؟ فوجی و سول افسر شاہی جس طرح سے ملک کی لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہوئی اس کی ایک مثال سندھ کے بیراجوں کی اراضی پر قبضہ بھی ہے۔ انہوں نے جس طریقے سے زمین حاصل کی اور بعد میں مقامی آبادی کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس نے نفرت کے جو بیج بوئے ان کی فصل اب پک کر تیار ہوئی۔ پنجاب کے خلاف آج سندھ میں جو غم و غصہ موجود ہے اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ فوجی و سول شاہی پر عائد ہوتی ہے جو زمین کی بے مثال حرص میں مبتلا تھی''۔

سندھ کی اراضی کی لوٹ مار میں پنجاب اس وجہ سے سرفہرست رہا ہے کہ زمین کی تقسیم کا کام بھی پنجابی بیوروکریسی کر رہی تھی۔ سندھ میں نئی آباد ہونے والی زمینوں کی تقسیم کے لئے ''زرعی ترقیاتی کارپوریشن'' کا ہیڈ آفس لاہور میں قائم کیا گیا اس کارپوریشن کے اہم افسران کا تعلق پنجاب سے تھا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد فوج سے ریٹائر ہونے والے افسران کو زرعی

ترقیاتی کارپوریشن کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کردیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق زرعی ترقیاتی کارپوریشن کے پاس زمین کی تقسیم کا 90 فیصد کام سندھ سے متعلق تھا مگر اس ادارے میں سندھ کے نمائندوں کو شامل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ یوں پنجاب کی نوکرشاہی کو سندھ میں بہت بڑی تعداد میں پنجابی آبادکاروں کو زمین تقسیم کرنے کا موقع مل گیا۔ جس کا انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ پنجاب کے جاگیرداروں اور پنجاب کی بیوروکریسی نے جس بڑے پیمانے پر سندھ کی زمینوں پر قبضہ کیا اور سندھی ہاریوں کو زمینوں سے بے دخل کیا اس حوالے سے وی ایف اگنیف ''سندھ تاریخ کے آئینے میں'' لکھتے ہیں۔ ''سندھ کو مغربی پاکستان میں ضم کرنے کے بعد ''کمیٹی برائے استعمال اراضی'' قائم گئی جس کے فرائض میں نئے زیرآب پاشی علاقوں میں تقریباً 2 لاکھ 40 ہزار ہیکٹر زمین کی تقسیم شامل تھی۔ اس زمین کو بے زمین اور کم زمین کسانوں کو دینے کے بجائے کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ زمین صرف ہاریوں کو ہی نہیں بلکہ کھاتے داروں، حقداروں، فوجی ملازمین، ریٹائرڈ (یا جلد ریٹائرڈ ہونے والے) سول ملازمین، نئے پاکستانی دارالحکومت اسلام آباد، منگلا ڈیم، قبائلی علاقوں (شمال مغربی سرحدی صوبہ) قلات اور کوئٹہ سے نقل مکانی کرنے والوں میں بھی بانٹی جائے گی۔ پنجابی افسروں پر مشتمل کمیٹی کے اراکین کو یہ اختیار تھا کہ وہ زمین کے حصول کی درخواست کو ضروری دستاویزی کی عدم موجودگی کا بہانے بنا کر رد کرسکتے تھے یا اس کے برخلاف زمین اسے دے سکتے تھے جسے ضروری خیال کرتے تھے۔ سندھی کاشتکاروں کے قانونی حقوق کو پامال کرتے ہوئے تقریباً تمام زمین فوجی اور سول ملازمین کو بلا معاوضہ یا رعایتی شرائط پر دے دی گئی۔ ایک ایکٹر کی اوسط قیمت 400 روپے رکھی گئی لیکن وہ بھی ادا نہیں کی گئی حالانکہ ہر زیرآبپاشی ایکٹر 4 ہزار سے 8 ہزار روپے تک پڑتا تھا۔ بنیادی طور پر 75 فیصد زمین چوہدریوں (پنجاب کے جاگیردار اور فارمر) کے ہاتھ میں چلی گئی۔ سندھ کی نئی آب پاشی کے علاقوں میں زمینیں زیادہ تر پنجابیوں (سرکاری ملازمین یا دیہات کے امراء) نے حاصل کیں''۔

جنرل محمد ایوب خان کے دورِ حکومت میں گدو کے زیرآبپاشی میں وسیع رقبہ فوجی اور

سرکاری افسروں نے حاصل کیا جن میں ایئر مارشل اصغر خان' ایئر مارشل نور خان' جنرل محمد ایوب خان کے رشتہ دار' عطاء اللہ جہانیاں اور ظفر اللہ پوشی جیسے فوجی افسران شامل تھے انہوں نے زرعی ترقیاتی بینک کے قرضوں سے بھی فائدہ اٹھایا۔''ہاریوں' مزارعوں اور چھوٹے کاشتکاروں کے ہاتھ کچھ نہ آیا بلکہ مزارعوں اور چھوٹے مالکوں کو ان کے کھیتوں سے بے دخل کیا گیا جہاں وہ کئی نسلوں سے کاشتکاری کررہے تھے ان کی رہائشی کوٹھڑیاں باغات اور کھیت بلڈوزروں سے تباہ کردیئے گئے۔ سکھر' شکارپور' اور جیکب آباد کے ضلعوں میں ہزاروں کاشتکار بے گھر ہو گئے اور اپنے آبائی مقامات کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے''۔ ان تاریخی حقائق سے اس الزام کی تردید ہوتی ہے جو اردو بولنے والوں پر لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے سندھیوں کی زمینوں پر قبضہ کیا بقول حنیف رامے:

> فوجیوں کو جو زمینیں ملتی ہے وہ خاص طور پر سندھ میں دی جاتی ہیں اور فوج میں پنجابیوں کی اکثریت ہے اس لئے سندھ کے لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ پنجابی آہستہ آہستہ ان کی زمینوں پر قابض ہوتے جارہے ہیں۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ سندھ میں مرکزی حکومت کے سول اور ملٹری ملازموں کو بھی بہت زمین دی گئی اور اس کی اکثر اردو بولنے والے مہاجرین پر مشتمل تھی مگر ہمارے سندھی بھائی اس زمینوں کو بھی پنجابی ہی کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

(حوالہ: پنجاب کا مقدمہ...... حنیف رامے)

مندرجہ بالا اعداد و شمار اور تاریخی حقائق اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ سندھ کی اراضی کی لوٹ مار میں مہاجر قطعی شریک نہیں تھے بلکہ سندھ کی اراضی پر بڑے پیمانے پر جاگیرداروں اور بیرو کریسی نے قبضہ کیا۔ سندھ کی باشعور عوام بھی اس بات کا بخوبی علم اور ادراک رکھتی ہے کہ پنجاب کے جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے ہی سندھ کی زمینوں اور کھیتوں پر بزور طاقت قبضہ کیا۔

☆☆☆☆☆

سندھ اور پنجاب کے درمیان پانی کی تقسیم کا تنازعہ

سندھ اور پنجاب کے درمیان پانی کی تقسیم کا تنازعہ بہت پرانا ہے۔ یہ تنازعہ اس وقت شروع ہوا جب 1921ء میں حکومت پنجاب نے دریائے ستلج ویلی کینال پروجیکٹ کے منصوبے بنانے شروع کیے اور ستلج پر ڈیم بنانے کی تجویز پر غور کیا۔ حکومت پنجاب نے پانچ دریاؤں کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ کے پانی کو بھی اپنے حق میں استعمال کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لئے حکومت پنجاب نے 1936 میں دریا سندھ پر کینال پروجیکٹ کا منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کے خلاف حکومت سندھ نے حکومت ہند کے سامنے اعتراضات اٹھائے۔ حکومت ہند اور بمبئی پریذیڈنسی نے دریائے سندھ پر کینال پروجیکٹ منصوبہ کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ سندھ آخری علاقہ ہے اس لئے کینال کی تعمیر سندھ کے لئے انتہائی خطرناک ہوگی۔ 1923ء میں سندھ نے دریائے سندھ پر سکھر بیراج کی تعمیر شروع کی۔ اس وقت بھی حکومت پنجاب نے اس منصوبے پر اعتراض کیا مگر حکومت ہند نے پنجاب کے اعتراض کو غیر ضروری اور غیر اہم سمجھتے ہوئے حکومت سندھ کو دریائے سندھ پر سکھر بیراج بنانے کی اجازت دے دی۔

حکومت پنجاب دریائے سندھ پر کینال اور نہریں بنانا چاہتا تھا۔ جب کہ حکومت سندھ ان منصوبوں کی شدید مخالفت کر رہی تھی اس تنازعہ کو حل کرنے کے لئے حکومت ہند نے

1934ء میں صوبوں میں پانی کی منصفانہ تقسیم کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی جسے اینڈرسن کمیٹی کا نام دیا گیا۔ 1939ء میں پنجاب نے دریائے ستلج پر بھاکڑ بند کا منصوبہ پیش کیا۔ حکومت سندھ نے اس منصوبے کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ حکومت سندھ کے احتجاج کے نتیجہ میں حکومت ہند نے 1941ء میں راؤ کمیشن قائم کیا۔ یہ کمیشن کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک جج اور دو چیف انجینئروں پر مشتمل تھا۔ جس نے 1942ء میں سندھ اور پنجاب کو مذاکرات کی دعوت دی۔

قیام پاکستان کے بعد پانی کی تقسیم کا مسئلہ اس وقت اور سنگین ہوگیا جب سندھ طاس معاہدے کے تحت 1960ء میں تین دریا ستلج' راوی اور بیاس بھارت کے ہاتھ فروخت کردیئے۔ پنجاب کے ان دریاؤں کو ہندوستان کے حوالے کرنے کی ابتدا تو اس ہی دن ہوگئی تھی جب پنجاب کا ایک وفد جس میں مرکزی وزیر خزانہ ملک غلام محمد' پنجاب حکومت کے دو وزراء سردار شوکت حیات اور میاں ممتاز دولتانہ سمیت ان محکموں کے سیکریٹریوں نے سندھ' سرحد اور بلوچستان کی اجازت اور مرضی معلوم کئے بغیر بھارت سے مذاکرات کئے اور تین دریاؤں کو بھارت کے حوالے کرنے پر رضامند ہوگئے۔

تین دریاؤں کو بھارت کے حوالے کرنے پر سندھ یہ کہنے پر حق بجانب ہے کہ ''جب پنجاب نے ہم سے مشورہ کئے بغیر راوی' ستلج اور بیاس کا سودا کرلیا تو پھر پنجاب کی غلطی کی ذمہ داری سندھ کیوں اٹھائے۔ سندھ کا موقف یہ بھی ہے کہ دریائے ستلج اور راوی پر سندھ کا بھی حق تھا۔ اس لئے پنجاب ان دریاؤں کا معاوضہ سندھ کو ادا کرے۔ سندھ کا موقف یہ بھی ہے کہ ون یونٹ کے دوران مرکزی حکومت اور پنجاب نے بھارت کے ساتھ سندھ طاس معاہدہ کیا اس میں سندھ اس لئے فریق نہیں ہے کہ نہ تو اس وقت سندھ کا وجود تھا اور نہ ہی اس معاہدے میں سندھ کو شریک رکھا گیا تھا۔ اس لئے سندھ اس معاہدے کا پابند نہیں ہے'' اس معاہدے میں پنجاب کے نمائندوں نے سندھ کی اجازت کے بغیر بھارت کو دریائے سندھ کا پانی ایک محدود مقدار میں استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اصولی طور پر پنجاب کے نمائندوں کو دریائے سندھ

کے حوالے سے کسی بھی قسم کا معاہدہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ یہی موقف حکومت سندھ نے اختر حسین کمیٹی اور فضل اکبر کمیٹی کے سامنے رکھا تھا۔

سندھ طاس معاہدے پر عمل درآمد کے لئے عالمی فنڈ قائم کرنے کا اعلان کیا گیا جس میں ورلڈ بینک کے ساتھ پاکستان' آسٹریلیا' کینیڈا' مغربی جرمنی' نیوزی لینڈ' برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ شامل تھا۔ ''اس معاہدے کے تحت پاکستان کے تین دریاؤں سے دستبرداری اور سندھ طاس معاہدے کے تحت تعمیر ہونے والے منصوبوں کے لئے بھارت نے 62,060,000 برطانوی پاؤنڈ اسٹرلنگ ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ 7 کروڑ ڈالر کی رقم پاکستانی حکومت نے پنجاب حکومت کو دی۔ باقی اخراجات پورے کرنے کے لئے آسٹریلیا نے 69 لاکھ 25 ہزار پونڈ' کینیڈا نے 2 کروڑ 21 لاکھ ڈالر' جرمنی نے 12 کروڑ 60 لاکھ مارک' نیوزی لینڈ نے 10 لاکھ پونڈ' برطانیہ نے 2 کروڑ 6 لاکھ 60 ہزار پونڈ اور امریکہ نے 17 کروڑ 70 لاکھ ڈالر فراہم کئے جبکہ عالمی بینک نے 9 کروڑ ڈالر کی منظوری دی تھی۔''

سندھ طاس معاہدے کے مطابق پنجاب کو مزید 10 سال تک اپنی ضرورت کے لئے ان دریاؤں سے پانی لینے کی اجازت مل گئی تا کہ ان دس سالوں میں پنجاب میں متبادل نظام قائم ہو سکے۔ اس طرح 1970ء تک پنجاب اپنے فروخت شدہ دریاؤں سے پانی حاصل کر سکتا تھا۔ سندھ طاس معاہدے کے تحت غیر ملکی امداد اور قرض کے عوض ملنے والی رقم سے ایک ڈیم دریائے سندھ پر ''تربیلا ڈیم'' اور دوسرا ڈیم دریائے جہلم پر ''منگلا ڈیم'' تعمیر کیا گیا۔ ان دونوں ڈیموں سے حاصل ہونے والے پانی کو سات لنک نہروں کے ذریعہ دریائے چناب اور راوی میں ڈال کر سنٹرل باری دوآب اور راوی ستلج کی نہروں کا متبادل نظام قائم کیا گیا۔ سندھ طاس معاہدے کے تحت ملنے والی رقم سے پنجاب میں نہری نظام کو بہتر کیا گیا۔ بلکہ دریائے سندھ اور دریائے جہلم سے پنجاب کے پانی کو پورا کیا گیا۔ سندھ طاس معاہدے کے تحت پنجاب اپنے دریاؤں کی فروخت کے بعد بھی فائدے میں رہا اور جب 1970ء میں پنجاب پر ستلج' راوی اور بیاس کے پانی کے

استعمال پر پابندی لگی تو حکومت پنجاب نے دریائے سندھ کا پانی حاصل کرنے کے لئے نئے آبی منصوبہ پیش کر دیے۔

سندھ طاس معاہدے کے بعد سندھ اور پنجاب کے درمیان پانی کے تنازعات کی ہیئت بدل گئی۔ حکومت پاکستان نے اس تنازعہ کو حل کرنے کے لئے 1968ء میں اختر حسین کمیٹی بنائی۔ 1970ء میں فضل اکبر کمیٹی تشکیل دی اور 1977ء میں انوار الحق کمیشن تشکیل دیا گیا 1983ء میں حلیم کمیشن بنایا گیا۔ 1968ء سے 1990ء تک سندھ، پنجاب اور سرحد پانی کی تقسیم کے فارمولے پر متفق نہ ہو سکے۔ 1991ء میں چاروں صوبوں کے وزیر اعلیٰ کی کوششوں اور باہمی رواداری کے مظاہرے کی وجہ سے چاروں صوبوں کے درمیان ایک معاہدہ منظور کیا گیا۔

1990ء کا آبی معاہدہ

وزیر اعظم نواز شریف نے پانی کی تقسیم کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے 12 جنوری 1991ء کو اسلام آباد میں مشترکہ مفادات کی کونسل کا اجلاس طلب کیا جس میں وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں، وزیر اعلیٰ سندھ جام صادق علی، وزیر اعلیٰ سرحد میر افضل خان اور بلوچستان کے وزیر اعلیٰ میر تاج محمد جمالی نے شرکت کی۔ چاروں صوبوں نے اپنے صوبوں کے وزراء اور ٹیکنو کریٹس کی خصوصی کمیٹی بنائی جس نے تمام مسائل پر غور و خوض کے بعد اپنی رپورٹ تیار کر کے اپنے صوبے کے وزیر اعلیٰ کو پیش کی۔ اس رپورٹ میں چاروں صوبوں کے وزراء اور ٹیکنو کریٹس نے مشترکہ طور پر پانی کی تقسیم کے نئے منصوبے پر باہم رضامندی کا اظہار کیا۔ 21 مارچ کو چاروں صوبوں کے وزیر اعلیٰ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت وزیر اعظم نواز شریف نے کی۔ مشترکہ مفادات کی کونسل نے پانی کی تقسیم کے مسودے کی منظوری دی۔ اس معاہدے کے تحت طے پایا:

پنجاب کو 55.94 ملین ایکڑ فٹ پانی ملے گا

سندھ کو 48.76 ملین ایکڑ فٹ پانی ملے گا

سرحد کو 08.76 ملین ایکڑ فٹ پانی ملے گا

بلوچستان کو 3.87 ملین ایکڑ فٹ پانی ملے گا

اس معاہدے کے بعد پنجاب کا کہنا تھا کہ اب وہ 30 لاکھ ایکڑ زائد زمین سراب کر سکے گا۔ جبکہ سندھ کا موقف تھا کہ طویل عرصے کے بعد اس کی ضرورت کے مطابق پانی ملنے کی نوید سنائی گئی ہے۔ اس معاہدے میں کراچی کے پانی کے حوالے سے شق نمبر 5 میں درج ہے کہ کراچی کی صنعتی اور شہری استعمال کے لئے پانی کی فراہمی یقینی بنائی جائے گی۔

1991ء کا معاہدہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ چاروں صوبوں کی مشترکہ مفادات کی کونسل نے کم از کم سندھ کے ایک دیرینہ مطالبے کو قومی سطح پر تسلیم کیا۔ اس معاہدے کے تحت پہلی بار منگلا ڈیم کے پانی پر صوبہ سندھ کا استحقاق بھی تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدے کے باوجود آج تک سندھ کو اس کے حصے کا پانی نہیں دیا گیا بلکہ گریٹر تھل کینال کے نام پر سندھ کے حصہ کا پانی پنجاب کی زمین سیراب کرنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔

گریٹر تھل کینال اسکیم، سندھ کا موقف

سرکاری دستاویزات کی روشنی میں سندھ کا موقف ہے کہ پنجاب میں زیرتعمیر "گریٹر تھل کینال" "آئین" ملکی قوانین، رولز آف بزنس اور پانی کے معاہدے 1991ء کے صریح خلاف ہے۔ 16 ستمبر 1991ء کو ہونے والے اجلاس میں سی سی آئی گریٹر تھل کینال اسکیم پر پنجاب کے موقف کو واضح طور پر رد کر چکی ہے۔

مذکورہ معاہدے کی کلاس 14 (اے) میں کہا گیا ہے کہ

"The system-wise allocation will be worked out separatelly, on ten daily basis and will be attached with this agrement as part and parcel of it"

مذکورہ معاہدے کی کلاس 14 (بی) میں کہا گیا ہے کہ

"The record of actual average system users for the period 1997-82, would from the guide line for developing a furture regulation pattern"

یعنی کلاز 14 (اے) میں کہا گیا ہے کہ ہر سسٹم کے لئے ہر 10 روز کے لئے پانی مخصوص کیا جائے گا اور اس طرح تیار کئے جانے والے اشینٹ پانی کے مذکورہ معاہدے کا حصہ ہوں گے۔ اسی طرح کلاز (بی) میں کہا گیا ہے کہ 1977ء سے 1982ء تک جو سسٹم موجود تھے' ان کے لئے مخصوص کئے گئے پانی کے اعداد و شمار کی روشنی میں مجوزہ ''ٹین ڈیلیز'' تیار کی جائیں گی۔ جب 1977ء سے 1982ء کے عرصے کے دوران گریٹر تھل کینال کا کوئی وجود ہی نہیں تھا تو 1991ء کے دوران تیار کی جانے والی ''ٹین ڈیلیز'' میں کس طرح ''گریٹر تھل کینال'' کو شامل کر کے اس کے لئے پانی مخصوص کیا جا سکتا ہے؟

سندھ کے آبپاشی کے ماہرین گریٹر تھل کینال اسکیم کے خلاف اپنے موقف کے حق میں آبی معاہدے 1991ء کے تین مزید کلاز 3' کلاز 12 اور کلاز 7 کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ کلاز 3 میں کہا گیا ہے کہ ''این ڈبلیو ایف پی اور بلوچستان کے وہ پروجیکٹ جو زیر تکمیل ہیں' ان کو "existing uses" قرار دیتے ہوئے ان کے لئے پانی کا کوٹہ مخصوص کیا جاتا ہے۔

آبی معاہدے پر دستخط کرنے والے اگر کسی طور پر بھی گریٹر تھل کینال کے لئے اس معاہدے کے تحت پانی مخصوص کرنا چاہتے تو اس کلاز میں بلوچستان اور این ڈبلیو ایف پی کے ساتھ پنجاب کے بھی ایسے پروجیکٹس کا ضرور ذکر کرتے۔ آبی معاہدے 1991ء کے کلاز 12 میں کہا گیا ہے کہ ''ایل بی او ڈی کی ضروریات حصے داری کے منظور شدہ فارمولا کے تحت سیلابی پانی سے پوری کی جائیں گی''

پنجاب کا موقف ہے کہ گریٹر تھل کینال کے لئے جزوی طور پر سیلابی پانی سے

ضروریات پوری کی جائیں گی۔ سندھ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ آبی معاہدے میں ایل بی او ڈی کا تو ذکر ہے جبکہ گریٹر تھل کینال کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا سیلابی پانی سے سب سے پہلے ایل بی او ڈی کی ضروریات پوری کرنی ہوں گی اس کے بعد ہی کسی دیگر اسکیم کی ضروریات پر غور ہو سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیلابی پانی سے ایل بی او ڈی کے لئے تو کوئی پانی مخصوص نہیں کیا گیا جبکہ گریٹر تھل کینال کی تعمیر سیلابی پانی کے ایک حصے کو بنیاد پر کی جارہی ہے۔ آبی معاہدے کے کلاز 7 میں کوٹری بیراج سے نیچے پانی چھوڑنے کا اصولی فیصلہ کیا گیا ہے' اس سلسلے میں اسٹیڈیز کرانے کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے۔ سندھ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جب تک یہ اسٹیڈیز نہیں ہوتیں اور ان کی روشنی میں یہ فیصلہ نہیں ہوتا کہ کوٹری بیراج کے نیچے کتنی مقدار میں پانی چھوڑا جائے' دریائے سندھ میں کوئی مزید اسٹرکچر تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ بات آبی معاہدے کے کلاس 7 کی خلاف ورزی ہوگی۔ پنجاب کا موقف ہے کہ سی سی آئی گریٹر تھل کینال کی منظوری دے چکی ہے جبکہ سندھ کے ماہرین کا موقف ہے کہ 16 ستمبر کو ہونے والے اجلاس میں سی سی آئی گریٹر تھل کینال کے بارے میں پنجاب کے موقف کو رد کر چکی ہے۔

16 ستمبر کو سی سی آئی کے اجلاس کے Minutes کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان منٹس کے مطابق پنجاب نے مندرجہ ذیل موقف اختیار کیا:

"Punjab expressed the view Water Accord was a comprehensive package and it would not be appropriate to take up any one clause in isolation. The data provided in the from of 10 daily system wise allocations by the Provinces should not be taken into account in isolation without protecting existing uses and deciding on future storages"

ان منٹس میں سندھ کا جو موقف ریکارڈ کیا گیا ہے' وہ اس طرح ہے:

"Government of Sindh expressed the view that the providing data on 10-daily average allocations on a system-wise basis was an integral part of the Accord it would not be appropriate to link other issues as development of future storages etc with this provision of the Accord. The Accord should be religiously implemented and there should be openness in dealing with all issues."

سی سی آئی کے مذکورہ اجلاس کے منٹس کے مطابق' سی سی آئی نے جو فیصلہ کیا' اس کا متن ہے:

"The council of common interests authorised the 10-daily seasonal system-wise adjusted allocations (excludin flood flows and future storages) provided by the Provinces (annexure-II page 5 as revised) to become part and parcel of the Water Accord."

مذکورہ فیصلے کا متن پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سی سی آئی نے ''سیلابی پانی اور مستقبل میں اسٹوریج'' کی گنجائش کو الگ کر کے باقی ٹین ڈیلرز کی منظوری دی ہے۔ واضح رہے کہ گریٹر تھل کینال اسکیم کے لئے پانی کی گنجائش سیلابی پانی سے نکالی گئی ہے جبکہ سی سی آئی نے واضح طور پر ایسی کوئی اجازت نہیں دی۔ علاوہ ازیں' سی سی آئی کے مذکورہ فیصلے کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ ''ہم نظر ثانی شدہ ٹین ڈیلیز کی منظوری دیتے ہیں'' آج تک نہ پنجاب نے اور نہ واپڈا نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ ٹین ڈیلیز کون سی ہیں جو سی سی آئی میں پنجاب نے پیش کی تھی اور وہ ٹین ڈیلیز کون سی ہیں جو سی سی آئی نے نظر ثانی شدہ شکل میں منظور کیں۔ سی سی آئی کے مذکورہ اجلاس کے بعد پنجاب نے شور شروع کر دیا کہ سی سی آئی نے ان ٹین ڈیلیز کی منظوری دے

دی جن میں گریٹر تھل کینال کے لئے پانی مخصوص کیا گیا ہے۔

سندھ کے ماہرین نے اس بات کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے کہ جن ''ٹین ڈیلیز'' میں گریٹر تھل کینال کے لئے پانی مخصوص کیا گیا ہے۔ اس میں جتنا پانی گریٹر تھل کینال کے لئے مخصوص کیا گیا ہے اور اس میں جتنا پانی گریٹر تھل کینال کے لئے مخصوص رکھایا گیا ہے اتنا پانی پنجاب کے دیگر بیراجوں سے کٹوتی کر کے پورا کیا گیا ہے۔ سندھ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ پنجاب ایسا نہیں کرسکتا' یہ بات معاہدے کے بھی خلاف ہے اور ناقابل عمل بھی ہے کیونکہ جو زمینیں پانی لے رہی ہوتی ہیں ان کا پانی پنجاب روک نہیں سکتا۔ اگر ایسا ہوا تو پنجاب کے دیگر علاقوں میں ایسا ریجی ٹیشن ہوتا جس کا پنجاب کی کوئی حکومت مقابلہ نہیں کرسکتی لہٰذا سندھ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ پنجاب کا یہی پلان ہے کہ جو پانی گریٹر تھل کینال کے لئے دیا جائے گا وہ سندھ کے حصے سے کٹوتی کر کے پورا کیا جائے گا۔

سندھ کے ماہرین نے گریٹر تھل کینال اسکیم پر ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ گریٹر تھل کینال چشمہ' جہلم لنک سے نکالا جا رہا ہے۔ جبکہ وہ کینال نہیں' محض ایک لنک ہے۔ ماضی میں سندھ اور پنجاب میں ایسے دو معاہدے ہو چکے ہیں جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ چشمہ جہلم لنک کو حکومت سندھ سے پیشگی اجازت کے بغیر نہیں چلایا جائے گا اور جیسے ہی حکومت سندھ مطالبہ کرے گی اس لنک کو فوری طور پر بند کر دیا جائے گا۔ بہر حال' یہ اور بات ہے کہ اب حکومت پنجاب ان معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کئی برس سے چشمہ جہلم لنک کو سارا سال آپریٹ کر رہی ہے۔ سندھ کے ماہرین نے اس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ گریٹر تھل کینال اسکیم شاید پاکستان کی پہلی اسکیم ہے جس کی ابھی تک فزیبلٹی کی تیاری کا کام بھی شروع نہیں ہوا جبکہ اس پر کافی عرصے سے دن رات ''فاسٹ ٹریک'' اسکیم قرار دے کر کام چل رہا ہے۔ ممتاز دانشور ایم بی نقوی سندھ میں پانی کی قلت کے اسباب کی بنیادی وجہ کے بارے میں کہتے ہیں'' پنجاب کی سرسبز وشادابی' زراعت میں اضافہ اور وہاں کی آبادی میں مسلسل اضافہ کی وجہ سے سندھ کو قلت آب کا سامنا ہے''

کالا باغ ڈیم

کالا باغ ڈیم کی تعمیر پر ڈیم کے بین الاقوامی ماہر انجینئر ڈاکٹر فلپ ولیم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا'' کالا باغ ڈیم خیالات اور سوچ و بچار کے دیوالیہ پن کا ایک اظہار ہے جس میں پاکستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی کا مرکزی محکمہ اور بیوروکریٹ شامل ہیں۔ پاکستانی عوام پر کالا باغ ڈیم کے نظام کو زبردستی تھوپنا ٹھیک نہیں کیونکہ یہ نظام نقائص سے بھرپور ہے۔ اس طرح کے قلیل المدتی فوائد والے منصوبے کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو لازمی بھگتنا پڑے گا۔'' آبپاشی اور ڈیم انجینئرنگ کے ایک اور بین الاقوامی ماہر آر۔ میمن کے مطابق کالا باغ ڈیم کی تعمیر ممکن ہی نہیں کیونکہ کالا باغ ڈیم کے لئے پانی کا مطلوبہ حجم ہی دستیاب نہیں۔ ان کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق اونچے ڈیم بنانے کے نقصانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہوا ہے کہ ڈیم کے نشیب میں ہونے والے نقصانات ہمیشہ اندازوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں جیسا کہ امریکہ کے مشہور ہوور ڈیم اور پھر خود پاکستان میں تربیلا کے سلسلے میں دیکھنے میں آیا۔ سندھ کے ایک اور تجربہ کار اور ممتاز انجینئر 'جی' کے' سومرو نے دریائے سندھ کے پانی کے کل وسائل کا تجزیہ کر کے کالا باغ ڈیم کو بالکل غیر موزوں ثابت کیا ہے۔ سومرو کے مطابق 1986ء تا 1923ء یعنی کہ گزشتہ 64 برسوں کے اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دریا میں پانی کے بہاؤ کا سالانہ اوسط 142,24 ملین ایکڑ فٹ ہے۔ خرچ کی تفصیل کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ڈیم میں ذخیرہ کرنے کے لئے دریا میں پانی بچتا ہی نہیں تو اس صورت میں اس قدر گراں سرمایہ کاری قومی خزانے پر بالکل ناجائز بوجھ ہے۔ دریا میں پانی کے بہاؤ کی سالانہ اوسط 142,24 ملین ایکڑ فٹ میں سے صرف ایک ملین ایکڑ فٹ سالانہ پانی باقی بچتا ہے۔ جبکہ کالا باغ ڈیم میں ذخیرہ کرنے کی گنجائش 7.77 ملین ایکڑ فٹ بتائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے سالانہ ایک ملین ایکڑ فٹ پانی بمشکل ڈیم میں جائے گا۔ اس صورت میں واپڈا کا یہ دعویٰ کہ وہ

3600 میگاواٹ بجلی کالا باغ ڈیم سے پیدا کرے گا' ایک خواب سے زیادہ اس دعوٰی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کالا باغ ڈیم سے 3600 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کا خواب دیکھنا خودفریبی اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ سندھ کے ایک اور زرعی ماہر پی' کے' شاہانی کا موقف ہے کہ کالا باغ ڈیم سے 2400 میگاواٹ بجلی اور 7 ملین ایکڑ فٹ پانی حاصل کرنے کی قیمت کیا ادا کرنا پڑے گی اور اس کی تکمیل تک افراط زر کے باعث لاگت میں کتنا اضافہ ہوگا۔ کالا باغ ڈیم بنا کر پاکستان کرہ ارض پر ایک عجیب وغریب ڈیم بنانا چاہتا ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ یہ دنیا کا واحد ڈیم ہوگا جس سے پانی کے ساتھ ساتھ مٹی بھی نیچے گرے گی۔ جس سے بجلی پیدا کرنے کی ٹربائن متاثر ہوں گے۔ اسے تبدیل کرنے سے چالو اخراجات میں اضافہ ہوگا۔ بجلی کی قیمت بھی بڑھ جائے گی۔ دریائے سندھ پاکستان کے اتحاد کی علامت ہے۔ ہم اتحاد کی علامت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ڈیم بنا کر اسے تباہ کرنا نہیں چاہتے۔''

کالا باغ ڈیم کے اخراجات

کالا باغ ڈیم دنیا کا واحد ڈیم ہے جس کی تعمیر سے قبل ہی ملکی اور غیر ملکی ماہرین اس آبی منصوبہ کی مخالفت کر رہے ہیں سندھ اور سرحد کو پہنچنے والے نقصانات کی بنیاد پر دونوں صوبوں نے اس منصوبے کو مسترد کر دیا ہے۔ اس کے باوجود مرکز کی جانب سے مسلسل اس متنازعہ منصوبہ کی تعمیر کے لئے رقم مختص کی جاتی رہی ہے۔ کالا باغ ڈیم منصوبے کا ایک بنیادی نقص یہ بھی ہے کہ اس کی تعمیر کے اخراجات پر مختلف حکومتوں نے مختلف اعداد وشمار پیش کئے۔ ڈیم کی تعمیر پر سرکاری ذرائع کے مطابق 7 ارب ڈالر خرچ آئیں گے جبکہ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق اور غیر ملکی ماہرین کے مطابق اس ڈیم پر 10 ارب ڈالر سے بھی زیادہ خرچ ہو سکتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت سے نواز شریف کے دور حکومت تک کالا باغ ڈیم پر جو رقم مختص کی جاتی رہی اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے

جنرل ضیاءالحق	1977-87	853,52 ملین
پیپلز پارٹی	1988-89	36,57 ملین
پیپلز پارٹی	1989-90	34,82 ملین
مسلم لیگ	1991-92	19.98 ملین
مسلم لیگ	1992-93	5.42 ملین
پیپلز پارٹی	1993-94	2.81 ملین
پیپلز پارٹی	1994-95	3.14 ملین
پیپلز پارٹی	1995.96	2.40 ملین
پیپلز پارٹی	1996.97	1.19 ملین
مسلم لیگ	1997-98	2.71 ملین

پیپلز پارٹی نے سیاست میں ہمیشہ دوہرا معیار اپنایا۔ وہ بات غریبوں کی کرتی ہے مگر اسمبلیوں کے ٹکٹ جاگیرداروں اور وڈیروں کو دیتی ہے۔ وہ طبقاتی انصاف کی بات کرتی ہے مگر سندھ میں دیہی اور شہری تفریق کی خالق ہے۔ کالا باغ ڈیم پر بھی پیپلز پارٹی نے دوہرا معیار اختیار کیا۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کالا باغ ڈیم کے خلاف شور مچاتی ہے مگر مرکز اور پنجاب میں بےنظیر سمیت پیپلز پارٹی کالا باغ ڈیم کی حمایت کرتی ہے۔ پیپلز پارٹی نے اپنے دور حکومت میں کالا باغ ڈیم پر کل 79.74 ملین روپے مختص کیے۔ بےنظیر کے برعکس نواز شریف نے اپنے دور میں 29.30 ملین روپے رکھے۔ 1987-88ء میں غلام اسحاق خان نے 51.66 ملین روپے ڈیم کے لئے رکھے۔ ایک اندازے کے مطابق وفاقی بجٹ اور واپڈا کے بجٹ سے 1976-98ء تک کالا باغ ڈیم پر 1.2 بلین روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ سندھ اور سرحد شروع دن سے کالا باغ ڈیم کی مخالفت کر رہے ہیں۔ صوبوں کی رضامندی اور اجازت کے بغیر کالا باغ ڈیم کی تعمیر ملکی مفاد میں ہے اور نہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے نام پر قومی دولت کا استعمال ملکی معیشت کیلئے بہتر ہے۔

سندھ اور سرحد کا موقف

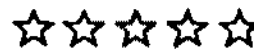
سندھ اور سرحد کالا باغ ڈیم کی مخالفت اصولوں کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔ ان دونوں صوبوں کا موقف ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کی صورت میں دونوں صوبوں کی معیشت' زراعت اور زمین کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ سرحد کو اندیشہ ہے کہ اس کی ہزاروں ایکڑ زرخیز زمین زیر آب آ جائے گی اور لاکھوں افراد بے گھر ہو جائیں گے جبکہ سندھ کا موقف ہے کہ کالا باغ ڈیم بننے سے سندھ ریگستان بن جائے گا۔ سندھ اور بلوچستان سمجھتے ہیں کہ کالا باغ ڈیم دونوں صوبوں کے لئے تباہی اور بربادی لے کر آئے گا۔ سندھ کا یہ عزم ہے کہ جب تک سندھ کے حصے میں آنے والے پانی کے ایک ایک قطرے کے تحفظ کو یقینی نہیں بنایا جاتا' کسی حکومت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ پانی کی تقسیم کے بغیر ڈیم تعمیر کرے۔ صوبہ سرحد کے لیڈر خان عبدالولی خان نے صاف کہہ دیا ہے کہ کالا باغ ڈیم کا مسئلہ پختون عوام کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس بند کی تعمیر سے علاقے کی ریلوے لائن' گرانڈ ٹرنک روڈ اور مردان کا اسکارپ پروگرام کا علاقہ زیر آب آ جائے گا۔ اس ڈیم کی تعمیر کی صورت میں ڈھنی اور توت کے مقام پر دریافت ہونے والے تیل کے ذخائر بھی زیر آب آ جائیں گے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کتنی رقم خرچ ہوگی' اس پر کسی نے نہیں سوچا۔

پاکستان کی یہ بدبختی رہی ہے کہ یہاں عوام کی حاکمیت اور ان کی مرضی کو کبھی بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ یہاں حکومتیں بھی محلاتی سازشوں کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں۔ اسی طرح کالا باغ ڈیم کا منصوبہ بھی حکومتی فائلوں میں محبوس رہا اور قوم کو اعتماد میں لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی جب یہ منصوبہ خفیہ محلاتی تہہ خانوں سے نکالا گیا تو پورے ملک میں عموماً اور بالخصوص سندھ اور سرحد نے اس منصوبے کے نقصان کے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ مکمل غور و خوص کے بعد اصولی طور پر اور ٹیکنیکل بنیاد پر اس کی مخالفت کی گئی۔ سندھ کا موقف ہے کہ ”چونکہ پنجاب کے حکمرانوں نے قومی خیانت کر کے اپنا پانی ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ اب وہ سندھ کے پانی پر بند

باندھ کر اسے پانی سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔کوئی خوددار قوم اس کی اجازت نہیں دے گی۔اب پنجاب سے اس طرح کی آوازیں آ رہی ہیں کہ 50ہزار افراد کو کالا باغ بند کے دفاع کے لئے منظم کیا جا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ اب یہ مسئلہ افہام وتفہیم کی حدود سے نکل کر محاذ آرائی کی طرف جا رہا ہے۔ پنجاب کی جانب سے بالکل ننگی جارحیت کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے جاگیرار، سرمایہ دار اور نوکر شاہی بیرونی طاقتوں کے اشاروں پر کھیل رہے ہیں۔ملک کی سالمیت اور وحدت کو ایک بار پھر داؤ پر لگایا جا رہا ہے اور ویسے ہی حالات پیدا کئے جا رہے ہیں جس طرح مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کرنے کے لئے کئے جا رہے تھے۔'' کالا باغ ڈیم سے سندھ اور سرحد کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اس کے بارے میں پنجاب نے محدود انداز میں اندازے لگائے ہیں۔ پنجاب چھوٹے صوبوں کو ہونے والے نقصان کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف کالا باغ ڈیم چاہتا ہے تا کہ وہ کالا باغ ڈیم کی بنیاد پر سندھ اور سرحد کی شہ رگ پر اپنا ہاتھ رکھ سکے۔ پنجاب کا موقف ہے کہ دریائے سندھ اول پنجاب کی سرزمین سے گزرتا ہے۔اس لئے اس پر پہلا حق پنجاب کا ہے۔ پنجاب کے اس موقف کے جواب میں مولانا مفتی عبدالوہاب چاچڑ قرآن وسنت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج ص 99 میں فرمایا ہے کہ (ترجمہ): کسی کی نہر کسی کی زمین سے گزرتی ہو تو اسے اس کو روکنے کا کوئی حق نہیں۔فتاوے عالمگیری میں بھی واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ ''اوپر والوں کے استحقاق کا یہ دلیل مسترد ہے کہ یہ نہر اول ہماری زمین سے گزرتی ہے'' حضرت محمد بن مسلمہؓ کی زمین سے کسی کا پانی گزرتا تھا اس نے منع کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر اس پانی کے گزرنے کے لئے تیرے پیٹ کے سوا دوسری جگہ نہ ہوگی تو تیرے پیٹ پر سے اس پانی کا گزر کراؤں گا۔''

پنجاب کا یہ بھی موقف ہے کہ دریائے سندھ کا زائد پانی سمندر میں گر کر ضائع ہو جاتا ہے۔ ڈیم بنانے سے وہ پانی محفوظ ہو کر کارگر ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں سندھ کا موقف ہے کہ اہل پنجاب کو بھی معلوم ہے کہ سمندر میں اگر میٹھے پانی کی معقول مقدار نہیں پڑے

گی تو اس کی سطح بلند ہو جائے گی جس سے شہر غرق ہو جائیں گے اور زیر زمین پانی نمکین ہو جائے گا۔ اس لئے دنیا بھر میں پانی کے معاہدوں میں بیراجوں کی ضرورت اور پینے کی ضرورت کے علاوہ سمندر کی ضرورت کا الگ حصہ رکھا جاتا ہے۔ پنجاب نے سمندر میں ضائع ہونے والا شوشہ عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے چھوڑا ہے۔



وطن عزیز کو دولخت کرنے والے

مشرقی پاکستان' ارباب اقتدار کی نااہلی' عدم توجہ اور غیر حقیقت پسندانہ خواہشات' جاگیرداروں کی ہٹ دھرمی اور ریشہ دوانیوں کے باعث بنگلہ دیش کا روپ دھار کر عالمی نقشہ پر نمودار ہوا۔ سقوط ڈھاکہ کے المیہ کے فعال کردار میں فوجی حکومت بھی شامل تھی جو اس وقت پاکستان میں برسر اقتدار تھی۔ اس حکومت کے سربراہ جنرل یحییٰ خان تھے۔ حکومت کی حکمت عملی مرتب کرنے والوں میں جنرل ٹکا خان اور جنرل نیازی جیسے لوگ شامل تھے' جنرل نیازی جسے اخباری دنیا میں ''ٹائیگر نیازی'' کہا جاتا تھا لیکن وہ ڈھاکہ کے میدان میں ''گیدڑ نیازی'' ثابت ہوا۔ ان سب کی حاکمانہ غلطی یہ تھی کہ وہ بنگالی قوم کو ریاستی طاقت کے بل بوتے پر انہیں ان تمام حقوق سے محروم رکھنا چاہتے تھے جو انہیں برابری کی بنیاد پر ملنا چاہئے تھے۔ اگر فوجی حکمران' نوکر شاہی اور جاگیرداروں کا ٹولہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتا' عوامی رائے کا احترام کرتا' انتخابی نتائج کے تقدس کو ملحوظ خاطر رکھتا تو یہ سانحہ ہرگز رونما نہ ہوتا اور قائداعظم کا پاکستان آج بھی قائم ہوتا۔

سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں برصغیر کی ایک بڑی قوم کے زوال کے عبرتناک داستان بھی موجود ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے زوال کی وجوہات کا منظر عام پر لانا پاکستانی قوم کی آئندہ بقاء اور ارتقاء کے لئے ناگزیر ہے۔ 33 برس گزر جانے کے بعد بھی ہم نے مسلمانوں کی تاریخ کی اس شکست عظیم سے کوئی سبق نہیں لیا۔ حمود الرحمان کمیشن نے جن لوگوں کو پاکستان کے مشرقی بازو کو توڑنے کا ذمہ دار قرار دیا تھا ان میں کسی کی مذمت نہ سرکاری طور پر کی گئی تھی' نہ انہیں سزا دی گئی بلکہ

اس سانحہ کے بعض کردار تو پاکستان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اپنی شکست اور ہزیمت کو پوشیدہ رکھنے اور اپنے کردار کو منور کرنے کی سعی کرتے رہے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد اندرا گاندھی نے لال قلعہ دہلی میں بڑے افتخار سے کہا تھا کہ ''انہوں نے اپنے ہزار برس کے دکھ کا مداوا کرلیا ہے اور دو قومی نظریہ کو خلیج بنگال میں غرق کردیا ہے۔''

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قیام پاکستان کے لئے بنگالی مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر قربانیاں دی تھیں۔ مگر اس کا صلہ ریاستی تشدد' معاشی اور ساجی محرومی' اقتدار میں عدم شرکت اور ذہنی غلامی کی صورت میں ملا۔ سید احمد شہید کے خلفاء نے بنگال میں دین کی اشاعت اور تبلیغ کا بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ان کے خلیفہ مولوی سید کرامت علی جونپوری تھے' جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری 30 برس بنگال میں گزارے۔ ان کا قیام مستقلاً ایک کشتی میں رہتا تھا۔ نواب عبداللطیف نے 1864ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی۔ پھر جسٹس امیر علی نے 1877ء میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس طرح سارے ہندوستان میں بنگالی مسلمانوں نے سیاسی جدوجہد میں پیش قدمی کی۔

اس سرزمین کے فرزند شیر بنگال مولوی فضل الحق نے منٹو پارک کے سبزہ زار پر منعقد مسلمانوں کے اجلاس عام کے سامنے اور قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں قرارداد پیش کی اور مسلمانوں کی علیحدہ آزاد اور خودمختار ریاست کا مطالبہ قرارداد پاکستان کی صورت میں پیش کیا۔ انہوں نے اس قرارداد کے حق میں دلائل کے انبار لگا دیئے۔ یہ قرارداد ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ برطانوی سامراج اور کانگریس کو مسلمانوں کے اس مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

1946ء میں برٹش انڈین گورنمنٹ کے منظم کردہ مرکزی اور صوبائی انتخابات کے نتائج کے ذریعہ اس سوال کا فیصلہ ہونا تھا کہ کیا برصغیر کے مسلمان جیسا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا کہنا تھا' مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے کی حمایت کرتے ہیں۔ مگر ان انتخابات میں مسلم لیگ

پنجاب میں حکومت نہ بنا سکی۔ سرحد میں کانگریس نے مسلم لیگ کو شکست دے کر کانگریسی حکومت بنائی۔ بلوچستان میں اس وقت محض چیف کمشنر کا عہد تھا اور وہاں کوئی انتخاب نہیں ہوئے تھے۔ مغربی حصے میں سندھ واحد صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ صرف بنگال میں ایسا ہوا کہ اس صوبے کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کو اکثریتی فتح دلائی اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کی 97 فیصد سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ جس کی وجہ سے اس نے وہاں آسانی سے حکومت بنالی۔ بنگال میں مسلم لیگ کی بے پناہ کامیابی نے مسلم لیگ کے نمائندہ تشخص کی تشکیل اور اس کے اس دعوے میں کہ وہ مسلمانوں کی واحد ترجمان ہے اور مطالبہ پاکستان منظور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

قائد ملت لیاقت علی خان کی زندگی تک ملک کا نظم و نسق مشکلات اور دشواریوں کے باوجود کسی نہ کسی طرح چلتا رہا مگر ان کی شہادت کے بعد جاگیردار اور نوکر شاہی اقتدار کی کشمکش میں گرفتار ہوگئی اقتدار کی رسہ کشی کے شائقین جوڑ توڑ' سازشوں اور ریشہ دانیوں کی سیاست میں مبتلا ہوگئے۔ جاگیردار اور نوکر شاہی وطن عزیز کے سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔ اقتدار پرست ٹولے نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو انتظامیہ میں شریک کرنے سے گریز کیا۔ جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں شدید احساس محرومی نے جنم لیا۔ مغربی پاکستان کے حکمرانوں کے نار وا سلوک نے مشرقی پاکستان کی عوام کو صوبائی خود مختاری کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ انہیں یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی کہ پاکستان کے وفاق میں ان کا مستقبل غیر محفوظ ہے۔ سب سے اہم واقعہ جس سے مشرقی پاکستانیوں کو یقین ہوگیا کہ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے اور اپنی حفاظت خود کرنا ہے وہ ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ تھی' اس وقت تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان کی طرف سے ہوگا اور بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں مشرقی پاکستان پر دباؤ کم کرنے کے لئے بھارت کے خلاف بڑا حملہ شروع کر دیا جائے گا۔ اس مفروضہ پر مشرقی پاکستان کا دفاع بہت ہلکا رکھا گیا تھا لیکن 1965ء کی جنگ میں

فوج مغربی محاذ پر مشکل سے ہی کوئی قابل ذکر کام کرسکی اور مشرقی پاکستان پوری طرح تنہا رہ گیا۔ اس عرصے میں بھارت نے دونوں حصوں کے درمیان فضائی رابطہ کاٹ دیا اور اس طرح مواصلات ناممکن ہوگئی۔ جب چین نے بھارت کو دھمکی دی کہ اگر اس نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو وہ پاکستان کی مدد کو آئے گا تو پھر جا کر بھارت مشرقی پاکستان میں فوجی مہم جوئی سے باز آیا۔ اس صورت حال سے مشرقی پاکستان میں یہ سوچ پیدا ہوئی کہ اگر انہیں اپنے دفاع کے لئے چین پر انحصار کرنا ہے تو پھر ان کے مغربی پاکستان سے تعلق کا کیا فائدہ اور دفاعی بجٹ کے لئے رقوم کیوں فراہم کرتے ہیں۔

بنگالیوں کو دوسرا صدمہ اس وقت ہوا جب 1950ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر ملک کے آئندہ آئین کے لئے دو ایوانی مقننہ کی تجویز دی گئی جس میں ایوان بالا میں ہر صوبے سے ارکان کی تعداد مساوی ہونا تھی اور اہم فیصلے دونوں ایوانوں کے اجلاس میں ہونے تھے۔ چنانچہ مغربی پاکستان کو جس کی آبادی مشرقی پاکستان کی آبادی سے کم تھی۔ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں اکثریت مل جاتی۔ اس طرح مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان میں بالادستی کی کوشش کر رہے ہیں اور ملک میں ان کی اکثریت کو پارلیمنٹ میں ان کو اقلیت بنا رہے ہیں۔

1953ء میں غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی حکومت برطرف کردی اگرچہ انہیں آئین ساز اسمبلی میں اچھی بھلی اکثریت حاصل تھی۔ اس اقدام کو اس نظر سے دیکھا گیا کہ مغربی پاکستان ایک بنگالی سیاسی لیڈر کو پاکستان کے وزیراعظم کے طور پر برداشت نہیں کریں گے۔ ان تمام اقدامات کو خودسری اور مغربی پاکستان کے حکمران طبقے کے بالادستی کے رویئے کے طور پر دیکھا گیا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ بھی شکایت تھی کہ ایک چھوٹے گروہ کو انتظامیہ' تجارت اور سروسز پر پورا کنٹرول اور اجارہ داری ہے اور ان معاملات میں بنگالیوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ نتیجتاً 1954ء میں جو صوبائی انتخابات ہوئے' ان انتخابات میں مسلم لیگ کو بری طرح شکست ہوئی۔

309 نشستوں کے ایوان میں مسلم لیگ صرف 9 نشستوں پر کامیاب ہوئی۔ مشرقی پاکستان سے کامیاب ہونے والے تمام نمائندوں کا تعلق غریب اور متوسط طبقہ سے تھا جبکہ مغربی پاکستان سے کامیاب ہونیوالوں کی اکثریت کا تعلق جاگیردار طبقہ سے تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مغربی پاکستان کے انتخابی اور سیاسی نظام کو جاگیرداروں اور دولت مندوں نے یرغمال بنالیا تھا۔ تب سے پارلیمنٹ اور سیاست پر جاگیرداروں کا ہی تسلط قائم ہے۔ پاکستان کے اعلیٰ ترین ایوان بھی ان کی خواہش کے مطابق چلتے ہیں۔ مفاد پرست، موقع پرست، جاگیرداروں کے سامنے ملک کی 98 فیصد عوام بھی بے بس اور مجبور ہو چکی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے ذمہ داروں میں ایک بنیادی اور اہم عنصر جاگیردار ٹولہ بھی تھا جس نے قائداعظم کے پاکستان کو دولخت کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

قیام پاکستان کے وقت مغربی پاکستان میں فیوڈل سسٹم کی جڑیں بہت مضبوط اور گہری تھیں جبکہ مشرقی پاکستان میں جاگیردارانہ نظام تھا ہی نہیں جن چند ایک مقامات پر تھا اس کی نوعیت وطرز ہرگز وہ نہ تھی جو بدقسمتی سے آج بھی ہمارے ملک پر بڑے غرور و تمکنت کے ساتھ مسلط ہے مشرقی پاکستان میں مڈل کلاس کی سیاست اصل جمہوریت کی علمبردار بن کر ابھری تھی اس کے برعکس سابقہ مغربی پاکستان پر جاگیردارانہ طرز کی سیاست کا غلبہ تھا اس فرق کو قائم رکھنے کے لئے جاگیرداروں نے مغربی پاکستان کے عوام کو مشرقی پاکستان کے عوام سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مغربی پاکستان کے جاگیرداروں نے ''ادھر ہم ادھر تم'' کے اصول کے تحت مشرقی پاکستان کی عوام کے خلاف مغربی پاکستان میں منفی پروپیگنڈے کے ذریعہ بھائیوں میں نفرتیں پیدا کیں۔ عوامی لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے مغربی پاکستان کا جاگیردار طبقہ پریشان اور خوفزدہ تھا۔ جاگیرداروں نے عوامی لیگ کے مدمقابل مغربی پاکستان میں ایسی جماعت بنائی جس کی قیادت خود جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتی ہو۔ جاگیرداروں کو ذوالفقار علی بھٹو کی صورت میں ایک ایسی شخصیت مل گئی تھی جو خود بھی فیوڈل تھا اور فیوڈل سسٹم کی بقاء کے لئے عوام کو خوبصورت اور دلکش نعروں میں گمراہ کرسکتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے دلکش نعروں کے ذریعہ مغربی پاکستان کے عوام کی

سوچ وفکر کو مشرقی پاکستان کے عوام کی سوچ وفکر سے یکسر جدا کردیا، تاکہ جاگیردار مافیا کی سازش کامیاب ہوسکے جاگیرداروں نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے عوام کے درمیان جو تفریق اور نفرت پیدا کی اس کے نتائج 1970ء کے انتخابات میں سامنے آئے مغربی پاکستان کی سیاست پر اکثر و بیشتر جاگیرداروں کا تسلط تھا جبکہ مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں کی بڑی تعداد وکلاء، اساتذہ اور ریٹائرڈ سرکاری ملازمین پر مشتمل تھی، جس طرح پاکستان کی دوسری دستور ساز اسمبلی میں بھی مشرقی پاکستان کی نمائندگی 20 وکلاء اور 9 ریٹائرڈ ملازمین کر رہے تھے مشرقی پاکستان سے ایک بھی جاگیردار منتخب نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس ان انتخابات مغربی پاکستان کے 40 اراکین اسمبلی میں سے 28 جاگیردار تھے۔ مغربی پاکستان سے میاں ممتاز احمد دولتانہ، فیروز خان نون، افتخار حسین ممدوٹ، میاں عبدالباری، سکندر مرزا، عبدالحمید خان، کرنل عابد حسین، امیر اعظم خان، عزیز دین چوہدری، چوہدری محمد حسین چٹھہ، سردار عبدالحمید دستی، چوہدری عبدالغنی گھمن، سید علمدار حسین گیلانی، مشتاق حسین گورمانی، میاں افتخار الدین، مظفر علی قزلباش، میر بلخ شیر مزاری، سید محی الدین لال بادشاہ وغیرہ کے نام نمایاں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پاکستان کے 98 فیصد آبادی کا نمائندہ نہیں تھا بلکہ ان میں اکثر جاگیردار، انگریز سامراج کے خیر خواہ اور یونینسٹ پارٹی کے ستون سمجھے جاتے تھے۔

1970ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے 162 میں سے 160 نشستیں حاصل کیں یعنی عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان سے ملنے والی نشستوں کا تناسب 99 فیصد رہا جبکہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے 138 میں سے 81 نشستیں حاصل کیں اس طرح اسے حاصل ہونے والی نشستوں کا تناسب 59 فیصد رہا۔ قومی اسمبلی کی کل 300 نشستوں کی بنیاد بنا کر دونوں جماعتوں کو حاصل ہونے والی نشستوں کا تناسب نکالیں تو عوامی لیگ کو ملنے والی 160 نشستوں کا تناسب کل نشستوں کا 53.3 فیصد بنتا ہے جبکہ پیپلز پارٹی کو حاصل ہونے والی 81 نشستوں کا تناسب صرف 27 فیصد بنتا ہے۔

اقتدار عوامی لیگ کو دینے کی بجائے ''جمہوریت ہماری سیاست'' کو اپنا بنیادی نعرہ قرار دینے والی جماعت پیپلز پارٹی اپنے اس نعرے سے انحراف کرنے لگی۔ اس نے عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنے کی سخت ترین مخالفت شروع کر دی۔ بلکہ ''ادھر ہم ادھر تم'' کا نعرہ کھلے عام لگایا مگر اس کی مخالفت میں کہیں سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی اور ہوتی بھی کس طرح کہ مغربی پاکستان کی سیاست پر تو جاگیرداروں کا مکمل قبضہ تھا۔ پیپلز پارٹی مکمل طور پر جاگیردار مافیا کی ترجمان و علمبردار تھی اور یہی وہ جاگیردار طبقہ تھا جو مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی سازش میں پیش پیش تھا۔ جاگیرداروں نے اپنے کمال فن کے ذریعہ مغربی پاکستان کے ان لیڈران کو جن کی بڑی اکثریت کا تعلق جاگیردار طبقہ سے تھا محب وطن قرار دیا، لیکن مجیب الرحمٰن سمیت عوامی لیگ کی تمام ہی قیادت کو جس کا تعلق غریب و متوسط طبقہ سے تھا غدار قرار دے دیا۔ جاگیرداروں نے فیوڈل سسٹم کے تحفظ کے لئے اتنا گھناؤنا کھیل کھیلا کہ 56 فیصد عوام کو غدار قرار دے کر ہم سے علیحدہ کر دیا اور عوام الناس کو برابر یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ بنگالی ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔ بیوروکریسی اور جاگیردار عوام کے ذہنوں میں یہ غلط اور بے بنیاد بات بٹھانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے کہ بنگالی عوام اور سابقہ مشرقی پاکستان موجودہ پاکستان کی معیشت پر بوجھ ہیں حالانکہ بنگالی عوام اور نہ سابقہ مشرقی پاکستان موجودہ پاکستان کی معیشت پر بوجھ تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سابقہ مشرقی پاکستان اور بنگالی جاگیردارانہ طرز معاشرت پر بوجھ تھے۔

جمہوری روایات، اسلامی قوانین اور برابری کے اصول کے مطابق مشرقی پاکستان کو برابری کے تناسب سے زندگی کے ہر شعبہ میں ان کا جائز حق ملنا چاہئے تھا مگر قیام پاکستان کے بعد جاگیرداروں، بیوروکریسی، جنرل ایوب خان اور یحیٰی خان جیسی فوجی حکومتوں نے مشرقی پاکستان کے جائز حقوق اور مطالبات کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ بنگالیوں کے ساتھ انتہائی حقارت آمیز رویہ اختیار کیا۔ مغربی پاکستان کے حکمرانوں، جاگیرداروں، ماہر معاشیات، ماہر اقتصادیات اور سیاستدانوں نے شروع دن سے مشرقی پاکستان کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا کہ بنگالی، مغربی

پاکستان پر بوجھ ہیں۔ مغربی پاکستان کی ترقی میں رکاوٹ ہیں، مشرقی پاکستان مرکزی حکومت میں مناسب ریونیو جمع نہیں کرتا۔ جاگیرداروں اور بیوروکریسی کے اس پروپیگنڈے کے برعکس حقائق یہ بتاتے ہیں کہ مشرقی پاکستان نہ تو مغربی پاکستان پر بوجھ تھا اور نہ ہی وہ مغربی پاکستان کی ترقی میں رکاوٹ تھا۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہر ذی شعور پاکستانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ بنگالیوں کے ساتھ ہر شعبہ میں ناانصافی کی جارہی تھی اور ان کے ساتھ ناروا اور نامناسب سلوک روا رکھا جارہا تھا اس کے باوجود مشرقی پاکستان کے عوام نے منفی رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے پاکستان کی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ انہوں نے پاکستان کو مستحکم کرنے اور ملکی خزانے کو بڑھانے کے لئے انتھک محنت کی۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر ملک کے دولخت ہونے تک مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان برآمدات میں سرفہرست رہا۔

درآمدات اور برآمدات میں مشرقی پاکستان کا حصہ

سال	برآمدات (فیصد)	درآمدات (فیصد)
1948-49	44.8	19.3
1949-50	52.7	29.7
1950-1	47.4	28.0
1951-2	54.1	34.1
1952-3	42.5	26.4
1953-4	50.2	26.3
1954-5	59.8	29.0
1955-6	85.4	27.2
1956-7	56.5	35.1
1957-8	69.5	35.9
1958-9	66.5	35.1
1959-60	58.6	26.6
1960-1	70.0	31.8
1961-2	70.5	28.1
1962-3	55.6	62.7
1963-4	53.2	33.6

31.7	52.7	1964-5
31.6	55.7	1965-6
30.2	54.1	1966-7
28.5	44.3	1967-8
37.8	46.7	1968-9
35.6	50.0	1969-70

(source:Language and Politics in Pakistan)

درآمدادت اور برآمدات میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا حصہ

1947-1967

	برآمدات (روپوں میں)	درآمدات (روپوں میں)
مشرقی پاکستان	20,982,391,000	15,183,796,000
مغربی پاکستان	15,704,714,000	34,388,211,000

(source:Tragedy of errors)

ایک جانب مشرقی پاکستان برآمدات کے ذریعہ ملکی خزانے میں اضافہ کر رہا تھا تو دوسری جانب مغربی پاکستان کے حکمران قومی خزانے کی لوٹ مار میں مصروف تھے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان جو معاشی اور اقتصادی عدم مساوات موجود تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان جو قومی خزانے میں 50 فیصد سے زیادہ ریونیو جمع کر رہا تھا اسے بدلے میں 20 سے 35 فیصد حصہ مل رہا تھا۔

سال	مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان
1950-1955	2,370.90 (80%)	569.10 (20%)
1955-1960	3,475.50 (74%)	1,104.00 (26%)
1960-1965	7,045.50 (68%)	2,948.40 (32%)
1965-1970	8,601.60 (64%)	4,838.40 (36%)

Millions of US $

(source:Language and Politics in Pakistan)

(HBWI 1982: Vol 6,811)

پاکستان کی تعمیر وترقی کے لئے جو غیر ملکی امداد اور فنڈ ملتے تھے اس کی تقسیم بھی غیر منصفانہ انداز میں ہوتی تھی غیر ملکی فنڈ مغربی پاکستان کے پروجیکٹ کی تعمیر پر خرچ کئے جاتے تھے جبکہ مشرقی پاکستان اپنے چھوٹے چھوٹے منصوبوں کی تکمیل کے لئے مرکز کا منتظر رہتا تھا۔ مندرجہ ذیل اعداد وشمار سے صورتحال اور واضح ہو جاتی ہے۔

Percentage of Allocation of Funds for Developm^nt Projects

Item	West Pakistan	East Pakistan
Foreign Exchange for Vearious Development	80%	20%
Foreign Aid (US Aid)	96%	4%
U.S. Aid	66%	34%
Pak Indu Dev. Corp.	58%	42%
Pak Indu Credit & Inv. Corp	80%	20%
Indv. Dev Bank	76%	24%

(source: A Tale of Millions)

(حوالہ: الطاف حسین کے کالم۔ آواز حق)

سرکاری ملازمتوں میں بھی مشرقی پاکستان کے ساتھ سراسر ناانصافی اختیار کی گئی۔ وفاقی ملازمتوں میں بنگالیوں کو مکمل طور پر نظرانداز کیا گیا وہ پاکستان کی کل آبادی کا 65 فیصد تھے مگر انہیں وفاقی ملازمتوں میں بمشکل 19 فیصد حصہ مل رہا تھا۔

Employment	East Pakistan	West Pakistan
Central Civil Services	16%	84%
Foreign Services	15%	85%
Army	05%	95%
Navy (Technical)	19%	81%
Navy (Non-Technical)	09%	91%
Air Forece Pilots	11%	89%

(source: A Tale of Millions)

(حوالہ: الطاف حسین کے کالم۔ آوازِ حق)

وفاقی اداروں اور محکموں میں بھی مشرقی پاکستان کی عوام کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا 1947ء سے 1970ء تک آرمی، نیوی اور ایئر فورس میں C-in-C کے عہدے پر کسی بنگالی کو ترقی نہیں ملی دیگر محکموں اور وزارتوں میں بھی بنگالیوں کی نمائندگی بمشکل 25 فیصد تھی۔

Powerful Offices	East Pakisan	West Pakistan
Chief Executive(Prime Minister)	5 Years	19 Years
C-in-C(Army, Navy, Air Force)	nill	24 Year
Finance Minister	nill	24 Years
President's Secretriat	19%	81%
Chief of Planning	nill	24 Years
Minister		
Defence	8.1%	91.9%
Home Dept.	22.5%	77.5%
Education Dept.	27.3%	72.7%
Information Dept.	20.1%	79.0%
Health Dept.	19.1%	81.0%
Agriculture Dept.	21.0%	79.0%
Industries	25.6%	74.4%
Foreign Affairs	22.2%	77.8%
Communications	17.8%	82.8%
Finance	24.4%	75.6%

(source:Language and Politics in Pakistan)

(HBWI 1982: Vol 6,811)

وفاقی اداروں میں Gazetted اور Non-Gazetted افسران میں بھی مغربی

پاکستان کو مشرقی پاکستان کے مقابلے میں برتری حاصل تھی۔

	Gazetted	Non-Gazetted
West Pakistan	3708	82944
East Pakistan	1338	26310

مشرقی پاکستان کی آبادی چونکہ پورے ملک کی 65فیصد تھی اس لئے مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر مشرقی پاکستان کی مڈل کلاس طرز سیاست کے اثرات مغربی پاکستان پر چھا گئے تو جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ مغربی پاکستان کا بھی مقدر بن جائے گا اور اس طرح مغربی پاکستان میں بھی مڈل کلاس کی عوامی جمہوریت کے پھلنے پھولنے کے امکانات روشن ہو جائیں گے لہٰذا اس خوف کے پیش نظر جاگیرداروں اور ''خفیہ ہاتھ'' نے مل کر جاگیردارانہ نظام کی بقاء کی خاطر پاکستان کے ایک بازو کو کاٹنے میں اپنی عافیت جانی۔ جاگیردار اور وڈیرے مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں اور ان کی سوچ وفکر سے خوفزدہ تھے انہیں خوف تھا کہ کہیں مشرقی پاکستان کے عوام کی مثبت اور انقلابی سوچ وفکر اور طرز عمل کے اثرات مغربی پاکستان کے عوام کو اپنا اسیر نہ بنا ڈالیں اور کہیں مغربی پاکستان کے عوام میں جاگیرداروں کے نظام کے خلاف کوئی تحریک نہ جنم لے لے لہٰذا ان جاگیرداروں کی بڑی اکثریت نے اپنے جاگیردارانہ نظام کی بقاء کے لئے ملکی بقاء کو قربان کر دینے کو غنیمت جانا۔ جونک کی طرح ملک وقوم کا خون چوسنے والے، وطن عزیز کے خزانے کو خالی کرنے والے اور ملکی معیشت کو بینک کرپسی کی جانب لے جانے والے یہ جاگیردار اور وڈیرے آج بھی اقتدار وانتظام حکومت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ایوب خان کا صدارتی انتخاب

یونینسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم سے جاگیرداروں نے قائداعظم اور نظریہ پاکستان کی مخالفت کی مگر قیام پاکستان کے بعد اسی طبقہ نے مسلم لیگ میں پناہ لیکر قائداعظم کی قیادت کو بحالت مجبوری قبول کرلیا تھا مگر جب قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے جنرل ایوب خان کے مدمقابل صدارتی انتخابات میں حصہ لیا تو پنجاب کے سیاستدانوں کی اکثریت نے ان کی مخالفت کی۔ اس ٹولے نے محترمہ فاطمہ جناح کی نامزدگی کو ہی قرآن وسنت کے منافی قرار دیا۔ جنرل ایوب خان کو قوم کا نجات دہندہ قرار دیتے ہوئے ان کی صدارتی نامزدگی کو قومی خدمات قرار دیا۔ ایوب خان کی کابینہ کے ایک وزیر نے یہ تجویز دی کہ فاطمہ جناح کو اسکرین آؤٹ کردیا جائے یعنی کہ انھیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت ہی نہ دی جائے۔ وزیر نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ آئین میں لکھا ہے کہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صدر ہوگا'' یعنی کہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صدر ہوگی'' نہیں لکھا ہے۔ جنرل ایوب خان کی حمایت میں کاسہ لیسی اور خوشامدیوں کا ایسا ٹولہ سرگرم تھا جس نے محترمہ فاطمہ جناح کی طویل قومی خدمات کو فراموش کرکے اپنی روایتی احسان فراموشی کا ثبوت دیا بلکہ محترمہ فاطمہ جناح کی مخالفت میں نازیبانہ الفاظ استعمال کیے۔

پنجاب سے فاطمہ جناح کی مخالفت

محترمہ فاطمہ جناح کی مخالفت کرنے والوں میں نواب امیر محمد آف کالا باغ، امیر عبداللہ خان روکڑی، ساہیوال کے راجپوت اور آرائیں، ملتان کے قریشی اور گیلانی، ڈیرہ غازی خان کے لغاری، مزاری، قیصرانی، خانیوال کے ڈاہے، راولپنڈی کے راجے، گجرات کے نوابزادے، مظفر گڑھ کے دستی، اس کے علاوہ دیگر خاندان میں نون، ٹوانے، سیال، رجوعے اور قریشی گھرانوں کے بعض افراد پیش پیش تھے۔ اقتدار کے ایوانوں میں جنم لینے والی کنونشن مسلم لیگ میں انہی خاندانوں کی نمائندگی موجود تھی۔ پنجاب کا کوئی سرکردہ جاگیردار خاندان ایسا نہیں تھا جس نے ایوبی مارشل لاء کی حمایت نہ کی ہو اور اقتدار سے وابستہ نہ ہوا ہو۔ یہی جاگیردار ایوب خان کی قصیدہ خوانی میں مصروف تھے اور مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کو شکست دینے کے خواہاں تھے۔ صدارتی انتخابات میں ایوب خان کو کامیاب کرنے کے لئے اور سر دھڑ کی بازی لگانے والوں میں بہاولپور سے مخدوم حمید الدین، غلام میراں المعروف مخدوم الملک، ملتان سے سید رضی شاہ گردیزی، مخدوم سجاد حسین قریشی، اکرم یوسف، شیخ فیض المصطفیٰ، گیلانی اقبال ہراج، میجر افضل ڈاہا، مخدوم سید رحمت شاہ، محمد امین کانجو، سردار منظور حسین گوپانگ، ابراہیم برق، اللہ یار لنگڑیال، حامد رضا گیلانی، علمدار حسین گیلانی، بابو فیروز الدین انصاری، سرگودھا سے میاں خان کلیار، فتح خان ٹوانہ، میاں غلام محمد، مہر خداداد ملک، ملک نور حیات نون، خان میاں خان، مظاہر حسین ایڈووکیٹ شامل تھے۔ پیر آف دیول شریف تو ایوب خان کی حمایت میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ انہوں نے عوام کو خبردار کیا کہ صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ نہ دیں۔ اگر عوام نے انہیں ووٹ دے بھی دیئے تو میرے لاکھوں مرید انہیں اقتدار سے الگ کردیں گے۔ انہوں نے ایوب خان کی کامیابی کے لئے چلہ بھی کیا تھا۔

''جھنگ سے سردارزادہ سید ظفر عباس ایڈووکیٹ رجوعہ، مخدوم محمد غوث سجادہ نشین شاہ جیونہ (جو فیصل صالح حیات کے والد تھے) مہر علی شاہ کوٹ عیسیٰ، سید غضنفر عباس رتہ، مہر ظفر اللہ خان

بھروانہ' بھاولپور سے سید احمد نواز گردیزی' گوجرانوالہ سے ارشاد اللہ خان تارڑ' ساہیوال سے غلام محمد مانیکا' چوہدری عبدالحق رائے' محمد اقبال' شیخوپورہ سے چوہدری محمد اقبال' قربان علی چوہدری' محمد رفیع' ملک غلام علی واہگہ' چوہدری غلام مرتضیٰ' رائے منصب علی' رانا پھول خان قصور' سردار رشید احمد قصور' انور بھنڈر' سیف اللہ تارڑ' گوجرانوالہ سے میاں عبدالعزیز اور سردار اشرف خان' جہلم سے انور علی بلوچ' چوہدری امتیاز احمد گل' عارف حسین' اصغر علی رندھاوا فیصل آباد سے نوابزادہ اصغر علی گوجرانوالہ سے امان اللہ خان شاہانی خوشاب گل حمید روکڑی میاں والی محمد اکرم شمس آباد' اٹک سے افضل مہدی جہلم لاہور سے چوہدری عید محمد' ذوالفقار قزلباش احمد سعید کرمانی' معراج خالد' ایوب خان کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ ان کی دن رات کی کوششوں سے صدارتی انتخاب میں ایوب خان نے واضح کامیابی حاصل کی۔ پنجاب کا کوئی جاگیردار گھرانہ ایسا نہیں تھا جس نے اپنے ضلع میں ایوب خان کی کامیابی سے ہمکنار کرانے کیلئے جتن نہ کئے ہوں۔ اس حمایت سے یہ لوگ اقتدار میں شامل ہوگئے' وہاں زرعی اصلاحات کی زد میں آئی ہوئی زمینیں بھی انہیں مل گئیں۔'

(حوالہ: سیاست کے فرعون)

اقتدار کے ایوانوں سے جنم لینے والی سرکاری کنونشن مسلم لیگ میں ایسے خاندانوں کی نمائندگی موجود تھی جنہوں نے یونینسٹ پارٹی کے سائے تلے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ محمودہ سلیم جن کے والد سر سکندر حیات یونینسٹ پارٹی کے اہم ممبر رہے انھوں نے مادر ملت کے بارے میں فرمایا ''اس نازک موقع پر پاکستان کو عورت کی نہیں مرد کی ضرورت ہے۔'' فیصل آباد سے چوہدری امتیاز گل جو کہ اس وقت پارلیمنٹری سیکریٹری تھے انھوں نے محترمہ فاطمہ جناح سے اپیل کی کہ وہ اپنے انتخابات پر نظر ثانی کریں۔ اسپیکر افضل چیمہ جنھوں نے نظام اسلام پارٹی سے اس لئے استعفیٰ دیا کہ ایوب خان کی حکومت میں انھیں بھی کچھ نہ کچھ حصہ مل جائے گا انھوں نے فاطمہ جناح کے بارے میں فرمایا ''محترمہ کی نامزدگی قرآن وسنت کے منافی ہے کیونکہ اسلامی اصولوں کے مطابق کوئی عورت ملک کی سربراہ نہیں بن سکتی'' ٹاؤن کمیٹی بھکر نے ایک قرارداد پاس کی جس میں

کہا گیا تھا کہ ''فاطمہ جناح سیاست میں حصہ نہ لیں وہ قابل احترام ہستی ہیں مگر وہ قوم کو الجھنوں میں نہ ڈالیں' بورے والا کے لیڈر ملک اللہ یار لنگڑیال نے مادر ملت کے فیصلے کو افسوس ناک قرار دیا۔ مسلم لیگ میں شامل جاگیرداروں کے ٹولے کے ایک نمائندے میر قادر بخش زہری نے کہا کہ ''محترمہ ایسی جماعتوں کے نام نہاد نو نکاتی پروگرام کے تحت انتخابات لڑ رہی ہیں جن کے دامن کے ایک ایک تار پر علاقائی عصبیت، کانگریس پرستی، ہندو نوازی اور پاکستان دشمنی کے مکروہ داغ ہیں'' پنجاب کے مفاد پرست سیاستدانوں' رائے محمد حیات خان کھرل، راجہ حسن اختر، سرگودھا کے خداداد خان ملک، ملک نور حیات نون، اور انور ٹوانہ، فیصل آباد سے رفیق سہگل، سلطان احمد چوہدری، جھنگ سے سید نوازش علی، ظفر عباس رجوعہ، نواز علی خان، سردار غلام محمد شاہ رجوعہ، غلام حیدر بھروانہ، شیخ محمد سید، ڈی جی خان سے سردار محمود خان لغاری، لائل پور سے سلیم کھرل، سیالکوٹ سے سید مرید حسن اور احمد خان' گھمن کے عبدالغنی، ملتان سے سجاد حسین قریشی، محمد اکرم بوسن، حامد رضا گیلانی، منٹگمری سے میاں عبدالحق، رانا غلام صابر، نور محمد خان کھوکھر، رانا خداداد خان، بہاولپور سے اسلم بلوانہ، بہاولپور سے شہزادہ محمد عباس عباسی، ملک محمد قاسم، رحیم یار خان سے احمد محمود کے دادا مخدوم الملک، مخدوم حمید الدین، جمال گوریجہ، میاں فیض جنجوعہ، مخدوم سید محمد غوث سجادہ نشین (فیصل صالح حیات کے والد) نے مادر ملت فاطمہ جناح کی صدارتی نامزدگی کی شدید مذمت اور مخالفت کرتے ہوئے ایوب خان کا ساتھ دینے اور انہیں بھاری اکثریت سے کامیاب کرنے کا عزم کیا۔ یہ پنجاب کا وہی جاگیردار طبقہ تھا جس نے یونینسٹ پارٹی کے سائے تلے انگریز سامراج کی بھرپور مدد کی تھی۔ یاسین وٹو نے پنجاب میں تقریر کرتے ہوئے ایوب خان کو قوم کا نجات دہندہ قرار دیا۔ راؤ افضل خان اور مقامی مسلم لیگ کے صدر امداد علی گیلانی نے ایوب خان کی نامزدگی کو قوم پر عظیم احسان قرار دیا۔ کوئٹہ میں مسلم لیگ کے صدر سردار محمد اسحاق جو موسیٰ خان کے بھائی تھے انھوں نے محترمہ فاطمہ جناح کے ارادوں کو خطرناک قرار دیا اور کہا کہ ''ملک دشمن عناصر نے انتشار پھیلانے کیلئے قائداعظم کی ہمشیرہ کی پناہ لی ہوئی ہے۔ قائداعظم کی روح صدر ایوب خان کے

کارناموں سے خوش ہوگی جن کا مقصد پاکستان کو فلاحی معاشرہ بنانا تھا۔'' ایوب خان خود محترمہ فاطمہ جناح کے انتہائی مخالف تھے انھوں نے 22 اکتوبر 1964ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''متحدہ حزب اختلاف منفی نظریات پر مبنی ہے محترمہ فاطمہ جناح غدار اور انتشار پسند لوگوں کیلئے پناہ گاہ بن گئی ہے، محترمہ پاکستان کو اپنی میراث سمجھتی ہے تو یہ ان کی غلطی ہے۔'' ایک اور جلسہ میں انھوں نے کہا کہ ''اپوزیشن لیڈر مداری ہیں عوام ان کے فریب میں نہ آئیں، جو سیاستدان فاطمہ جناح کی پناہ لیکر میرے خلاف صف آراء ہیں وہ ہارے ہوئے بٹیر ہیں''

ذوالفقار علی بھٹو جو فیلڈ مارشل ایوب خان کو عقیدت و محبت میں ''ڈیڈی'' کہا کرتے تھے' صدارتی انتخابی مہم میں جنرل ایوب خان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے جنرل ایوب خان کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے ٹھٹھہ میں کہا: '' یہ نااہل سیاستدان کہہ رہے ہیں کہ ملک میں جمہوریت نہیں، اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ تمہارے عہد میں کون سی جمہوریت تھی، صدر ایوب خان نے ہماری عزت بلند کی ہے، ہم انہیں غیر مشروط طور پر ووٹ دیں گے اور پاکستان بھر میں اول نمبر سندھ کا ہوگا۔''

بھٹو کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا کہ ایوب خان کو سب سے زیادہ ووٹ سندھ سے ملیں گے کیونکہ سندھ کی قابل احترام اور قد آور سیاسی شخصیات نے ریاستی مخالفت کے باوجود محترمہ فاطمہ جناح کی بھرپور حمایت کی بلکہ انھوں نے اندرون سندھ فاطمہ جناح کی حمایت میں انتخابی مہم چلائی۔ ان شخصیات میں عبدالحمید سندھی، میر جعفر جمالی، نواب مظفر حسین، سید شاہ بخاری، غلام محمد لغاری، علی احمد تالپور، رسول بخش تالپور اور جی ایم سید کے نام قابل ذکر ہیں۔

مشرقی پاکستان کا جمہوری کردار

جنرل ایوب خان اور ان کے حواریوں کو کراچی کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان میں بھی

مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ایوب خان کے کاسہ لیس اور مفاد پرست لیڈروں نے شیخ مجیب الرحمن سمیت مشرقی پاکستان کے رہنماؤں کے خلاف وطن دشمن ہونے کے الزامات لگائے ۔اس کے جواب میں شیخ مجیب الرحمان نے کراچی میں فاطمہ جناح کے انتخابی مہم کا ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ جس میں انھوں نے بے بنیاد الزامات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''مشرقی پاکستان سے برسراقتدار پارٹی کا بکس خالی آئے گا ملک دشمنی کا الزام لگانے والوں کو ہم عدالت میں بلائیں گے ۔جولوگ انگریزوں کے پٹھو تھے وہ پاکستان کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔''

مشرقی پاکستان میں مادرملت کی کامیابی یقینی نظر آرہی تھی اس کامیابی سے ایوب خان اوران کے حواری خوفزدہ تھے انھوں نے مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کو بڑے پیمانے پر گرفتار کرنا شروع کردیا۔جنرل ایوب خان نے ریاستی طاقت کے ذریعہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم کوسبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔اس موقع پرخواجہ ناظم الدین جن کی کوششوں کی بدولت محترمہ فاطمہ جناح ایوب خان کے مدمقابل انتخابات لڑنے پر رضا مند ہوئیں تھیں انھوں نے متحدہ اپوزیشن جماعت کے رہنماؤں کی بلاجواز گرفتاری کے خلاف 29 ستمبر 1964ءکومشرقی پاکستان کے تمام شہروں میں عام ہڑتال کی اپیل کی۔ یہ ہڑتال اس قدر مکمل اور منظم تھی کہ ڈھاکہ شہر میں اس دن اتنا سناٹا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گھڑیوں نے ٹک ٹک کرنا بھی بند کردیا ہے۔اس ہڑتال نے یہ ثابت کردیا تھا کہ مشرقی پاکستان کی عوام مکمل طور پرمحترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ ہیں۔ یہ ہڑتال درحقیقت مادرملت فاطمہ جناح کی مشرقی پاکستان میں مقبولیت اور کامیابی کا ریفرنڈم تھا۔مشرقی پاکستان میں صدارتی مہم میں جس طرح فاطمہ جناح کی حمایت میں جلسہ اور جلوس منعقد ہورہے تھے اس نے حکمران جماعت کی نیندیں حرام کردیں تھیں۔ڈھاکہ میں محترمہ فاطمہ جناح کا جس گرم جوشی اوروالہانہ انداز میں خیرمقدم کیا گیا اس کی مثال مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں نہیں ملتی۔ایوب خان نے اپنی یقینی شکست کو کامیابی میں بدلنے کیلئے پوری حکومتی مشینری اور زر خرید موقع پرست،ابن الوقت،سیاستدانوں کومحترمہ فاطمہ جناح کے خلاف استعمال کیا۔

محترمہ فاطمہ جناح ملک میں ایک حقیقی جمہوری نظام قائم کرنا چاہتی تھی جہاں اقتدار ملک کے 98ء فیصد عوام کے نمائندوں کے پاس ہوتا۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر جب ایک طرف جمہوریت تھی اور دوسری طرف فوجی آمریت جنرل ایوب کی شکل میں موجود تھی اس نازک وقت پر مشرقی پاکستان اور کراچی نے حق وصداقت اور جمہوریت کا ساتھ دیا اس کے برعکس پنجاب کے جاگیرداروں نے فوجی آمریت کا ساتھ دے کر جاگیرداری نظام اور مارشل لاء کی راہ ہموار کی۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں ڈالے گئے ووٹوں کا فرق

امیدوار	مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان
جنرل ایوب خان	28927ووٹ	20720 ووٹ
محترمہ فاطمہ جناح	10563ووٹ	18080ووٹ
کے ایم کمال	89ووٹ	76ووٹ

مغربی پاکستان میں صدر ایوب کے حق میں 72.3 فیصد اور مادر ملت کے حق میں 25.2 فیصد جبکہ مشرقی پاکستان میں یہ تناسب 52.5 اور 45.2 فیصد تھا۔ حکومتی مشینری کی مکمل دھاندلی کے باوجود مشرقی پاکستان میں ایوب خان کو مغربی پاکستان کے مقابلے میں 8257 ووٹ کم ملے۔ مشرقی پاکستان کی جمہوریت پسند عوام نے مغربی پاکستان کے جاگیردارانہ طبقہ کے مقابلے میں فاطمہ جناح کو 7517 ووٹ زیادہ دیئے۔ ایوب خان اور محترمہ فاطمہ جناح کو ملنے والے ووٹوں کا فرق درحقیقت مشرقی پاکستان کے عوام کی جمہوری سوچ وفکر کی نشاندہی کر رہا تھا۔ یہی فرق ان کی قائداعظم سے سچی عقیدت اور پاکستان سے والہانہ محبت کا اظہار بھی تھا۔ اس کے برخلاف مغربی پاکستان کے ماسوائے کراچی کے تمام بڑے شہروں نے مادر ملت کے مقابلے میں فوجی جنرل کی حمایت کر کے اپنی غیر جمہوری ہونے کا ثبوت دیا۔ پنجاب کے تمام بڑے شہروں سے ایوب خان کو شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ پنجاب کا جاگیردار طبقہ جو ہمیشہ اقتدار سے چمٹا رہا ہے اس نے اپنا ناطہ ایوب خان سے بھی جوڑ لیا۔ خوشامدی، کاسہ لیسی، چاپلوسی، موقع

پرستی، مفاد پرستی اور خود فروشوں کا ایک ایسا گروہ ہے جنکی منزل صرف اقتدار کا حصول ہے۔ ان ہی لوگوں نے فوجی جنرل اور ڈکٹیٹر کو سوانح عمری لکھنے پر آمادہ کیا۔ بلکہ کاسہ لیس کالم نگاروں نے ایوب خان کی سوانح عمری لکھی اور شائع کی۔

پنجاب کے اہم شہروں سے ایوب خان اور محترمہ فاطمہ جناح کو ملنے والے ووٹ

ڈویژن	ایوب خان کو ملنے والے ووٹ	محترمہ فاطمہ جناح کو ملنے والے ووٹ
ڈیرہ اسماعیل خان	916	489
راولپنڈی	2654	973
سرگودھا	3908	1552
لاہور	4440	1448
ملتان	4116	1916
بہاولپور	1949	396
ملک کے دیگر بڑے شہروں سے ملنے والے ووٹ		
پشاور	4821	999
خیر پور	2122	752
کوئٹہ	560	20
قلات	391	27
حیدرآباد	2138	895
کراچی	907	1061

ان انتخابات میں پنجاب کے دارالخلافہ لاہور سے ایوب خان کو سب سے زیادہ ووٹ ملے پنجاب کے موروثی سیاستدانوں اور جاگیرداروں نے جمہوریت اور آمریت کے فرق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جنرل ایوب کا ساتھ دیا۔ ان انتخابات نے اس فرق کو اور واضح کر دیا کہ

کراچی کے عوام جمہوریت پسند ہیں انہوں نے فوجی ڈکٹیٹر کی حمایت کرنے کی بجائے جمہوریت پسند قوتوں کا ساتھ دیا۔ کراچی کے برعکس پنجاب کے جاگیرداروں اور موروثی سیاستدانوں نے حسب روایت غیر جمہوری قوتوں کا ساتھ دے کر یہ ثابت کردیا کہ وہ نظریات اور اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اسی جماعت کی حمایت کرتے ہیں جو برسر اقتدار ہو۔

کراچی کا جمہوری کردار

کراچی واحد شہر تھا جہاں سے ایوب خان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ قائد کے جانثاروں اور قائد سے والہانہ عقیدت رکھنے والوں نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سے وفاداری نبھاتے ہوئے مادرملت محترمہ فاطمہ جناح کو اس شہر سے کامیاب کرایا جو قائد کا محبوب شہر ہے۔ جسے قائداعظم نے پاکستان کا پہلا دارالحکومت بنانے کا شرف بخشا تھا۔ کراچی کے جمہوریت پسند عوام نے مادرملت کا ساتھ اس لئے نہیں دیا تھا کہ وہ قائداعظم کی ہمشیرہ ہیں بلکہ ان کا ساتھ اس لئے دیا تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح نے ایک فوجی جنرل کی آمرانہ دورحکومت کو لگام دینے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے ملک میں جمہوریت کی بحالی اور اقتدار عوام کے حقیقی نمائندوں کو لوٹانے کا عزم لیکر اس پرخار راستے پر قدم رکھا تھا۔ اگر اس انتخاب میں جنرل ایوب خان کو شکست ہوجاتی تو کوئی بھی فوجی جنرل غیرآئینی طریقہ سے اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش نہ کرتا۔

کراچی کے باشعور عوام نے ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز پر حق کا ساتھ دیا فوجی جنرل کے سامنے سرخم کرنے کی بجائے ریاستی ظلم و جبر کا جرأت اور بہادری سے سامنا کیا۔ کراچی کے جمہوریت پسندانہ کردار کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کی بجائے ان پر تنقید کی گئی۔ صدر ایوب خان کے فرزند گوہر ایوب خان نے کراچی میں اپنے والد کی کامیابی کا جشن منانے کا اعلان کیا۔ ایوب خان کی کامیابی کا جشن اصولی طور پر پشاور اور لاہور میں منانا چاہیے تھا جہاں سے انہیں واضح اکثریت میں کامیابی ملی تھی۔ گوہر ایوب نے جشن کے نام پر کراچی کی عوام کو انتقام کا نشانہ بنایا۔ بانیان

پاکستان جوٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں بمشکل سر چھپائے ہوئے تھے اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان پر مسلح دہشت گردوں نے گوہر ایوب کی قیادت میں حملہ کر دیا۔ ان کی جھونپڑیوں کو آگ لگا دی۔ بچوں اور بزرگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ مہاجروں کو اس بات کی سزا دی گئی کہ انہوں نے جنرل ایوب کے مدمقابل محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ کیوں دیا۔



بانیانِ پاکستان ہی غدار ٹھہرے

پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کیلئے قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں جو جدوجہد کی وہ تاریخ کے صفحات پر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔قدرت نے انھیں خدمت اور خلوص کی دولت سے دل کھول کر نوازا تھا۔قائداعظم نے انھیں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کا جنرل سیکریٹری مقرر کیا پھر تحریک پاکستان کے ایام میں انھیں اپنا معتمد خصوصی قرار دے کر ان کی ملی خدمات اور تنظیمی صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف کیا۔لیاقت علی خان نے یو پی اور سی پی کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھا کرنے کیلئے نا قابل فراموش خدمات انجام دیں۔جس کے نتیجے میں دونوں صوبوں کے مسلمان اپنے سروں پر کفن باندھ کر میدان عمل میں کود پڑے۔اس امر کے باوجود کہ جن علاقوں سے ان کا تعلق ہے وہ پاکستان کے حصے میں نہیں آئیں گے انہوں نے تحریک پاکستان میں جس جوش و خروش سے حصہ لیا پاکستان کے نام پر جو صعوبتیں برداشت کیں وہ پاکستان کی تاریخ میں زریں باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قائد ملت لیاقت علی نے قائداعظم کی وفات کے بعد صدمہ و غم سے نڈھال قوم کے آزردہ دلوں کو سنبھالا دینے' لاتعداد مسائل اور الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں نا قابل فراموش کردار ادا کیا۔قدرت نے انھیں جو مدبرانہ،انتظامی وانصرامی قابلیت عطا کی تھی اس کی بدولت ان

کی وزارت عظمیٰ کا دور پاکستان کے لئے استحکام، استقلال اور سر بلندی کا زمانہ تھا۔لیاقت علی خان کے دور میں پہلی جنگ کشمیر کے مسئلہ پر لڑی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب آزادی کے بعد پاکستان بے سروسامانی کے عالم میں تھا۔لیاقت علی خان نے اس حالت میں بھی بھارت سے کشمیر کا کافی حصہ آزاد کرلیا۔اس جنگ میں بھارت کے تسلط سے کشمیر کے جس حصہ کو آزاد کرایا گیا وہ آج بھی آزاد کشمیر کہلاتا ہے۔آج جتنا بھی کشمیر پاکستان کا حصہ ہے وہ مہاجر وزیر اعظم لیاقت علی خان کی جرات مندانہ قیادت کا ثمر ہے۔پنجابی اور کشمیری وزیر اعظم تو 50 سال میں کشمیر کا ایک انچ حصہ بھی بھارت سے آزاد نہیں کرا سکے۔اسی طرح لیاقت نہرو پیکٹ پاکستان کی تاریخ کا واحد معاہدہ ہے جس میں پاکستان کو بھارت کے مقابلے میں سبقت حاصل رہی ہے۔اسکے باوجو پنجاب کے جاگیرداروں اور نوکر شاہی کی جانب سے قائد ملت کی مخالفت کی جاتی رہی۔لیاقت علی خان کی مخالفت کی ایک بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ ان کا تعلق متحدہ ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبے سے تھا وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔پنجاب کا جاگیردار طبقہ یہ کیسے برداشت کرتا کہ سیاست میں مرکزی کردار مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہو۔جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے لیاقت علی خان کو وزیر اعظم کی حیثیت سے کبھی قبول نہیں کیا۔قائد ملت کی شہادت جہاں قومی سانحہ ہے وہیں مہاجروں کے لئے نا قابل تلافی نقصان بھی تھا۔قائد ملت کی شہادت سے ملت اسلامیہ اپنے عظیم محسن سے بھی محروم ہوگئی تھی۔آپ کی شہادت کے بعد مملکت خداداد پاکستان کو جاگیرداروں، وڈیروں اور نوکر شاہی نے اپنے پنجوں میں ایسا جکڑا کہ اقتدار کی مسند پر اب دو فیصد مراعات یافتہ طبقہ ہی براجماں نظر آتا ہے۔

لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد پنجاب کی نوکر شاہی اور جاگیرداروں نے جس طرح اقتدار پر قبضہ کیا اور سینئر مسلم لیگی رہنماؤں کو سیاست سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کیا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ لیاقت علی خان کو بحیثیت وزیر اعظم جاگیرداروں اور بیوروکریسی نے کبھی بھی دل سے قبول نہیں کیا تھا۔وہ پہلے دن سے لیاقت علی خان کے خلاف سازش کررہے تھے جس طرح

وہ قیام پاکستان سے قبل قائداعظم کے خلاف سازش کرتے تھے۔ نوائے وقت کے حمید نظامی اور نواب ممدوٹ، لیاقت علی خان کے خاص الخاص مخالفوں میں سے تھے۔ 1951ء میں جب وزیراعظم لیاقت علی خان نے لاہور میں جلسہ عام سے خطاب کرنے کا اعلان کیا تو خفیہ پولیس اور دیگر سرکاری ایجنسیوں نے لیاقت علی خان کو اطلاع دی کہ لاہور میں ان کے خلاف شدید کشیدگی پائی جاتی ہے اس لئے لاہور میں جلسہ منعقد نہ کریں مگر لیاقت علی خان نے مجوزہ پروگرام کے مطابق جلسہ عام سے خطاب کرنے کا اعلان کیا۔ دوسری طرف لاہور میں وزیراعظم لیاقت علی خان کے جلسہ عام کو خراب کرنے اور گڑبڑ پھیلانے کی سازش اپنے عروج پر تھی۔ جلسہ عام میں گڑبڑ پھیلانے کیلئے ''جوگی'' کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جس نے جلسہ گاہ میں لیاقت علی خان کی تقریر سے قبل سانپ چھوڑنے تھے تاکہ جلسہ گاہ میں بھگدڑ مچ جائے۔ لیاقت علی خان کے جلسہ گاہ پہنچنے سے قبل ہی نواب ممدوٹ کی سرپرستی میں گڑبڑ پھیلانے کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ جبکہ دوسری طرف پنجاب کی خفیہ پولیس اور سرکاری ایجنسیاں جنہیں قبل از وقت اس بات کا علم تھا کہ جلسہ گاہ میں گڑبڑ ہو سکتی ہے انھوں نے ان شرپسندوں کو روکنے کے لئے کوئی مناسب انتظام نہیں کیا۔ جب لیاقت علی خان تقریر کرنے کیلئے اٹھے۔ نواب ممدوٹ گروپ کے ایک کارکن عمر دین چوہدری نے جلسہ گاہ کے درمیان سے کھڑے ہو کر انگلی لہراتے ہوئے تقریر کے انداز میں کہا کہ آپ کی ڈکٹیٹر شپ نہیں چلے گی پھر ایک اور کارکن آغا امان اللہ نے اپنی جیب سے سفید رومال نکال کر لہرایا جس کے بعد جلسہ گاہ میں ہڑبونگ مچ گئی۔ چاروں طرف سے لیاقت علی خان کے خلاف نعرے لگنے لگے، جلسہ گاہ سے بعض گوشوں سے سانپ سانپ کی پکار شروع ہو گئی جس کے بعد جلسے کا رہا سہا نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ یوں پنجاب کی بیوروکریسی اپنی سازش میں کامیاب رہے کہ لیاقت علی خان لاہور میں تقریر نہ کر سکے۔

پنجاب کے جاگیرداروں اور نوکرشاہی کی طرح وہاں کے اخبارات بھی لیاقت علی خان کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے، نوائے وقت نے لیاقت علی خان کے بارے میں لکھا کہ وہ

وزارت عظمٰی کو ہاتھ کی چھڑی اور قومی جماعت کو جیب کی گھڑی نہ بنائیں۔ نوائے وقت کی مخالفت جب بہت زیادہ بڑھ گئی تو بیگم رعنا لیاقت علی نے پنجاب کے کچھ سیاستدانوں سے شکایت کی کہ ''پنجاب والے نوائے وقت والوں یعنی حمید نظامی کو سمجھائیں جو خواہ مخواہ ہمارے خلاف (حکومت) لوگوں کے جذبات بھڑکا رہے ہیں۔'' لیاقت علی خان لاہور کے ناگوار تجربہ کے باوجود عوامی رابطہ مہم سے دل برداشتہ نہ ہوئے انھوں نے 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی کے جلسہ عام میں خطاب کرنے کا اعلان کیا۔ 16 اکتوبر کے جلسہ عام کے بارے میں بیگم رعنا لیاقت علی خان نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ ملکی حالات کے پیش نظر لیاقت علی خان کو اس جلسہ عام میں نئے انتخابات کا اعلان کرنا تھا اور یہ انتخابات یقینی طور پر اس آئین ساز اسمبلی کی قرارداد مقاصد (Objective Resolution) کے تحت ہوتے جو 12 مارچ 1949ء کو منظور ہوئی تھی جسے خود لیاقت علی خان نے پیش کیا تھا۔ اگر لیاقت علی خان کو الیکشن کرانے کا موقع مل جاتا تو ملک میں 23 مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان کے تحت صوبوں کو صوبائی خود مختاری مل جاتی۔ پاکستان نوکرشاہی اور جاگیرداری کے شکنجے سے آزاد ہو جاتا۔ نئے انتخابات کی صورت میں جمہوری نظام میں از سرنو توانائی پیدا ہوتی، نوکرشاہی کے سیاسی عزائم ہمیشہ کیلئے خاک میں مل جاتے۔ جو قوتیں ملک میں جاگیرداری نظام کو مضبوط کرنا چاہتی تھیں، ان کے لئے لیاقت علی خان راستے کا سب سے بڑا کانٹا تھے، ان کو ہٹائے بغیر جاگیردار اور بیوروکریسی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد نوکرشاہی جس طرح اقتدار پر قابض ہوئی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ لیاقت علی خان کے قتل کے پیچھے ان ہی قوتوں کا ہاتھ تھا۔ جن قوتوں نے لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد راتوں رات ترقی کی منازل طے کیں۔ مشتاق گورمانی اور ملک غلام محمد خان جنہیں وزیراعظم لیاقت علی خان کابینہ سے نکالنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد غلام محمد خان کے سر پر گورنر جنرل کا تاج سجا دیا گیا۔

غلام محمد کے از خود گورنر جنرل بننے کی کارروائی مسلم لیگ اور قومی اسمبلی سے بالا ہی بالا

ہی ہوئی۔ان صاحبان کے نزدیک جو اس تمام سازش میں شریک تھے ان کی نظر میں ان دونوں اداروں کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہ تھی۔ یہ معاملہ بذات خود تحقیق طلب ہے کہ غلام محمد جو منتخب نہیں تھے اور نہ سیاسی پس منظر رکھتے تھے کس طرح گورنر جنرل بن گئے۔ان تمام معاملات کی تہہ میں پنجاب کی نوکر شاہی اور جاگیرداروں کی سازشیں کارفرما نظر آتی ہیں۔غلام محمد کو گورنر جنرل بنانے کیلئے خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹا کر بے اختیار وزیراعظم بنایا گیا اور پھر انھیں اس عہدے سے بھی برطرف کر دیا گیا۔ چوہدری محمد علی جو سیکریٹری تھے انھیں ترقی دیکر وزیرخزانہ بنایا گیا۔اسکندر مرزا کو ترقی دیکر سیکریٹری دفاع بنایا گیا بعد میں انہیں مشرقی پاکستان کا گورنر بنادیا گیا۔ جہاں سے وہ جست لگا کر پہلے مرکزی وزیر اور بعد میں غلام محمد کے جانشین یعنی گورنر جنرل بن گئے خان قربان علی خان آئی جی پولیس پنجاب تھے۔صوبائی حکومت میں ان کی طوطی بولتی تھی ۔وزیراعلیٰ پنجاب میاں ممتاز دولتانہ انہیں سرعام ''انکل'' کہتے تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کے جلسہ کی نگرانی ان کے ذمہ تھی، انہیں ترقی دیکر صوبہ پنجاب کا سربراہ بنادیا گیا۔ راولپنڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نجف خان جس نے لیاقت علی خان کے قاتل اکبر پر گولی چلانے کا حکم دیا تھا جلسہ گاہ کی سیکورٹی اس کے ذمہ تھی۔اس غیر ذمہ دار سپرنٹنڈنٹ پولیس کے خلاف کارروائی کرنے کی بجائے اسے پنجاب حکومت نے DIG کے عہدے پر ترقی دے دی ان حضرات کے ساتھ ساتھ نوکر شاہی کے باقی افراد کے بھی نصیب کھل گئے انھوں نے راتوں رات ترقی کی منازل طے کیں یوں من وسلویٰ سے نوکر شاہی کو لوٹنے کا پورا پورا موقع ملا۔

یہ بات لوگوں کے ذہنوں میں اب تک کھٹکتی ہے کہ اگر ان لوگوں کے کوئی سیاسی عزائم نہیں تھے اگر ان کا ارادہ سیاست میں داخل ہونے اور سیاسی عہدے پر قابض ہونے کا نہیں تھا اور اگر وہ پہلے سے یہ ذمہ داریاں اٹھانے کیلئے تیار نہیں تھے تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ ادھر لیاقت علی خان نے دم توڑا اور ادھر رات کی تاریکی میں چند گھنٹوں کے اندر اندر پنجاب کی نوکر شاہی خود کلیدی عہدوں پر بیٹھ گئی نہ کوئی انتخاب ہوا نہ اسمبلی بلائی گئی اور نہ ہی عوام سے کسی نے پوچھنے کی ضرورت

محسوس کی۔ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ راولپنڈی کے جس جلسہ عام میں وزیراعظم لیاقت علی خان کو شہید کیا گیا اس جلسہ میں پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ موجود نہیں تھے ان کی عدم شرکت کو آج بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تاریخ کا طالب علم اور ملک کا ہر محب وطن شہری یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ پنجاب کے وزیراعلیٰ کی ایسی کون سی مصروفیات یا مجبوری تھی جس کے باعث وہ وزیراعظم کے اس جلسہ میں شرکت نہ کر سکے۔ اس جلسہ میں کابینہ کے دو وزراء غلام محمد اور مشتاق گورمانی بھی شریک نہیں ہوئے۔ یہ ایک ایسی گہری سازش تھی جس میں اپنے بیگانے دونوں شریک تھے۔

مسلمانوں کا محسن تھا لیاقت
مسلمانوں نے اس کو مار ڈالا

قائداعظم کے انتقال کے بعد اقتدار مافیا کے راستے کا ایک کانٹا تو نکل چکا تھا مگر لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ان کے راستے کا دوسرا کانٹا بھی نکل گیا۔ اب جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے راستے کی آخری رکاوٹ قائداعظم اور لیاقت علی خان کے وہ مخلص جانثار ساتھی تھے جنھوں نے قائداعظم کے حکم پر تحریک پاکستان کے آغاز سے لے کر تکمیل پاکستان تک کے کٹھن اور مشکل سفر میں ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ قدم قدم پر جانی اور مالی قربانی دیکر اپنے قائد کو ہر امتحان میں سرخرو کیا۔ اپنی زندگی کے قیمتی سال پاکستان بنانے اور سنوارنے میں گزار دیئے۔ نامساعد حالات کے باوجود شب و روز محنت کر کے نوزائیدہ پاکستان کو اس کے پیروں پر کھڑا کرنے میں مصروف عمل تھے کہ راتوں رات اقتدار کی مسند پر ایک ایسا ٹولہ نمودار ہوا جس کے کئی منہ اور کئی ہاتھ تھے۔ جو اقتدار کی ہوس اور قومی دولت کا بھوکا تھا۔ یہ ٹولہ نہ تو عوام کا نمائندہ تھا اور نہ ہی ملک و قوم کا خیر خواہ تھا، یہ ٹولہ جاگیرداروں اور نوکر شاہی کا نمائندہ اور عوامی جمہوری نظام کا ازلی دشمن تھا۔ اس ٹولے نے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد پاکستان کے سچے اور خیر خواہ سیاسی رہنماؤں پر جھوٹے اور بے بنیاد الزامات لگا کر سیاست سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کر دیا اور خود پاکستان کے مطلق

العنان حکمران بن بیٹھے۔متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کا بھی یہی موقف ہے انہوں نے اپنے اس موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''قیام پاکستان کے جاگیرداروں اور وڈیروں نے جرنیلوں کے ساتھ مل کر پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والے اصل لیڈروں کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا جس کے لئے سب سے پہلے قائداعظم کا قتل کیا گیا۔۔۔۔قائداعظم کے قتل کے اس عمل میں فیوڈل اور جرنیل شامل تھے اس کے بعد قائداعظم کے دست راست اور ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں سرعام گولی مار کر شہید کر دیا گیا' لیاقت علی خان کے قتل کے بعد تحریک پاکستان کے دیگر رہنماؤں کو سازش کے تحت ایک ایک کے ان کے عہدوں سے ہٹایا جاتا رہا اور پھر ایوب خان کے مارشل لاء کے دور میں ''ایبڈو'' کے قانون کے ذریعے بھارت سے پاکستان آنے والے مسلم لیگی اکابرین کو راستے سے ہٹا دیا گیا اس طرح جاگیرداروں نے پاکستان کو مکمل طور پر ''چیک'' لیا اور ملک میں ایک ٹریکا بنا جس میں جاگیرداروں اور وڈیروں کے ساتھ جرنیل اور ملا یعنی علمائے سوء شامل تھے ملاؤں اور جرنیلوں نے جاگیرداروں کو ہمیشہ سپورٹ کیا۔''

مولوی فضل الحق قرارداد پاکستان کے محرک، مسلم لیگ کے سینئر رہنما' قائداعظم کے قریبی اور بااعتماد رفیق ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے حصول پاکستان کی جدوجہد میں جو تاریخی کردار ادا کیا اور جو خدمات پیش کیں اس کے پیش نظر انہیں شیر بنگال جیسا عوامی خطاب ملا۔مگر یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی اور ستم ظریفی کی زندہ مثال ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو ملک کی تخلیق میں قدم قدم پر شریک سفر رہا۔منزل ملنے کے بعد اسے غدار اور بھارت کا ایجنٹ قرار دیکر پاکستان کی سیاست سے زبردستی الگ کر دیا گیا۔بعدازاں جب نوکر شاہی کو ان کی ضرورت محسوس ہوئی انہیں وزیراعلیٰ بنا دیا گیا۔اپنا کام نکالنے کے بعد ایک بار پھر ان پر غداری کے الزامات لگا کر سیاست سے الگ کر دیا گیا۔

شہید سہروردی کی خدمات بھی دیگر مسلم لیگی رہنماؤں سے کچھ کم نہیں تھیں، انھوں نے مشرقی بنگال کو پاکستان میں شامل کرنے کیلئے انتھک جدوجہد کی۔ انکی کوششوں کی بدولت مشرقی بنگال کو پاکستان میں شامل کیا گیا۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں وہ پورا عرصہ مسلم لیگ بنگال کے جنرل سیکریٹری اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے روح رواں رہے۔ ان کی خدمات کو تسلیم کرنے کی بجائے انھیں بھی اقتدار کے بھوکے بھیڑیوں نے غدار وطن قرار دیکر پاکستان کی سیاست سے علیحدہ رکھا۔ جب پنجاب کی نوکر شاہی کے نامزد گورنر جنرل غلام محمد کو سہروردی شہید کے تعاون اور سیاسی تجربہ کی شدید ضرورت محسوس ہوئی تو انھیں جنیوا سے بلا کر وزیر قانون اور کچھ مہینوں کے لئے وزیراعظم بھی بنایا گیا ایوب خان کے تخلیق کردہ ایبڈو قانون کے تحت انہیں بھی سیاست سے نا اہل قرار دیکر ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ جلاوطنی میں ہی ان کا انتقال ہوا، کئی شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی موت طبی نہیں تھی بلکہ انہیں قتل کیا گیا۔ شہید سہروردی کی بیٹی بیگم اختر سلیمان کا وہ انٹرویو ریکارڈ پر موجود ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ سہروردی طبعی موت نہیں مرے بلکہ انہیں نوکر شاہی نے مروایا تھا۔

خواجہ ناظم الدین نے مشکل وقت میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ جب ہندو اخبارات نے مسلمانوں کے لئے مشکلات پیدا کیں اور ان کا ناطقہ بند کیا تو ایسے کڑے وقت میں خواجہ ناظم الدین نے اپنی جملہ آبائی جائیداد بیچ کر مسلمانوں کا انگریزی اخبار ''اسٹار آف انڈیا'' کلکتہ سے جاری کیا، اخبار شائع کرنے کی وجہ سے وہ خود قلاش ہوگئے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ قیام پاکستان کے بعد ان کی خدمات کو تسلیم کیا جاتا جو مالی نقصان انھوں نے اٹھایا تھا اس کا ازالہ کیا جاتا۔ ان کی قربانیوں کا صلہ دینے کی بجائے انہیں بے آبرو کر کے سیاست سے ہمیشہ کیلئے نکال دیا گیا۔ انہیں وزیراعظم کے عہدے سے برطرف کر کے رسوا کیا گیا۔ جبکہ وہ مسلم لیگ پاکستان کے سربراہ تھے جس وقت انہیں بدعنوانی کے الزامات لگا کر وزارت عظمیٰ سے برطرف کیا اس وقت ملک وملت کے ہمدرد اور خیر خواہ رہنما کے پاس نہ تو اپنا گھر

تھا اور نہ ہی ان کے پاس سر چھپانے کیلئے کوئی جگہ تھی اور نہ کوئی ذریعہ معاش تھا۔ عارضی طور پر کراچی کے ایک مخیر شخص نے ان کی خستہ حالی پر رحم کھا کر ان کو سر چھپانے کیلئے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر دے دیا۔ جب مغربی پاکستان سے مایوس ہو کر ڈھاکہ پہنچے تو وہاں کے لوگ قائداعظم کے قریبی ساتھی اور تحریک پاکستان کے مرکزی رہنما کی معاشی بدحالی اور تباہ حال حشر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ جس ملک کی تشکیل اور تعمیر و ترقی کیلئے انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ وہ شخص خالی ہاتھ اور بے سروسامان تھا۔ قائداعظم کے قریبی ساتھیوں کے لئے اس سے بڑھ کر دکھ اور غم کی بات یہ تھی کہ ان پر بدعنوانی کے جھوٹے الزامات لگائے گئے ان کی کردار کشی کی گئی۔ مگر حکومت کے کسی نمائندے نے یہ نہیں بتایا کہ اس فرشتہ سیرت انسان سے کون سی ایسی بدعنوانی سرزد ہوئی تھی کہ انہیں وزیراعظم کے عہدے سے برطرف کیا گیا بلکہ انہیں اپنے ملک میں سر چھپانے تک کی جگہ نصیب نہیں ہوئی۔

سردار اورنگزیب نے اس وقت مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں جہاد کا فیصلہ کیا جب سرحد میں کوئی پاکستان کا نام لینے کیلئے تیار نہیں تھا اس مشکل وقت میں اورنگزیب نے تنہا تحریک کو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا اور صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو پیروں پہ کھڑا کیا۔ پاکستان بن جانے اور لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد سرحد سے تعلق رکھنے والے تحریک کے اس سینئر رہنما کو سفیر بنا کر سیاست سے الگ کر دیا گیا۔ نوکر شاہی جو اعلیٰ عہدوں پر صرف اپنا حق سمجھتی ہے اس نے سردار اورنگزیب پر بے سروپا الزامات لگا کر سفارتکار کے عہدے سے بھی ہٹا دیا۔

قاضی عیسیٰ نے صوبہ بلوچستان میں تحریک پاکستان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ قائداعظم جب تک زندہ رہے قاضی عیسیٰ مسلم لیگ ہائی کمانڈ کے ممبر رہے۔ جب تک تحریک پاکستان جاری رہی اور پاکستان نہیں بنا وہ ہندوستان بھر میں تحریک پاکستان کیلئے شب و روز محنت کرتے رہے۔ قائداعظم کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ قائداعظم کے انتقال کے بعد نوکر شاہی نے انھیں سفارتکار بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا اور یوں انہیں بھی سیاست سے

الگ کر دیا گیا۔

مسٹر منڈل بنگال کے اچھوت اور مزدوروں کے لیڈر تھے۔ انھوں نے قائداعظم کا ایسے وقت میں ساتھ دیا جب کوئی غیر مسلم ان سے تعاون کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ قائداعظم نے انہیں مشترکہ آل انڈیا کابینہ میں اپنی طرف سے نامزد کیا اور بعد میں انہیں اپنی کابینہ کا رکن بنا کر پاکستان لے آئے جب تک قائداعظم زندہ رہے۔ منڈل کی پاکستان سے وفاداری شک وشبہ سے بالاتر رہی مگر قائداعظم کے انتقال اور قائد ملت کی شہادت کے بعد وفاداری کے ناپ تول کا کام پنجاب کی نوکر شاہی نے اپنے ذمہ لے لیا۔ چوہدری محمد علی جو زندگی کا بیشتر حصہ انگریزوں کی ملازمت میں گزارنے کے بعد پاکستان آئے تھے انھوں نے آتے ہی مرکز میں ملازمت حاصل کر لی اور وہ نوکر شاہی کے امام مانے جانے لگے۔ ابھی وہ کابینہ میں محض سیکریٹری تھے انھیں یکا یک یہ انکشاف ہوا کہ مسٹر منڈل کی ملک سے وفاداری مشکوک ہے۔ دوسرے معنوں میں وہ خود کو قائداعظم سے زیادہ مردم شناس اور وفاداری پرکھنے کا ہنر مند سمجھتے تھے۔ انھوں نے مسٹر منڈل سے کابینہ کے اہم کاغذات چھپانے کی کوشش کی۔ انھیں احساس دلایا جانے لگا کہ ان کی وفاداری مشکوک ہے، مسٹر منڈل کو جب یہ احساس ہوا کہ ان کی وفاداری پر شک کیا جارہا ہے ان سے اپنی یہ توہین برداشت نہ ہوئی وہ وزارت کے منصب سے مستعفی ہو کر بھارت واپس چلے گئے۔ تحریک پاکستان کی ایک ایسی شخصیت جس پر قائداعظم کو اعتماد تھا جس شخص نے قائداعظم کے اعتماد اور بھروسہ کو ہمیشہ قائم رکھا۔ اپنی قوم کی شدید مخالفت کے باوجود قائداعظم کا ساتھ نہ چھوڑا بلکہ قائداعظم کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے مگر قائداعظم کے انتقال کے بعد جو سلوک مسٹر منڈل کے ساتھ ہوا اس کے بعد انھوں نے واپس کلکتہ جانا پسند کیا۔

چوہدری خلیق الزمان نے ملت اسلامی کے لئے جو 70 سال کام کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آپ کی خدمات تحریک پاکستان میں بھی بہت نمایاں رہی۔ آپ قرارداد پاکستان کے مدیر بھی تھے۔ آپ یوپی کے ہندو لیڈروں کے مقابل کئی سال تک ڈٹے رہے۔ پاکستان بننے کے

بعد آپ کی خدمات کے صلہ میں آپ کو مسلم لیگ پاکستان کا صدر بنایا گیا۔مگر جلد ہی انھیں مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہونا پڑا بلکہ ایک عرصہ تک راندہ درگاہ رہے۔نوکر شاہی نے اپنی ضرورت کے تحت انھیں مشرقی پاکستان کا گورنر بنایا۔گورنر سے ہٹا کر سفیر بنایا گیا اور پھر انہیں سفیر کے عہدے سے بھی سبکدوش کر دیا گیا۔چوہدری خلیق الزماں جیسی سیاسی شخصیت کو بھی سیاست سے دور رکھا گیا۔سفیر کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد کافی عرصہ بیکار پڑے رہے۔آخر فرشتہ اجل نے ایسی بے مقصد زندگی سے انہیں نجات دلائی۔

جو کراہتا تھا تمام شب وہ غریب جوش تو مر گیا

جس ملک میں حکمرانی عوام کی جگہ جاگیرداروں اور بیوروکریسی کے ہاتھوں میں ہو وہاں ملک کے محب وطن اور پرخلوص سیاستدانوں کو ذلیل وخوار ہی ہونا پڑتا ہے۔انھیں قدم قدم پر مشکلات اور پریشانی کا ہی سامنا رہتا ہے۔نوائے وقت جو پنجاب کا ترجمان اخبار تھا۔اس نے چوہدری خلیق الزماں کو''مفرور ملت'' کا لقب دیا اور لکھا کہ ہندو۔نان کے مسلمانوں کو بے یارومددگار چھوڑ کر بھاگ آئے۔اخبار نے یہ توہین آمیز رویہ ہندوستان کے تمام ہی مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنماؤں کیلئے رکھا۔

ایوب کھوڑو سارا عرصہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے وابستہ رہے،سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ کروانے کا سہرا بھی ان کے سر رہا۔سالہا سال قائداعظم کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور مسلم لیگ سندھ کے صدر رہے۔دہلی پہنچ کر دعوت دی کہ بہار کے ستم رسیدہ مہاجرین کو سندھ میں بسایا جائے اور پاکستان کا دارالحکومت کراچی میں ہونا چاہئے۔سندھ کے خزانہ سے کئی کروڑ روپے خرچ کر کے مہاجرین کی رہائش کیلئے کراچی میں نئے کوارٹر تعمیر کروائے سندھ کے تین کروڑ روپے نقد مرکز کے خزانہ میں جمع کرائے تاکہ مرکزی ملازموں کی تنخواہیں تقسیم کرنے میں مشکلات نہ ہوں۔کئی لاکھ مہاجرین کو کراچی اور سندھ میں بسانے کا بندوبست کیا۔ان خدمات کے صلہ میں نوکر شاہی نے ان پر انتظامی بدعنوانیوں کے الزامات لگا کر دو سال کیلئے سیاست سے

الگ کر دیا۔ بعد میں انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ انہیں اس قدر پریشان اور تنگ کیا گیا کہ ایوب کھوڑو بالآخر سیاست کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے۔

شیخ عبدالمجید سندھی نے ساری عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ خداداد صلاحیتوں کی بدولت ہندوستان کے مسلمانوں نے انہیں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا صدر منتخب کیا۔ مولانا شوکت علی جیسی شخصیت نے ان کی سیکریٹری شپ میں رہ کر کام کرنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھا۔ آپ آل پارٹیز کانفرنس کے صدر بھی رہے۔ سندھ کی صوبائی سیاست میں وہ بمبئی کونسل اور بعد میں سندھ اسمبلی کے ممبر اور وزیر بھی رہے۔ زندگی بھر صحافت کے پیشہ سے وابستہ رہے، کئی سال تک سندھ کے واحد مسلم روزنامہ ''الوحید'' کے ایڈیٹر رہے۔ مسلم لیگ سے شیخ عبدالمجید سندھی کا لگاؤ ازلی اور ابدی تھا۔ قائداعظم کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بنے۔ 1938ء میں کراچی مسلم لیگ کانفرنس میں آپ ہی نے وہ تاریخی قرارداد پیش کی جس نے تقریباً دو سال بعد برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کی بنیاد ڈالی۔ مگر پاکستان بن جانے کے بعد سندھ کے اس قابل فخر فرزند کو سیاسی اچھوت قرار دیکر پس منظر میں پھینک دیا گیا کیونکہ نوکر شاہی شیخ عبدالمجید سندھی جیسے تجربہ کار، بااصول اور جہاندیدہ لیڈر کو اپنے مقاصد میں رکاوٹ محسوس کرتی تھی۔ ان کی خدمات کو تسلیم کرنے اور ان کے تجربے سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے جنرل ایوب خان نے 85 سالہ بزرگ سیاستدان اور سندھ کے سپوت کو جس نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا ان پر بے بنیاد الزامات لگا کر ضعیف العمری میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان کی خدمات اور قربانیوں کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جاتا مگر قومی خدمات کے صلہ میں انہیں جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ شیخ عبدالمجید سندھی کے اخبار ''الوحید'' کو مرکزی حکومت کے حکم پر بند کیا گیا۔ الوحید نے سندھ میں 36 سال تک ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑی۔ قیام پاکستان سے 16 سال قبل تحریک پاکستان کے باقاعدہ ترجمان اخبار کی حیثیت سے عوام میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل تھی۔ نوکر شاہی نے جہاں سندھ کے سیاسی رہنماؤں کو سیاست سے دور

رکھا ہیں آزادی صحافت پر پابندی لگا کر آزادی رائے اور آزادی اظہار پر بھی پابندی لگادی۔

محمد ہاشم گزدر کا شمار قائداعظم کے جانثار سپاہیوں میں ہوتا ہے ان کی تحریک پاکستان سے وابستگی، قائد سے عقیدت اور 50 سالہ خدمات اظہر من الشمس تھیں۔ مہد تا لحد وہ مجاہد رہے۔ پاکستان کے آئین ساز اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بنے۔ ان کی خدمات کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ جسے چند صفحات میں قلم بند کرنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ ان کی صلاحیتوں اور تجربہ سے استفادہ اٹھانے کی بجائے نوکر شاہی نے ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ وہ شروع دن سے نوکر شاہی کی نظر میں کھٹک رہے تھے۔ نوکر شاہی کو ایک ایسے موقع کا انتظار تھا جب انہیں بھی سیاست سے باہر کر دیا جاتا۔ ہاشم گزدر کے لئے مشکلات اور پریشانیوں کا دور اس وقت شروع ہوا جب آدمی رات کے وقت وزیراعظم بوگرہ کو پستول دکھا کر آئین ساز اسمبلی توڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اس وقت ہاشم گزدر اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر تھے۔ مولوی تمیزالدین خان کے استغاثہ پر جو مقدمہ چلا اس میں ہاشم گزدر نے نوکر شاہی کی جمہوریت کش سازشوں اور آئین سوز کارگزاریوں کا پردہ چاک کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا جب ایوب خان نے نوکر شاہی سے مل کر اقتدار پر قبضہ کیا تو سب سے پہلے آئین ساز اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر ہاشم گزدر کو جیل میں ڈالا گیا انہیں اس امید پر چند دن کیلئے جیل سے رہا کیا گیا کہ وہ ایوب خان کی بوگس مسلم لیگ کے لئے کراچی میں کام کریں گے۔ جب انھوں نے ایوبی مارشل لاء کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کیا تو انھیں دوبارہ سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ انھیں جیل سے اس وقت رہائی نصیب ہوئی جب انھیں دل کی شدید تکلیف ہوئی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جیل کی صعوبتوں نے انھیں انتہائی کمزور کر دیا تھا۔ دل کی جو بیماری جیل سے لیکر آئے تھے وہ انھیں قبر تک لے گئی۔

جی ایم سید کا شمار سندھ کے ان ترقی پسند اور عوام دوست مسلمان نوجوانوں میں ہوتا تھا جنھوں نے سندھ کو بمبئی کے ہندو زدہ صوبے سے علیحدہ کروایا۔ وہ علیحدگی کے بعد نوکر شاہی اور انگریز سامراج کے مخالف اور سخت ترین دشمن رہے۔ مسلم لیگ کی تحریک چلی تو جی ایم سید

قائداعظم کے سرفروش سپاہی اور تحریک پاکستان نے صف اول کے کارکن کی حیثیت سے سامنے آئے۔ سالہاسال قائداعظم کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے۔ انتہائی نازک اور فیصلہ کن دور میں معتمد ترین رکن رہے۔ سندھ واحد صوبہ تھا جہاں کی قانون ساز اسمبلی نے پاکستان کے مطالبہ کی تحریک پیش کی بلکہ یہ قرارداد بھاری اکثریت سے منظور بھی کرائی۔ اس دور میں پاکستان کا نام لینا انگریزوں اور ہندوؤں کی نظر میں گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے سیاستدانوں میں جی ایم سید واحد مسلم رہنما تھے جنھوں نے اسمبلی میں پاکستان کے قیام کیلئے باقاعدہ قرارداد منظور کروائی جبکہ دوسری طرف پنجاب اسمبلی میں مسلمان وزیراعلیٰ سر سکندر حیات پاکستان کے بارے میں یہ ارشاد فرمارہے تھے۔

''ہماری حکومت خالصتاً پنجابی حکومت ہے...... مسلمان ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب نہیں۔ اگر وہ اس کے باوجود بھی اصرار کریں تو میرے خیال میں انھیں پاگل خانے میں بھیجنا مناسب ہوگا''

جی ایم سید جو منزل گاہ تحریک کی پاداش میں ایک مدت تک جیل میں رہے۔ ان کی جدوجہد کی بدولت سندھ کے مسلمان کانگریس اور ہندوؤں کے شکنجے سے آزاد ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع کیا۔ ان قومی خدمات کے صلہ میں انھیں جو عزت اور مرتبہ ملنا چاہئے تھا وہ تو نہ ملا بلکہ ان کے گلے میں بھی غداری کا طوق ڈال دیا گیا۔ جو مرتے دم تک ان کے گلے میں پڑا رہا۔ کسی نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کیا اختلاف تھا جس کی وجہ سے تحریک پاکستان کا یہ زبردست حامی اور قائداعظم کا جانثار ناراض ہوا۔ کسی نے بھی جی ایم سید کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ جی ایم سید جیسے بااصول اور باکردار شخص کے معاملہ پر کسی نے ہمدردانہ غور کرنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی۔ جس پھوڑے کا فوری علاج ممکن تھا اس پر نشتر لگا لگا کر ناسور بنا دیا۔ ماضی میں بھی قیوم خان اور مولوی فضل الحق کے قائداعظم سے اختلافات ہوگئے تھے قائداعظم نے مولوی فضل الحق اور قیوم خان کے لئے سخت الفاظ بھی استعمال کئے مگر مجموعی قومی

مفاد کی خاطر ان کی غلطیوں کو معاف کر کے انہیں گلے بھی لگایا۔ انہیں پہلے سے زیادہ اہم ذمہ داریاں دیکر ان پر اپنے اعتماد اور بھروسہ کا اظہار کیا۔ یہی سلوک جی ایم سید کے ساتھ بھی ہوسکتا تھا مگر جاگیرداروں، نوکرشاہی اور خفیہ ہاتھوں نے شروع دن سے قائداعظم اور جی ایم سید کو قریب آنے ہی نہیں دیا بلکہ دونوں رہنماؤں کے درمیان دوریاں پیدا کرنے کیلئے بدگمانیاں پیدا کرتے رہے۔

نوکرشاہی نے شروع دن سے چھوٹے صوبوں کے سیاستدانوں کو قومی سیاست سے دور رکھنے کی کوشش کی، خاص طور پر سندھ کے وہ بزرگ اور تجربہ کار سیاستدان جنھوں نے تحریک آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں انھیں خاص طور پر نوکرشاہی نے افتاد کا شکار بنایا۔ میر غلام علی خان، قاضی فضل اللہ، پیر الٰہی بخش اور قاضی محمد اکبر جیسے نرم مزاج سیاست کار بھی نوکرشاہی سے نہ بچ سکے۔ بارہا انھیں سیاست کے سمندر میں ڈبویا گیا پھر نکالا گیا اور پھر ڈبویا گیا تاوقتیکہ ان میں مزید تیرنے کی سکت نہ رہی۔ سندھ اسمبلی میں پاکستان کی حمایت میں قرارداد پیش کرنے والے سائیں جی ایم سید پر غداری کا الزام لگا کر انہیں 30 سال تک قید و بند میں رکھا گیا۔ ون یونٹ کے خلاف تحریک چلانے پر باچا خان اور عبدالصمد اچکزئی پر ملک کے خلاف سازش کرنے کے بے بنیاد الزام لگا کر غداری کا طوق ان کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ فضل الحق کی کابینہ پر بھی ملک توڑنے کی سازش کا الزام لگا کر ان کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان کے حقوق کی بات کی تو انہیں بھی ملک دشمن اور غدار کہہ کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ بلوچستان میں فوجی آپریشن کے خلاف بلوچ رہنماؤں نے تحریک چلائی تو اس جرم میں عطاء اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری، غوث بخش مری اور ولی خان پر ملک دشمنی اور غدار وطن ہونے کے الزامات لگا کر جھوٹے مقدمات میں ملوث کیا گیا۔ الطاف حسین نے سندھ کے حقوق کی آواز بلند کی تو انہیں بھی غدار کہا گیا۔ بریگیڈیئر آصف ہارون نے صحافیوں کو بریفنگ دیتے ہوئے ایم کیو ایم پر ملک توڑنے کا جھوٹا الزام لگایا بلکہ جناح پور کا نقشہ صحافیوں کو پیش کیا۔ بریگیڈیئر آصف ہارون نے ملکی اور غیر ملکی صحافیوں کے سامنے ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین پر ملک دشمنی کے بے بنیاد الزامات

لگائے۔ بانیان پاکستان جنہوں نے شب و روز جدوجہد کر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کیا' انہیں ہی غدار اور ملک دشمن ٹھہرایا گیا۔

اسلام اور اسلامی امہ کے نام نہاد ٹھیکیداروں اور جاگیرداروں نے ہمیشہ خود کو سب سے زیادہ محب وطن ہونے کا دعویٰ کیا۔ وطن عزیز کے ان نام نہاد دعویداروں نے ہمیشہ چھوٹے صوبوں کے سیاستدانوں کی حب الوطنی کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ خان عبدالغفار خان' مولانا بھاشانی' شیخ مجیب الرحمٰن' جی ایم سید' الطاف حسین' عبدالولی خان' غوث بخش بزنجو' شیر محمد مری' عطاء اللہ مینگل' اجمل خٹک' عبدالصمد اچکزئی' ڈاکٹر عبدالحیٔ' رسول بخش تالپور' معراج محمد خان غدار ٹھہرے۔ جنہوں نے بھارتی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان آنے کا دعویٰ کیا' سکھ علیحدگی پسندوں کی فہرست بھارتی حکومت کو پیش کی اور جنہوں نے قائداعظم اور پاکستان کی شدید مخالفت کی وہی طبقہ محب وطن قرار پایا۔

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

☆☆☆☆☆

سندھ۔۔۔مہاجروں کا وطن ثانی

متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے ایم کیو ایم کی تشکیل کے ساتھ ہی سندھی عوام کے ساتھ پرخلوص اور دوستانہ ماحول میں زندگی بسر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا بلکہ اس سے بڑھ کر سندھ کو اپنا وطن ثانی قرار دیا۔انہوں نے سندھ کی عوام کے حقوق کے حصول' سندھ کی صوبائی خودمختاری اور سندھ کو درپیش مسائل کے حل کیلئے نیک نیتی سے عملی جدوجہد کی۔ایم کیو ایم نے سندھ کے حقوق کی جدوجہد میں شریک ہو کر یہ ثابت کیا کہ وہ سندھ اور سندھی عوام کے ساتھ خلوص دل اور نیک نیتی کی بنیاد پر رشتہ قائم کئے ہوئے ہیں ایم کیو ایم نے اپنے قیام کے ساتھ ہی سندھ کے تمام مکتبہ فکر کے افراد اور سیاسی تنظیموں سے تعلقات بڑھانے اور ماضی کی تلخیوں کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔1987 میں ہی مہاجروں اور سندھیوں کے افکار اور رویوں سے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ سندھی اور مہاجر سیاسی اور سماجی میدان میں ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور جب الطاف حسین نے لیاقت میڈیکل کالج حیدرآباد میں سائیں جی ایم سید اور سندھی قوم پرستوں کی دعوت پر وہاں شرکت کی تو دوریاں قربتوں میں تبدیل ہو گئیں مگر قوم پرستوں کی شکل میں اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹوں نے سندھی مہاجر اتحاد کے ابتدائی ایام میں ہی مخالفت شروع کر دی تھی۔ان نام نہاد قوم پرستوں کا خیال تھا کہ مہاجروں کو سندھ سے نکالنا چاہئے۔حمزہ علوی لکھتے ہیں کہ''مہاجروں کے خلاف شاؤنزم کا مظاہرہ اور متشددانہ مہاجر مخالفت نعرے بازی کرنے والے سندھی رہنماؤں کے مفاد اور مقاصد مشکوک ہیں ان میں سے بعض کا المیہ یہ ہے کہ ان کا سیاسی

مستقبل تاریک ہو چکا ہے اور وہ اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگانے' ذاتی سیاسی طالع آزمائی اور جاہ پسندی۔ کے لئے انتہا پسندانہ نعرے بازی کے ذریعہ اعتدال پسند قیادت کو گرانے اور غیر مقبول بنانے کی حکمت عملی کو اپنائے ہوئے ہیں اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ایک شاؤنسٹ سندھی رہنما ایسا بھی ہے جس کے بیانات اور مطالبات کو فاشزم کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ سندھ سے ایسے تمام لوگوں کو نکال دیا جائے جو اصلی سندھی نہیں ہیں۔"

مہاجروں کے خلاف اس طرح کی کینہ پرور مہم چلانے والے نام نہاد قوم پرست سندھی عوام کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے سندھی اور مہاجر کے درمیان اختلافات اور بدگمانیاں پیدا کرنے کی سازشیں کرتے رہے ہیں۔ جس کا مقصد سندھ کے عوام کے درمیان ٹوٹ پھوٹ اور اختلافات پیدا کرنا ہے تاکہ سندھ کے مجموعی مفاد کے لئے سندھی مہاجر مشترکہ اقدام کے امکانات معدوم ہو جائیں تاکہ اس کا براہ راست فائدہ مضبوط مرکز کے تخلیق کاروں کو پہنچتا رہے۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر خود سندھی قوم پرستوں کے بانی اور رہنما جی ایم سید نے جون 1987 میں سندھی ہفت روزہ برسات کو انٹرویو دیتے ہوئے رسول بخش پلیجو اور دیگر نام نہاد سوشلسٹ اور کمیونسٹ کہہ کر پنجاب کا ایجنٹ قرار دیا۔ متحدہ قومی موومنٹ کے بانی الطاف حسین نے بھی نام نہاد قوم پرستوں کے سندھ دشمن کردار پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

> سائیں جی ایم سید وہ واحد شخصیت تھے جنہوں نے سندھ کے حقوق کے لئے اپنی زندگی نظر بندی اور جیل میں گزار دی لیکن سندھ دھرتی کا سودا نہیں کیا لیکن بدقسمتی سے ان کے نام نہاد پیروکاروں نے سائیں جی ایم سید کے نام پر شہرت کما کر اپنے لئے فوائد حاصل کئے اور ان کے مشن کو چھوڑ دیا۔ نام نہاد قوم پرست لیڈر کسی نہ کسی انداز میں سرکاری ایجنسیوں کے پے رول پر ہیں۔ یہ نام نہاد قوم پرست کہتے ہیں کہ الطاف حسین اردو بولنے والا ہے اس لئے سندھ کے عوام اس پر اعتماد نہ کریں لیکن نام نہاد قوم پرست لیڈر پنجاب سے سندھ پر مسلط کئے جانے والے گورنروں سے گلے ملتے رہے ان

نام نہاد قوم پرستوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا ایم کیو ایم کے طارق جاوید کو سندھ کا قائم مقام وزیر اعلیٰ بنائے جانے پر یہ لوگ قیامت مچاتے ہیں لیکن سندھ پر پنجاب کا گورنر، آئی جی، ہوم سیکریٹری اور ربیورکریسی مسلط کی جاتی ہے تو یہ نام نہاد قوم پرست خاموش رہتے ہیں۔اب پنجاب کی اسٹیبلشمنٹ کے لڑاؤ اور حکومت کرو کے عمل میں شریک ان نام نہاد قوم پرست لیڈروں کو اردو اور سندھی بولنے والے خوب اچھی طرح پہچان چکے ہیں کہ اردو بولنے والا سندھی ہو یا سندھی بولنے والا سندھی ہو اگر وہ پنجاب کی اسٹیبلشمنٹ کا آلہ کار بن کر سندھ دھرتی کا سودا کرتا ہے تو وہ سندھ کے عوام کا دشمن ہے اور سندھ کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

نام نہاد قوم پرستوں کی سازشوں اور پروپیگنڈے کی برعکس جی ایم سید کے نظریے کے سچے پیروکاروں، سندھی مہاجر یکجہتی اور اتحاد کے حقیقی خیر خواہ طبقے کا موقف ہے کہ ''مہاجر سندھ دھرتی کے بیٹے ہیں ان کے مفادات صرف سندھ دھرتی سے وابستہ ہیں ان کا جینا مرنا سندھ کے ساتھ ہے مہاجر ہجرت کے بعد سندھ دھرتی کو اپنا وطن ثانی تسلیم کرتے ہوئے ہمیشہ سندھ کے حقوق کی جدوجہد میں شریک رہے۔جبکہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے ان افراد کا جو پنجابی بولتے ہیں معاملہ اس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ انہوں نے سندھ میں ہجرت کرنے کے بعد بھی اپنے تعلقات اور مفادات پنجاب ہی سے مربوط رکھے۔انہوں نے سندھ میں پنجابی آباد گار ویلفیئر ایسوسی ایشن جیسی تنظیم بنائی اور سندھ کے مسائل اور مصائب سے ہمیشہ بے نیازی اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا۔پاکستان پہنچنے کے بعد پنجابی ہونا ایک نعمت بن گیا سندھ میں رہنے والے مشرقی پنجاب کے پنجابیوں نے ہمیشہ پنجابی بن کر سوچا اور سندھ میں رہنے کے باوجود صوبہ پنجاب کے مفادات کی ترجمانی کرتے رہے۔سندھ میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنی شناخت کو پنجابی رکھنا ہی پسند کیا یہ بھی حقیقت ہے کہ سندھ میں مہاجروں اور مشرقی پنجاب کے پنجابیوں دونوں نے ہی ہجرت کی مگر وہ پنجابی بن کر مہاجروں سے علیحدہ ہو گئے

اور گزشتہ 50 برسوں سے خود کو پنجابی کی حیثیت سے شناخت کرا رہے ہیں۔''

سندھ کے دور اندیش سیاستدانوں اور دانشوروں نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے کہ سندھ میں رہنے والے مہاجروں اور سندھیوں کے مفادات یکساں ہیں سندھی اور مہاجر فطری حلیف ہیں مہاجروں نے سندھ کو اپنے وطن ثانی کے طور پر قبول کیا اب ان کا مستقبل اور ان کے سارے مفادات اسی خطہ سرزمین سے وابستہ ہیں اور ان کا مرنا جینا اسی سرزمین سے ہے اس لئے ان دونوں کے مابین یکجہتی پیدا ہو رہی ہے تو اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے مہاجر سندھ کے اٹوٹ انگ ہیں انہیں سندھی تسلیم کیا جائے۔ سندھی شناخت کے معیار کو متعین کرنے اور اس پر غور و خوض کرنے والوں کا موقف ہے کہ بلوچ اپنے گھروں میں بلوچی بولنے کے باوجود سندھی تصور کئے جاتے ہیں بلکہ اپنے ساتھ بلوچ کا سٹ بھی لکھتے ہیں۔ وہ مہاجر جو ہندوستان سے ہجرت کر کے سندھ میں آباد ہوئے اور جنہوں نے سندھ کو وطن ثانی تسلیم کیا اصولی طور پر انہیں بھی سندھی تسلیم کیا جائے اور سندھی تشخص کی تعریف مقرر کی جائے۔ اس موقف کی حمایت کرنے والے سندھی دانشوروں کا کہنا ہے کہ

''سندھی ہونے کے لئے لازمی نہیں کہ جائے نسب سندھ ہو اور وہ سندھی بولتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو سندھ میں آباد بلوچوں کو سندھی کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا تھا سندھیوں نے بلوچوں کو نہ صرف سندھی مانا بلکہ بلوچوں کو رہنما بھی تسلیم کیا اور انہیں عزت اور توقیر بخشی سندھ میں آباد بلوچ سندھی اس لئے ہیں کہ ان کی بنیادیں سندھ میں ہیں اور ان کے مفادات بھی سندھ کی دھرتی سے وابستہ ہیں اس لئے اس اصول کا اطلاق مہاجروں پر بھی ہونا چاہئے۔ مہاجروں نے بلوچوں اور کچھیوں کی طرح سندھ میں اپنی نئی بنیادیں تعمیر کی ہیں۔ مہاجر کسی امتیاز اور شرط کے بغیر سندھی ہیں کیونکہ سندھی تشخص کی کسوٹی نسب، مذہب، یا زبان نہیں بلکہ بنیادیں ہیں، سندھ میں آباد دوسرے نسلی گروہوں مثلاً پنجابیوں اور پختونوں کے بارے میں سندھی دانشوروں کا موقف

مختلف ہے ان کی بنیاد والی کسوٹی پر یہ نسلی گروہ پورے نہیں اترتے تھے۔ ان سندھی رہنماؤں اور دانشوروں کا استدلال یہ تھا کہ اس اصول کا اطلاق پنجابیوں پر نہیں کیا جاسکتا اور نہ سندھی شناخت کے وسیع تر تصور کے تحت پنجابی سندھی تسلیم کیے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ سندھ میں آباد پنجابی زیادہ تر سول نوکر شاہی اور مسلح افواج کے ارکان اور ان کے رشتے دار ہیں جنہوں نے ریاستی اقتدار کے ذریعے سندھ میں وسیع وعریض زرعی اراضی حاصل کرلی ہے اور اپنے ساتھ پنجابی ملازمین' کسان اور مزدور بھی لائے ہیں۔ ان سندھی رہنماؤں اور دانشوروں کا موقف یہ تھا کہ یہ پنجابی ریاستی قوت کے بل پر سندھ میں فاتح اور غاصب کی حیثیت سے آئے تھے ان کی بنیادیں اور مفادات ابھی تک سندھ کے وسائل کو لوٹنے والے پنجاب سے وابستہ ہیں اس لئے یہ اب بھی پنجابی ہی ہیں۔ انہیں سندھ سے نکال دینا چاہئے اور زرعی اراضی فرزندان وطن سندھیوں کو واپس کردینا چاہئے۔

(حوالہ:- سندھ کے نسلی مسائل)

سندھ کے دانشوروں اور رہنماؤں کو اس بات کا بھی بخوبی احساس ہے کہ سندھ کے حقوق کی جدوجہد اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں مہاجروں کا وسیع تر تعاون حاصل ہو۔ انہیں اس بات کا ادارک ہے کہ مہاجروں سے اتحاد کی صورت میں سندھیوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں ہوگا۔ سندھی مہاجر اتحاد اور مشترکہ جدوجہد کی صورت میں سندھی عوام کے حقوق کے حصول کے زیادہ روشن امکانات ہیں۔ سندھ کے حقوق کی جدوجہد میں مہاجروں کی قربانیوں اور قیادت کی ذمہ داریوں کے حوالے سے سندھ کے قوم پرست رہنما سائیں جی ایم سید نے ایک انٹرویو میں اس طرف بہت پہلے ہی اشارہ کردیا تھا بقول سائیں جی ایم سید

''ہر صالح اور ذی شعور آدمی اپنے مفاد کو بہتر سمجھ سکتا ہے یہ مہاجر جو آئے ہیں ان میں زیادہ تر انٹلیکچوئیل ہیں اور انٹلیکچوئیل آدمی دیہاتی آدمی سے زیادہ سمجھ سکتا ہے دراصل

> ان کا اور ہمارا مفاد ایک ہے کیونکہ یہ بھی سندھ میں رہتے ہیں اور ہم بھی سندھ کے مستقل باشندے ہیں یہ دیہاتی نہیں ہیں زیادہ تر شہری ہیں اور شہری آدمی ہمیشہ لیڈ (قیادت) کرتا ہے یہ اقلیت میں ہیں لیکن قرآن نے کہا ہے سمجھ دار طبقہ اگر اقلیت میں ہو پھر بھی قیادت کرے گا۔ ''

سندھ دھرتی کے سچے قوم پرست رہنما سائیں جی ایم سید نے مہاجروں پر جو اعتماد اور بھروسہ کیا اور جو امیدیں انہوں نے مہاجر قیادت سے وابستہ کی تھیں اس کا مثبت جواب متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے خلوص دل اور سچائی سے دیا۔ انہوں نے سندھ کو اپنی دھرتی ماں اور سندھیوں کو اپنا محسن مانتے ہوئے سندھ کے حقوق کی جدوجہد میں ہراول دستہ کا کردار ادا کیا بلکہ انہوں نے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ

> اگر سندھ کے حقوق کی جدوجہد میں جان بھی دینی پڑی تو میں اس قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔ میری جان سندھ دھرتی کو غلامی سے نجات دلانے میں راہ حق میں چلی جاتی ہے تو میری روح خوش ہوگی۔ میں جان تو دے سکتا ہوں لیکن اسٹیبلشمنٹ کے آگے سر نہیں جھکاؤں گا اور نہ کبھی سندھ کے حقوق کا سودا کروں گا''

> سندھ دھرتی سے اپنے اٹوٹ رشتہ کا اظہار کرتے ہوئے الطاف حسین نے کہا۔

> ''سندھ ہماری مادر وطن ہے اور سندھی ہمارے محسن ہیں جنہوں نے اردو بولنے والوں کو اپنے دامن میں پناہ دی' رہنے کے لئے جگہ دی' کھانے کے لئے یہاں کی فصلوں کا اناج دیا اور پینے کے لئے سندھ دریا کا پانی دیا''

الطاف حسین نے ایم کیو ایم کی تشکیل نو کیساتھ ہی سندھیوں سے اتحاد اور یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

> ''ہم پر سندھیوں کا بڑا احسان ہے جب ہمارے لٹے پٹے قافلے ہندوستان سے یہاں پہنچے تو انہوں نے جس محبت سے ان کا والہانہ خیر مقدم کیا اور سگے بھائیوں جیسا

سلوک کیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم پر سندھیوں کا بڑا قرض ہے جو ہمیں چکانا ہے۔ لہٰذا سندھ کے مفاد کی جب بھی کوئی مشترکہ جدوجہد ہوئی ایم کیو ایم انشاء اللہ سندھیوں کے شانہ بشانہ اس میں شامل رہے گی''

ایم کیو ایم نے اپنے ابتدائی دور سے ہی سندھ کے مسائل پر آواز اٹھائی اور سندھیوں کے حقوق کی بات کی۔ انہوں نے 1987ء میں بھی کالا باغ ڈیم' سندھ میں غیر مقامی پولیس' جعلی ڈومیسائل' سندھ میں غیر فطری آبادی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ سندھ کی صوبائی خودمختاری کا بھی مطالبہ کیا۔ الطاف حسین نے اُس وقت بھی کالا باغ ڈیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''کالا باغ ڈیم سے صوبہ سندھ کو شدید اور ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ یہ صورتحال سندھ کے لوگوں کو مزید تکالیف پہنچانے اور احساس محرومی میں مزید اضافہ کا سبب بن رہی ہے''

آج بھی ایم کیو ایم تھل کینال اور کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے خلاف ہے۔ ایم کیو ایم نے اس مسئلہ پر سیمینار' پریس کانفرنس' بھوک ہڑتال' مظاہرے اور جلوس نکالے۔ سندھ کے حصہ کا پانی مانگنے کے جرم میں ایم کیو ایم کے رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کیا' ان کے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے گئے۔ غیر مقامی پولیس کا رویہ سندھ کی عوام کے ساتھ ہمیشہ انتہائی ظالمانہ رہا ہے۔ سندھ کی عوام کو پولیس کی زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے الطاف حسین شروع دن سے یہ مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ:

''کراچی سمیت سندھ کے تمام علاقوں میں پولیس سمیت دیگر متعلقہ تحقیقاتی اداروں و ایجنسیوں میں نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ ترین سطح تک صرف اور صرف مقامی افراد کو بھرتی کیا جائے۔ سندھ پولیس کے اعلیٰ ترین عہدوں سے لے کر نچلی سطح تک غیر مقامی افراد کی جگہ مقامی افراد کو تعینات کیا جائے موجودہ غیر مقامی پولیس افسران و اہلکاروں کو ان کے اپنے صوبے میں تعینات کیا جائے۔''

غیر مقامی آبادی کی اکثریت کسی قسم کا ٹیکس ادا کئے بغیر سندھ کے وسائل کو استعمال کر رہی ہے۔ سندھ میں غیر فطری آبادی کو روکنے اور سندھ کے وسائل کو بے جا استعمال سے بچانے کے لئے الطاف حسین نے 1987ء میں یہ تجویز پیش کی تھی:

''آبادی میں غیر فطری اضافہ کی وجہ سے صرف سندھ کے وسائل پر غیر معمولی بوجھ پڑ رہا ہے جبکہ اس کی وجہ سے سندھ میں نسلی و سماجی کشیدگیاں اور امتیازات جنم لے رہے ہیں۔ اس لئے حکومت سندھ ذرائع ابلاغ کی مدد سے ایک باقاعدہ مہم کے ذریعہ دوسرے صوبوں میں لوگوں کو یہ باور کرائے کہ اب سندھ میں ذرائع آمدنی محدود ہو چکے ہیں حتیٰ کہ نجی شعبے میں بھی مزید کھپت کی گنجائش ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سندھ اب آبادکاری میں مزید اضافہ کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ لہٰذا دیگر صوبوں کے حکام بالا اور وہاں کے سیاسی و سماجی رہنماؤں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں روزگار کے وسائل کا اضافہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ لوگوں کو اپنے اہل وعیال کو چھوڑ کر سینکڑوں ہزاروں میل کا سفر صرف روزگار کے لئے نہ کرنا پڑے''

جرائم پیشہ افراد پر مشتمل لینڈ مافیا سندھ کی شہری زمینوں پر قبضہ کر کے کچی آبادیاں بساتے ہیں ایسی مثال کسی اور صوبے میں نہیں ملتی۔ حکومت کی زمین پر ناجائز قبضہ کا کاروبار ریاستی قوانین کا کھلا مذاق ہے۔ جب سے کچی آبادیوں کو مستقل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے تب سے اس غیر قانونی کاروبار نے مافیا کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس صورتحال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے سب سے پہلے الطاف حسین نے اس کاروبار کو بند کرنے کا پرزور مطالبہ کرتے ہوئے کہا۔

''زمینوں پر ناجائز قبضہ کے عمل کو قابل دست اندازی پولیس عمل قرار دیا جائے۔ یہ ناجائز کاروبار کرنے والوں کیلئے سزا کا مناسب قانون بنایا جائے اور کسی بھی علاقہ میں زمین پر ناجائز قبضہ کی صورت میں متعلقہ تھانے دار کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے''

بے روزگاری کی وجہ سے سندھ کے نوجوانوں میں شدید احساس محرومی اور فرسٹریشن

میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ بے روزگاری کی ایک بنیادی وجہ جعلی ڈومیسائل کے ذریعے سرکاری ملازمتیں حاصل کرنا اور دوسری جانب سندھ کے سرکاری' غیر سرکاری و خود مختار اداروں' کارپوریشنوں' صنعتوں' بینکوں اور پولیس و دیگر محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر غیر مقامی بیوروکریسی قابض ہے جو قابلیت' تعلیم اور میرٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے قومیت کی بنیاد پر اپنے شہر اور اپنے رشتہ داروں کو ترجیحی بنیاد پر ملازمت دیتے ہیں جبکہ مقامی آبادی کے تعلیم یافتہ اور ہنر مند نوجوان اپنے ہی صوبے اور اپنے ہی شہر میں ملازمت کے لئے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ اس صورتحال نے سندھ میں بے روزگاری کے مسئلہ کو انتہائی پیچیدہ اور تکلیف دہ بنا دیا ہے۔ الطاف حسین نے 1987ء میں ہی اس مسئلہ کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''سندھ میں تمام سرکاری و غیر سرکاری اداروں' کارپوریشنوں اور انتظامیہ میں نچلی سطح سے اعلیٰ سطح تک عہدوں پر ملازمتوں کے لئے مقامی افراد کو ہر صورت میں اولیت دی جائے اور وہاں فائز غیر مقامی ملازمین و افسران کو اپنے صوبوں میں تعینات کیا جائے۔ انہوں نے اس موقع پر 1987ء کے ڈیلی نیوز میں شائع ہونے والی اس رپورٹ کا بھی حوالہ دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ سندھ کی پولیس و انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے سرکاری افسران میں سے 45 فیصد سندھ کا ڈومیسائل نہیں رکھتے۔ گریڈ 18 سے 21 تک فائز 67 سی ایس ایس اور سی ایس پی افسران میں سے 36 کے پاس سندھ کا' 24 کے پاس پنجاب کا' 4 کے پاس سرحد کا اور ایک کے پاس بلوچستان کا ڈومیسائل تھا''

سندھ کے جن اہم عہدوں پر غیر مقامی بیوروکریسی قابض ہے انہیں واپس بھیجنے اور مقامی افراد کو ان عہدوں پر تعینات کرانے کیلئے نام نہاد قوم پرستوں نے کبھی آواز اٹھائی اور نہ ہی انہوں نے سندھ کی غصب شدہ حقوق کی کوئی تحریک چلائی۔ ان نام نہاد قوم پرستوں کے برعکس سب سے موثر اور بھرپور آواز الطاف حسین نے اٹھائی' انہوں نے جرات اور بہادری سے

اسٹیبلشمنٹ کو للکارا اور ببانگ دہل کہا:

''ہم صرف اپنے حقوق چاہتے ہیں۔ ہم انسان ہیں اور جینے کا حق رکھتے ہیں۔ ہمیں غلامی منظور نہیں۔ ہمیں سندھ میں پنجابی پولیس' آئی جی' ڈی آئی جی' ہوم سیکریٹری' چیف سیکریٹری اور بیوروکریسی نہیں چاہئے۔ سندھ کو مکمل طور پر پنجاب کی اسٹیبلشمنٹ کی کالونی بنایا جا چکا ہے۔ آئی جی سے لے کر بیوروکریسی تک پنجاب سے لائی جاتی ہے۔ ہمیں صوبہ سندھ خود چلانے کا اختیار دیا جائے۔ سندھ ایک با اختیار صوبہ سندھ ہے مگر سندھ کو مکمل طور پر پنجاب کی اسٹیبلشمنٹ کی کالونی بنایا جا چکا ہے۔ سندھ قومی خزانہ میں 70 فیصد دیتا ہے اور سندھ کے بغیر پاکستان کو چار دن بھی نہیں چلایا جا سکتا لیکن سندھ کے ساتھ مسلسل ناانصافیاں کی جا رہی ہیں۔ اگر سندھ کو پنجاب کی اسٹیبلشمنٹ کی کالونی بنانے کا عمل جاری رہا تو کل سندھ کے عوام سندھ کے حقوق کا مطالبہ اقوام متحدہ میں حق خود ارادیت کے مطالبہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے''

''صوبوں کو 1940ء کی قراردادوں کی روح کے مطابق مکمل صوبائی خود مختاری ملنی چاہئے۔ وفاق کے پاس صرف کرنسی' خارجہ' دفاع کے محکمے ہوں۔ باقی تمام محکمے صوبوں کو دیئے جانے چاہئیں اور انہیں اپنے معاملات چلانے کا اختیار دیا جانا چاہئے۔ دفاع کے محکمے میں بھی کسی ایک صوبے کی اکثریت یا اجارہ داری نہ ہو بلکہ اس میں تمام صوبوں کا مساوی حصہ ہونا چاہئے۔ اگر فوج کسی ایک مخصوص صوبے یا علاقے کے لوگوں پر مشتمل ہو تو وہ علاقائی فوج کہلا سکتی ہے لیکن قومی فوج (National Army) نہیں کہلا سکتی۔ صوبے کے لوگوں پر مشتمل علاقائی فوج دوسرے صوبے کے لوگوں کو زیادتیوں کا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کرتی جیسے 1973ء میں فوج نے بلوچستان میں بمباری کی اور ہزاروں بلوچوں کو مار دیا گیا۔ 1983 میں سندھ میں فوج نے گوٹھوں پر لشکر کشی کی' قرآن مجید پڑھتے ہوئے لوگوں پر گولیاں چلائیں۔ اسی

طرح 19 جون 1992ء کو مہاجروں کے خلاف بدترین فوجی آپریشن شروع کیا اور ہزاروں مہاجروں کو بے دردی سے شہید کردیا گیا لیکن اسی فوج کو 1977ء میں تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں مظاہرین پر گولیاں چلانے کے احکامات دیئے گئے تو فوج کے افسروں نے گولیاں چلانے سے صاف انکار کردیا اور احتجاجاً استعفے پیش کردیئے اور کہا کہ ہم اپنی قوم کے لوگوں پر کیسے گولی چلا سکتے ہیں''

سندھ اور سندھیوں کے حقوق کی جدوجہد میں ایم کیو ایم نے ہراول دستہ کا کردار ادا کیا۔ سندھ کے مظلوم ہاری' کسان' دانشور اور طالب علم اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ ایم کیو ایم سندھ کے مفادات کا ہر حالت میں تحفظ کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ الطاف حسین کے فکر و فلسفہ، اتحاد و یکجہتی اور پیار و محبت کے پیغام کو سندھ میں پذیرائی مل رہی ہے۔ سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان غلط فہمیاں' دوریاں' رنجشیں اور خلیج تیزی سے ختم ہورہی ہے۔ ان کے درمیان مثالی اتحاد و یکجہتی کی فضا قائم ہورہی ہے، جو سندھ دھرتی کیلئے ایک نیک شگون ہے۔

سندھی اور اردو بولنے والوں کو اس بات کا بخوبی احساس ہو چکا ہے کہ دونوں کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اگر وہ ایک دوسرے کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی مفادات کو نقصان پہنچا رہا ہے اور وہ سندھ دشمن قوتوں کی سازشوں کا شکار ہے تو اس کا فائدہ سندھ دشمن عناصر کو ہوگا۔ ماضی میں بھی ایک سازش کے تحت اندرون سندھ زراعت اور شہروں میں صنعتوں کو تباہ کیا گیا۔ سندھ کے دیہی اور شہری علاقوں میں سازش کے تحت امن و امان کا مسئلہ پیدا کیا۔ تاکہ سندھ کی چھوٹی بڑی صنعتیں دوسرے صوبوں میں منتقل ہو جائیں۔ زراعت کو تباہ کرنے، زمین کو بنجر کرنے اور ہاری کو معاشی طور پر بدحال کرنے کے لئے پانی کا مسئلہ پیدا کیا گیا۔ اگر سندھ کے کھیتوں میں لہراتی فصلیں دیکھنی ہیں' کسان اور ہاری کے گھروں میں خوشحالی اور مسرت دیکھنی ہے' کارخانوں اور صنعتوں کو ایک بار پھر ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ سندھ کو زراعت و صنعت سمیت زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی دینی ہے' سندھ کو قرارداد پاکستان کے مطابق صوبائی خود

مختاری اورعوام کوان کے حقوق دلوانے ہیں تو پھر سندھی اور اردو بولنے والوں کو ماضی کی تمام رنجشوں اور غلط فہمیوں کو بھلا کر، متحد ہو کر اور ایک دوسرے کے ہر غم اور خوشی میں ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ سفر اسی طرح جاری رہا تو وہ وقت دور نہیں جب سندھ جبر واستحصال کے اس وائرس سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے گا جو وائرس سندھ کی خوشحالی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ جن قوتوں نے ماضی میں بھائی سے بھائی کو لڑوایا، سندھی مہاجر فسادات کرائے، ان میں تفریق اور نفرتیں پیدا کیں، بھائی کے ہاتھوں بھائی کا قتل کیا وہ ''فسادی'' قدرت کے مکافات عمل سے کبھی نہ بچ سکیں گے۔

الطاف حسین نے سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سندھی اور اردو بولنے والوں کو قریب لانے کے لئے اتحاد و یکجہتی، پیار و محبت کا جو پیغام دیا، اس سے سندھ میں موجود شہری اور دیہی تفریق ختم ہونا شروع ہوئی ہے۔ سندھی اور اردو بولنے والے ماضی کی غلط فہمیاں اور رنجشیں بھلا کر کھلے دل اور روشن ذہنوں کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ اگر یہ قربتیں اسی طرح بڑھتی رہیں، خلوص اور محبت کا یہ رشتہ اسی طرح پھلتا اور پھولتا رہا تو سندھ کی تقدیر بہت جلد سنور جائیگی، جس کا خواب شاہ عبداللطیف نے دیکھا تھا۔

سائیں سدا کرے تھے سندھ سکار
دوست مٹھا دلدار عالم سب آباد کریں

(یعنی اے میرے مولا! میرے سندھ پر اپنی رحمت کی بارش برسا اور ساتھ ہی ساری دنیا کو بھی آباد کر)

☆☆☆☆☆

پیپلز پارٹی کا مہاجر دشمن طرز عمل

امتیازی سلوک کا ہر عمل، ردعمل کا سبب بنتا ہے ہر ردعمل بھائی چارے، اتحاد اور یکجہتی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ امن و امان کے لئے عدل اور انصاف کا ہونا لازم اور ملزوم ہے اگر انسانوں سے انصاف پر مبنی سلوک روا نہ رکھا جائے تو سگے بھائی بھی تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جہاں مختلف طبقات مختلف گروہ اور مختلف ثقافت سے تعلق رکھنے والے افراد کا معاملہ ہو وہاں عدل و انصاف کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مختلف طبقات کے درمیان ناانصافیوں کا تدارک کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمام طبقات ہم آہنگی سے صوبے کی تعمیر و ترقی میں شانہ بشانہ جدوجہد نہ کرے۔ پیپلز پارٹی جو دیہی اور شہری سندھ کی تقسیم کی خالق ہے اس نے دیہی اور شہری کی اصطلاحات استعمال کر کے سندھ میں بسنے والے ایک طبقہ کو جسے مہاجر کہا جاتا ہے اس کے ساتھ ہر دور میں امتیازی سلوک روا رکھا۔ پیپلز پارٹی نے اپنے ہر دور میں مہاجروں کا معاشی' معاشرتی' ثقافتی اور تعلیمی سطح پر استحصال کیا۔ پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں مہاجروں کی نسل کشی کی گئی۔ ہزاروں بے گناہ مہاجروں کو جعلی پولیس مقابلے میں شہید کیا گیا اس دور حکومت میں مہاجروں پر جو ریاستی مظالم ڈھائے گئے' قتل و غارت گری کا جو بازار گرم کیا گیا اس کی مثال آج کے مہذب اور تعلیم یافتہ معاشرے میں ملنا مشکل ہے۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں جو قتل و غارت گری ہوئی۔ مہاجروں کے ساتھ جو امتیازی سلوک اور مہاجر دشمن رویہ اختیار رکھا گیا اس نے سندھ میں دیہی اور شہری تفریق کو مزید گہرا کیا۔

مہاجر معاشرے میں روایتی قیادت' موروثی سجادہ نشین اور جاگیرداری نظام کی کوئی حیثیت نہیں وہ معاشی اور معاشرتی ترقی میں اسے رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ پیپلز پارٹی پسماندہ قبائلی نظام' قدیم جاگیردارانہ سماج اور گوٹھانی بودوباش کی پیداوار ہے بلکہ فرسودہ فیوڈل سسٹم کی محافظ ہے۔ اس لئے وہ سائنس و ٹیکنالوجی پر مبنی شہری معاشرے اور شہروں میں پائی جانے والی جمہوری سوچ وفکر سے خوفزدہ ہے۔ وہ مہاجروں کو خوف اور تبدیلی کی علامت سمجھتی ہے۔ اسی خوف کی وجہ سے وہ مہاجروں کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ پیپلز پارٹی نے قطعی غیر جمہوری بلکہ فسطائی اور غیر منطقی اور غیر سائنسی انداز میں سندھ کی عوام کو شہری اور دیہی بنیاد پر تقسیم کرنے کی کوشش کی تاکہ صنعتی ترقی' بہتر نظام تعلیم' جمہوری سوچ اور مہاجروں کے فکر اور عمل کو دیہاتوں اور گوٹھوں میں پہنچنے سے روکا جاسکے۔ پیپلز پارٹی نے شہری آبادی کو دیہی آبادی سے دور رکھا اور دیہی آبادی کو شہری آبادی کے خلاف بدظن اور بدگمان کیا۔ پیپلز پارٹی پر قابض وڈیرہ شاہی شہری سندھ کے مسائل اور مصائب کا احساس اور ادراک کرنے سے عاری تھی بلکہ وہ کراچی کے وسائل اور شہری آبادی کا استحصال کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں سندھ کو دکھ اور تکالیف اٹھانی پڑی ہیں۔ پیپلز پارٹی نے اگر اپنے دور حکومت میں شہری سندھ کے ساتھ انصاف نہیں کیا تو دیہی سندھ کی کثیر آبادی بھی پیپلز پارٹی سے فیض یاب نہ ہوسکی۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ پیپلز پارٹی نے جاگیرداروں' وڈیروں اور نوکر شاہی کو خوب فائدے پہنچائے۔

پیپلز پارٹی کا پہلا دور حکومت

پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں پہلی بار سندھی مہاجر تنازعے نے جنم لیا۔ اس تنازعے کے محرک ذوالفقار علی بھٹو کے کزن ممتاز علی بھٹو تھے جنھوں نے اردو دان طبقہ کو اعتماد میں لئے بغیر لسانی بل کو یکطرفہ طور پر سندھ اسمبلی سے منظور کرانے کی کوشش کی اس متنازعہ بل کی وجہ سے سندھ میں حالات بگڑ گئے۔ سندھ حکومت نے ریاستی طاقت کے ذریعہ اس مسئلہ کو دبانے کی کوشش کی تو

امن و امان کی صورتحال مزید خراب ہوئی۔ ان واقعات میں پولیس کے ہاتھوں 57 اردو بولنے والے شہید ہوئے جس کے نتیجہ میں پیپلز پارٹی اور مہاجروں کے درمیان مزید دوریاں پیدا ہوئیں۔

پیپلز پارٹی سے مہاجروں کے متنفر ہونے کی ایک وجہ سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے مہاجرین کو پاکستانی تسلیم نہ کرنا اور انہیں واپس لانے سے انکار بھی تھا۔ وزیراعظم کی حیثیت سے ذوالفقار علی بھٹو نے 19 اپریل 1974ء کو دہلی میں سہہ فریقی معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے عام اردو داں طبقہ کو جنھوں نے پاکستان فوج سے آگے بڑھ کر جانی و مالی قربانی پیش کی تھیں۔ ان محصورین پاکستانیوں کو واپس لانے سے ذوالفقار علی بھٹو نے انکار کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے اس فیصلے نے بھی اردو دان طبقہ کو اس جماعت سے متنفر کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے سندھ میں کوٹہ سسٹم نافذ کرنے کیلئے یہ عذر پیش کیا تھا کہ وہ سندھ کی دیہی عوام کو شہری علاقوں کی طرح وہ سب سہولتیں فراہم کرنا چاہتے ہیں جو شہریوں کو حاصل ہے۔ اگر پیپلز پارٹی کا مقصد دیہی عوام کو ترقی دینا مقصود تھا تو پھر کوٹہ سسٹم چاروں صوبوں میں نافذ العمل کیا جانا چاہئے تھا اور اگر صرف سندھ میں کوٹہ سسٹم نافذ کرنا تھا تو یہ صوبائی مسئلہ تھا اسے صوبائی اسمبلی میں پیش کیا جانا چاہئے تھا مگر کوٹہ سسٹم کو قومی اسمبلی کے ذریعے آئینی تحفظ دیا دے کر ذوالفقار علی بھٹو نے سندھ کے ایک حساس مسئلہ کی ڈوریں اسلام آباد کی نوکر شاہی اور پنجاب کے سیاستدانوں کے ہاتھوں میں دے دیں۔

جاگیردارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کی حکومت نے صنعت کاروں پر ضرب لگائی۔ قومی تحویل (نیشنلائزیشن) کے خوبصورت نام کی آڑ میں بعض اہم صنعتوں کو ''بیورو کریڈائز'' کر کے ناتجربہ کار نوکر شاہی کی تحویل اور تصرف میں دے دیا۔ یہاں تک کہ مالیاتی سرمایہ اور بیمہ کمپنیوں کو بھی قبل از وقت قومیا کر ملکی معیشت اور صنعت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جس کا سب سے زیادہ نقصان کراچی اور مہاجروں کو پہنچا۔ یہی نہیں بلکہ مہاجروں پر ترقی کے تقریبا

تمام دروازے بند کردیئے گئے۔قومی تحویل کی پالیسی کے پیچھے بھی پیپلز پارٹی کی مہاجر دشمنی پوشیدہ تھی۔ 1973ء تک پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں ایسے قابل ذکر پرائیویٹ مالیاتی اور تعلیمی ادارے موجود نہیں تھے جو مالی طور پر مستحکم ہوں جن کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوں۔اس کے برعکس کراچی میں ایسے مالیاتی اور تعلیمی ادارے کثیر تعداد میں موجود تھے جو مالی استحکام اور اچھی شہرت کی وجہ سے ملک بھر میں پہچانے جاتے تھے۔ان پرائیویٹ اداروں سے مہاجروں کا روزگار وابستہ تھا۔مہاجروں کے قائم کردہ مالیاتی اداروں کو قومی تحویل میں لینے کے بعد مہاجروں کا دوہری تلوار سے قتل کیا گیا ایک جانب سینئر افسروں کو جبری طور پر ریٹائرمنٹ لینے پر مجبور کیا گیا تو دوسری طرف ان اداروں میں مہاجروں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔مہاجروں کے قائم کردہ مالیاتی اور تعلیمی اداروں کے دروازے ملک بھر کے لوگوں کیلئے کھول دیئے گئے۔ مالیاتی اور تعلیمی اداروں میں غیر مقامی افسر شاہی کو لاکر بٹھایا گیا جس نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدوں پر بھرتی کیا۔مہاجروں نے شب و روز محنت کر کے جن اداروں کو مالی طور پر مستحکم بنایا تھا چند ہی سالوں میں ان مستحکم مالیاتی اداروں کو لوٹ کر تباہ و برباد کردیا گیا۔ان مالیاتی اداروں سے سیاسی دباؤ پر قرض لئے گئے اور پھر سیاسی رشوت کی بنیاد پر ان قرضوں کو معاف کیا گیا۔

پیپلز پارٹی نے سندھ کے شہری علاقوں میں علاقائی تنازعات پیدا کر کے نئے انتخابی حلقے تشکیل دیئے۔شہری سندھ میں نئے انتخابی حلقے تشکیل دینے کا مقصد ایک جانب دیہی اور شہری تقسیم کا از سر نو چکر چلانا تھا تو دوسری طرف شہری سندھ سے اپنے امیدوار کامیاب کرا کر یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ شہری سندھ کی بھی جماعت ہے۔پیپلز پارٹی نے شہری سندھ سے اپنے امیدوار کامیاب کرانے کیلئے کراچی کے اطراف کی ایک پٹی کاٹ کر بابا بھٹ اور منوڑہ کے جزیروں پر نیا دیہی حلقہ تشکیل دیا۔دوسری جانب لانڈھی اور کورنگی کی کچھ آبادی کو کاٹ کر ایک اور حلقہ تیار کیا گیا۔کراچی کے قلب میں واقع لیاری کو دیہی علاقہ قرار دیتے ہوئے نئی حلقہ بندی کی گئی۔سندھ

کے شہری علاقوں سے غیر مہاجر آبادی کو الگ کرنے کا یہی عمل حیدر آباد، سکھر، نواب شاہ اور میر پور خاص میں دہرایا گیا۔ اندرون سندھ مہاجر آبادی پر مشتمل انتخابی حلقے بنائے جاتے تو یہاں سے صوبائی اور قومی اسمبلی کی نشست پر مہاجر امیدوار کامیاب ہو سکتے تھے مگر مہاجر آبادی کو آس پاس کے کئی حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی نے انتخابی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے شہری اور دیہی بنیاد پر انتخابی حلقوں کی تشکیل کی۔

پیپلز پارٹی نے پورے ملک سے مختلف جو فارمولا سندھ میں اختیار کیا اس کا مقصد دیہی اور شہری امتیاز و فرق کو قانونی جبر کے تحت برقرار رکھنا تھا۔ لسانی بل، کوٹہ سسٹم، پرائیویٹ اداروں کو قومی تحویل میں لینے کا عمل' ملازمتوں پر پابندی، 1300 ملازمین کی برطرفی' شہری علاقوں کی تقسیم اور محصورین پاکستانیوں کو پاکستانی تسلیم کرنے سے انکار جیسے غیر منصفانہ اقدامات اور امتیازی سلوک نے مہاجروں کو پیپلز پارٹی سے متنفر کیا۔ پیپلز پارٹی نے مہاجروں کے ساتھ معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی میدان میں جو غیر جمہوری، غیر اخلاقی، غیر مہذب اور غیر اصولی رویہ اختیار کیا اس کا ذمہ دار مہاجر پیپلز پارٹی کی قیادت اور وڈیرہ شاہی کو سمجھتے ہیں جو جمہوریت کا نام لیکر درحقیقت جاگیرداری نظام کی محافظ اور وارث بنی ہوئی ہے۔

پیپلز پارٹی نے ''شہری'' اور ''دیہی'' کی گمراہ کن اصطلاحات میں اصل مقاصد اور محرکات کو چھپانے کی کوشش کی۔ پیپلز پارٹی کا بنیادی مقصد سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان امتیاز کی لکیر کھینچنا اور انھیں دو گروہوں میں تقسیم کرنا تھا۔ سرکاری طور پر پاکستانیوں کے شہریوں کو بلا امتیاز اور مساوی شہری تسلیم کرنے سے انکار اور انہیں لسانی، نسلی اور علاقائی دائروں میں تقسیم کر کے انہیں آپس میں دست و گریباں کرنا، انہیں کبھی باہم شیر و شکر نہ ہونے دینا اور اپنی اپنی علیحدہ شناخت کو دائمی صورت میں باقی رکھنے پر مجبور کرنا تھا۔

پیپلز پارٹی کا دوسرا دور

1988ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی 207 نشستوں میں سے پیپلز پارٹی نے

صرف 93 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ اسلامی جمہوری اتحاد نے 54 نشستوں پر اور ایم کیو ایم نے 13 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ پیپلز پارٹی کی 93 نشستوں میں سے 39 نشستوں سے ایسے امیدوار کامیاب ہوئے تھے جو ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ اور مسلم لیگ جونیجو کی غیر جماعتی حکومت کے رکن رہ چکے تھے۔ اگر ایم کیو ایم پیپلز پارٹی کی غیر مشروط حمایت نہ کرتی تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ مفاد پرست 39 ممبران وفاداری تبدیل کر لیتے اور اقتدار کی ہما اڑ کر کسی اور کے سر پر بیٹھ جاتی۔ ایم کیو ایم کے فیصلہ کن ووٹوں کی بدولت پیپلز پارٹی کی مرکز میں حکومت قائم ہوئی۔ ایم کیو ایم نے وزارت عظمیٰ کیلئے بے نظیر بھٹو کی حمایت اس بنیاد پر کی تھی کہ پیپلز پارٹی سندھ کی محرومیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ ایم کیو ایم پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر سندھ کے حقوق کی جدوجہد، سندھی مہاجر یکجہتی کے فروغ اور ماضی کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو ختم کرنے میں اپنا بھرپور کردار کرنا چاہتی تھی۔

پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان اتحاد کی صورت میں دونوں جماعتوں کے درمیان ''اعلان کراچی'' کے نام سے 58 شقوں پر مشتمل ایک معاہدہ طے پایا۔ ''اعلان کراچی'' کا بنیادی مقصد سندھ کی تعمیر و ترقی، سیاسی افہام و تفہیم پیدا کرنا، وسیع تر سیاسی مفادات میں جمہوری عمل اور عوامی اقتدار کو استحکام دینا، استحصال زدہ عوام اور مختلف طبقوں کے حقوق کی آواز بلند کرنا، انفرادی اور اجتماعی طور پر سندھ میں آباد تمام باشندوں کے لسانی، نسلی، امتیاز کے بغیر حقوق کی حفاظت کرنا، معاشرے کے ہر طبقے کو اپنے مخصوص کلچر اور زبان کی ترویج و اشاعت کی آزادی دینا تھا۔ ایم کیو ایم کی جانب سے اس معاہدے میں مندرجہ ذیل شرائط کو شامل کیا گیا۔

☆......سندھ کے تمام بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیمی ادارے کھولے جائیں گے۔

☆......تعلیمی سیکٹر کے لئے قومی آمدنی کا حصہ بڑھا کر 4.5 فیصد کر دیا جائے گا اور کوئی بھی فنڈ ضائع نہیں ہونے دیا جائے گا۔

☆ ......حیدر آباد کے ڈگری کالجوں کو پوسٹ گریجویٹ سہولت کے ساتھ یونیورسٹی سے منسلک کر دیا جائے گا۔

☆ ......سندھ میں صحت کے شعبہ کیلئے بجٹ میں اضافہ کر دیا جائے گا۔

☆ ......موجودہ اسپتالوں کی حالت بہتر بنائی جائے گی۔

☆ ...... جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر کو خود مختار بنایا جائے گا اور سندھ میڈیکل کالج کو تدریسی سہولت دی جائے گی۔

☆ ...... میٹروپولیٹن حیدر آباد کی توسیع کے پیش نظر دو سو بستروں کے ساتھ ایک اسپتال اور میٹرنٹی سینٹروں کا قیام بھی عمل میں لایا جائے گا۔

☆ ...... خود مختار اداروں کے صدر دفاتر معروضی اختیارات کے دباؤ کے بغیر منتقل نہیں کیے جائیں گے۔

☆ ...... پاک بھارت تعلقات معمول پر آنے اور قومی دفاع کے تقاضوں اور دیگر متعلقہ معاملات کو سامنے رکھتے ہوئے کھوکھرا پار کا راستہ کھول دیا جائے گا۔

☆ ......وہ تمام پاکستانی جو اپنی مرضی اور حالات کے دباؤ کے باعث بیرون ملک مقیم ہیں انہیں پاکستانی شہریوں کے مساوی تمام حقوق حاصل ہونگے۔

☆ ...... پاکستان اور افغانستان کے درمیان باہمی سمجھوتے کے مطابق تمام افغان مہاجرین کو واپس ان کے ملک بھیج دیا جائے گا اور اگر مالی وسائل نے اجازت دی تو منتقلی کے عمل کو تیز کرنے کیلئے افغان مہاجرین کو پاک افغان سرحد کے قریب کیمپوں میں منتقل کر دیا جائے گا۔صرف پاکستان کے شہری ہی ملک میں جائیداد خریدنے کا حق رکھتے ہیں۔

☆ ......اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنے اور عوام کی سلامتی کا تحفظ حکومت کا اہم ترین فرض ہونے کے پیش نظر اسلحہ کے لائسنس قومی وصوبائی اسمبلیوں اور سینٹ کے ارکان کی

سفارش کے بغیر جاری نہیں کیے جائیں گے۔ غیر قانونی اسلحہ کو ضبط کرنے کیلئے فوری اقدامات کیے جائیں گے۔

☆......سندھ اسمبلی کے منتخب نمائندوں پر مشتمل کمیٹی ایم کیو ایم کی تجاویز سمیت ڈومیسائل سرٹیفکیٹس اور قومی شناختی کارڈ کے دائرہ کار اور اجراء کا جائزہ لے گی تاکہ مقامی باشندوں کے حقوق کا پوری طرح تحفظ کیا جائے۔

☆......مزید برآں یہ کمیٹی پولیس کے محکمے میں تمام سطحوں پر مقامی باشندوں کی بھرتی کا جائزہ لے گی۔

☆......مقامی باشندوں کے جن حقوق کا تحفظ 1973-74ء میں جاری کردہ ایس۔ آر۔ او میں کیا گیا ہے ان کو پوری طرح نافذ کیا جائے گا۔ صوبے میں مسلسل صنعتی ترقی ہوگی۔ صنعتوں کو بجلی مہیا کرنے کے طریقے کار کو آسان بنایا جائے گا اور جہاں ممکن ہوگا "ون ونڈو" آپریشن کے طریقے پر عمل کیا جائے گا۔

☆......صنعتی اور دوسری کاروباری تنظیموں میں کنٹریکٹ لیبر کے نظام کو ختم کیا جائے گا۔ صوبے کے سرکاری اور پرائیویٹ صنعتی اداروں میں ملازمت دینے میں مقامی باشندوں کو ترجیح دی جائے گی۔

☆......سندھ کے تمام ایسے باشندوں کو جن کا اپنا گھر نہیں ہے رعایتی بنیادوں پر پلاٹ اور قرضے دیئے جائیں گے تاکہ وہ متفقہ ہاؤسنگ پالیسی کے مطابق اپنے مکانات تعمیر کر سکیں۔

☆......کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کو واپڈا سے الگ کیا جائے گا اور اس کا کنٹرول حکومت سندھ کو دیا جائے گا۔

☆......فیول ایڈجسٹمنٹ چارجز کی شرح ملک میں یکساں مقرر کی جائے گی۔

ایم کیو ایم نے گیارہ ماہ تک پیپلز پارٹی کی حمایت کی اور وقتاً فوقتاً معاہدے کے بارے

میں یاددہانی بھی کراتی رہی مگر پیپلز پارٹی نے معاہدے پر عملدرآمد کرنے کی بجائے ایم کیوایم کے خلاف ہی انتقامی کارروائی شروع کردی۔ پیپلز پارٹی کی جانب سے ایسے حالات پیدا کئے جانے لگے کہ ایم کیوایم معاہدہ توڑ دے یا حکومت سے ازخود علیحدہ ہوجائے۔ معاہدہ کراچی ٹوٹنے کی ایک وجہ یہ بھی بنی کہ پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومت نے ایم کیوایم کو حکومت میں ساتھ رکھنے پر وسیع القلبی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی معاہدے کی کسی شق پر عملدرآمد کرنے کی کوشش کی۔ پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومت اس پالیسی پر گامزن تھی کہ ''جاتے ہیں تو جائیں'' ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ ایم کیوایم کو جب اس بات کا قوی یقین ہوگیا کہ پیپلز پارٹی معاہدہ پر عمل کرنے اور سندھ کے مسائل حل کرنے میں سنجیدہ نہیں بلکہ وہ قومی دولت لوٹنے میں معروف ہے اس نے پیپلز پارٹی سے اتحاد ختم کرنے کا باقاعدہ اعلان کیا۔

تحریک عدم اعتماد

اسلامی جمہوری اتحاد کی جانب سے پیپلز پارٹی کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش ہوئی تو ایم کیوایم نے اپنا جمہوری حق ادا کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کے خلاف عدم اعتماد تحریک کا ساتھ دیا۔ پیپلز پارٹی نے عدم اعتماد تحریک کو ناکام بنانے کیلئے اور نواز شریف نے عدم اعتماد تحریک کو کامیاب کرنے کیلئے قومی اسمبلی کے چالیس آزاد ارکان اسمبلی کو خریدنے کا غیر جمہوری طریقہ اختیار کیا۔ ارکان قومی اسمبلی کی خرید وفروخت میں پیپلز پارٹی کامیاب رہی اور یوں وہ تحریک عدم اعتماد سے بچ گئی۔ پیپلز پارٹی نے ایم کیوایم کو اس بات کی سزا دینے کے لئے کہ اس نے تحریک عدم اعتماد میں اُس کا ساتھ نہیں دیا' پیپلز پارٹی نے نام نہاد قوم پرستوں کے ساتھ مل کر ایک نیا پروپیگنڈا شروع کیا۔ نام نہاد قوم پرست جماعتیں جو پیپلز پارٹی کی بی ٹیم کا کردار ادا کرتی رہی ہیں' انہوں نے سندھ میں عوام کو گمراہ کرنے کے لئے یہ پروپیگنڈا کیا کہ ایم کیوایم نے تحریک عدم اعتماد میں پیپلز پارٹی کا ساتھ نہ دے کر سندھ سے غداری کی ہے اس طرح کے الزامات لگا کر انہوں نے

سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان بدگمانیاں اور دوریاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ یہی قوم پرست جماعتیں معاہدہ کراچی کے خلاف تھیں ان جماعتوں کا موقف تھا کہ پیپلز پارٹی نے ایم کیو ایم سے معاہدہ کرکے سندھیوں سے غداری کی ہے۔ بقول رسول بخش پلیجو ''اعلان کراچی سندھ اور سندھیوں کے مفادات کے خلاف ہے''۔ قوم پرست جماعتوں نے پیپلز پارٹی کے اشارے پر شہری اور دیہی تفریق بڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ایک منظم سازش کے تحت سندھ بھر میں لسانی فسادات کرائے گئے۔ مہاجر خاندان جو اندرون سندھ برسوں سے رہ رہے تھے ایک دوسرے کے غم و خوشی میں شریک تھے، خود کو سندھی سمجھنے پر فخر کرتے تھے، انھیں اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ پیپلز پارٹی اور قوم پرست جماعتوں نے اسٹیبلشمنٹ کی ایماء پر سندھ میں نفرت اور تعصب کی ایسی آگ بھڑکائی جس نے برسوں سے قائم رشتے ناتوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔

حیدرآباد پکا قلعہ سانحہ

پیپلز پارٹی کی ہدایت پر حیدرآباد میں پکا قلعہ آپریشن کیا گیا اس آپریشن کے مرکزی کردار میں سندھ پولیس کے آئی جی آغا سعادت علی شاہ اور کمشنر سالک نذیر تھے جنہوں نے وفاقی وصوبائی حکومت کی ہدایت اور منظوری سے حیدرآباد میں بے گناہ لوگوں کے خون سے ہولی کھیلی اس آپریشن میں دو سو سے زیادہ بے گناہ مہاجر خواتین اور بچے شہید ہوئے، سینکڑوں نہتے اور معصوم شہری شدید زخمی ہوئے۔ پیپلز پارٹی نے سندھ میں موجود دیہی اور شہری تقسیم کو مزید بڑھانے کیلئے حیدرآباد آپریشن میں اندرون سندھ کے مختلف اضلاع سے چھ ایس پی بلوائے جن میں دادو کے دین محمد بلوچ، ٹھٹھہ کے ذوالفقار علی شاہ، بدین کے خورشید بخاری، سانگھڑ کے فاروق امین اور ضلع حیدرآباد کے ایس پی ملوک جاگیرانی شامل تھے۔ پولیس نے آپریشن سے قبل علاقہ میں ایسی صورتحال پیدا کی جو اس سے پہلے کسی نے دیکھی نہ سنی تھی۔ ہزاروں افراد کو خوف اور دہشت میں مبتلا کرنے کے لئے پورے علاقے کی بجلی کاٹ دی گئی، پانی اور گیس کی لائن بھی بند کر دی گئی،

شدید گرمی میں لاکھوں افراد محصور ہو کر رہ گئے۔دس روز سے کرفیو میں قید بھوکے پیاسے انسان پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے تھے' معصوم بچے دودھ کیلئے بلک رہے تھے بحالت مجبوری جب مائیں اپنے بچوں کے لئے پانی مانگنے کیلئے سر پر قرآن مجید رکھ کر گھر سے باہر نکلیں تو ان کا خیال تھا کہ پولیس قرآن مجید کی حرمت کا خیال کرے گی اور بلا جواز خواتین اور بچوں پر گولیاں نہیں چلائیں گی مگر جیسے ہی کئی روز کی بھوکی پیاسی خواتین اور بچوں نے گھروں سے قدم باہر نکالا۔جنرل ڈائر کے جانشینوں نے ان معصوم بچوں اور خواتین پر فائر کھول دیئے۔تین گھنٹے تک ان بے گناہ نہتے لوگوں پر گولیاں برسائی جاتی رہیں۔پورے علاقے میں کہرام مچ گیا، ہر جگہ خون بہہ رہا تھا، خواتین اور بچے زخموں سے چور سڑک پر امداد کے منتظر تھے مگر کسی کو زخمیوں کو اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔فوجی ذرائع کے مطابق پہلے دن مرنے والوں کی تعداد 101 تھی اور زخمیوں کی تعداد 257 تھی۔جاں بحق ہونے والوں میں 30 عورتیں اور تین معصوم بچے بھی شامل تھے۔بے نظیر بھٹو نے پکا قلعہ آپریشن میں جاں بحق ہونے والی بے گناہ خواتین اور معصوم بچوں کے گھر جا کر تعزیت کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی بلکہ ان کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے مرنے والوں کو دہشت گرد کہا۔بے نظیر بھٹو کے پہلے دورِ حکومت میں ماضی سے زیادہ مہاجروں کا قتل عام ہوا، سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان پہلے سے زیادہ دوریاں اور خلیج پیدا ہوئی۔پیپلز پارٹی نے سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان نفرتوں کی ایسی آگ بھڑکائی جس نے سندھ کی خوشحالی اور یکجہتی کو جلا کر راکھ کر دیا۔

پیپلز پارٹی کا تیسرا دور

1993ء میں پیپلز پارٹی کو ایک بار پھر بے نظیر بھٹو کی قیادت میں مرکز اور صوبوں میں حکومت بنانے کا موقع ملا مگر بے نظیر بھٹو نے اقتدار سنبھالنے کے بعد نہ صرف ماضی کی غلطیوں کو دہرایا بلکہ ایم کیو ایم کو دیوار سے لگانے کی پوری کوشش کی۔اس کے برعکس ایم کیو ایم نے ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر سندھ کے وسیع مفاد میں پیپلز پارٹی سے تعاون کرنے کا اعلان کیا مگر پیپلز پارٹی نے

ایم کیوایم کو صاف جواب دے دیا کہ وہ اپوزیشن میں بیٹھ کر حزب اختلاف کا کردار ادا کرے۔ ہمیں ایم کیوایم کے تعاون کی ضرورت نہیں۔ پیپلز پارٹی نے شروع دن سے ایم کیوایم کے خلاف جو رویہ رکھا وہ اس بات کا عندیہ تھا کہ پیپلز پارٹی سندھ میں دیہی اور شہری کی تفریق کو مزید بڑھانا چاہتی ہے۔ بے نظیر بھٹو نے مہاجروں کیلئے ''بزدل چوہے'' ''دہشت گرد'' اور ''وطن دشمن'' جیسے غیر اخلاقی اور نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ بے نظیر نے قصور میں تقریر کرتے ہوئے مہاجروں کیلئے جو غیر مہذبانہ زبان استعمال کی اس کی چبھن آج بھی دلوں میں محسوس کی جاتی ہے۔ بے نظیر بھٹو نے تقریر کرتے ہوئے مہاجروں کے بارے میں کہا تھا کہ

''بزدل چوہے کراچی میں امن وامان تباہ کررہے ہیں اور فساد پھیلا رہے ہیں..... کراچی کے عوام ان بزدل چوہوں سے نفرت کرتے ہیں ..... اب یہ لوگ خود کو بچانے کیلئے خواتین کو آگے لا رہے ہیں..... بزدل چوہے کلاشنکوف لئے گھومتے ہیں اس لئے لوگ ان سے ڈرتے ہیں ..... لیکن کلاشنکوف لے کر گھومنے اور کراچی کو کربلا بنانے والے معصوم کیسے ہوسکتے ہیں.....؟ کراچی کو کربلا بنانے والے اور معصوم لوگوں کا خون بہانے والے یہ لوگ ..... اگر یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں عوامی حمایت حاصل ہے تو وہ کلاشنکوف پھینک کر کراچی میں مجھ سے الیکشن لڑیں انہیں اپنی اصلیت کا پتہ چل جائے گا..... ڈرگ مافیا کے مقاصد پورے نہیں ہونے دیں گے ..... اور احتساب کا عمل ختم نہیں کریں گے ..... منشیات فروشوں اور فرقہ وارانہ فسادات کرانے والوں سے ہماری کھلی جنگ ہے..... ہم اب کسی کو یہاں کربلا نہیں بنانے دیں گے ..... اور اب کوئی نوجوانوں کو شکار نہیں کرسکے گا..... کراچی میں دہشت گردی کرنے والوں کا انجام قریب آ چکا ہے..... عوام میں ان کی جڑیں ختم ہو چکی ہیں..... ہم

> کراچی کے شہریوں کا سکون پامال کرنے والے دہشت گردوں سے بھرپور نکر لیں گے، اور انہیں پوری قوت سے کچل دیں گے...... دہشت گردوں کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا گیا ہے......اور اب ہم کلاشنکوف کلچر ختم کر کے دم لیں گے...... قانون شکن عناصر سے کوئی رعایت نہیں کی جائے گی...... جو لوگ بھارت کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں ان کی رگوں میں وہ خون نہیں جو باقی قوم کی رگوں میں دوڑ رہا ہے......ان لوگوں نے معصوم شہریوں، قلمکاروں، صحافیوں اور رینجرز اور پولیس والوں کو شہید کیا ہے......فساد پھیلانے والی تنظیم کا نعرہ ہے کہ جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے......محب وطن لوگوں کا نعرہ ہے جو وطن کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے۔

دیہی شہری تفریق کو بڑھانے کے لئے پیپلز پارٹی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی نے یہ بیان دیا کہ: "1947ء میں یوپی، سی پی اور بہار سے آنے والوں کو کراچی سے واپس جانا ہوگا۔" وزیراعلیٰ سندھ عبداللہ شاہ نے کہا کہ "ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجروں کے لئے سندھ میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ واپس ہندوستان چلے جائیں۔ انہیں سندھ اسمبلی کا رکن یا وزیر بننے کا کوئی حق نہیں۔" پیپلز پارٹی کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے کراچی کو "شکارگاہ" اور "مقتل گاہ" سمجھ کر مہاجروں کے خون سے ہولی کھیلی ہے ایسی مثال کسی مہذب اور جمہوری معاشرے میں ملنا مشکل ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں عوام کو تحفظ دینے والے اور مملکت کی نگہبانی کرنے والے اداروں نے اپنی ہی ریاست کے بے گناہ اور معصوم شہریوں کے خون سے ہاتھ رنگ لیں۔ پیپلز پارٹی کے اس دورِ حکومت میں ہر روز بے گناہ مہاجر کا ماورائے عدالت قتل ہوتا تھا۔ جیل میں اسیر قیدیوں کو جعلی پولیس مقابلوں میں شہید کیا جاتا تھا۔ ایم کیو ایم کے سینیٹر، قومی وصوبائی اسمبلی کے ممبران، عہدیداران وکارکنان پر ہزاروں کی تعداد میں جھوٹے مقدمات بنائے گئے، انہیں پابند

سلاسل کیا۔ظلم وزیادتی کی حد تو یہ تھی کہ ایم کیوایم کی خواتین کارکنوں کو قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اغوا کیا' انہیں انتہائی اذیت ناک تشدد کا نشانہ بنایا۔ انہیں اڈیالہ جیل اور اسلام آباد کے سرکاری عقوبت خانوں میں کئی کئی ماہ اسیر رکھا گیا۔وزیر داخلہ نصیراللہ بابر نے بے نظیر بھٹو کے حکم پر سعودی عرب میں 16 سال سے مقیم مہاجروں کو بھی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا۔انہیں سعودی عرب سے اغوا کر کے اسلام آباد لایا گیا یہاں انہیں اذیت ناک تشدد کا نشانہ بنایا۔

پیپلز پارٹی کے تیسرے دور حکومت میں شہری اور دیہی تفریق اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اسے مٹانے میں طویل وقت کے ساتھ ساتھ دونوں طبقوں میں سے کسی ایک کو آگے بڑھ کر دوسرے بھائی کو گلے لگانے اور ماضی کے اختلافات کو بھلا کر سندھ کے وسیع تر مفاد میں سندھی اور اردو بولنے والوں کو یکجا کرنے کی اشد ضرورت تھی۔اس اہم ذمہ داری اور فرض کو کمال بصیرت اور دانشمندی سے ایم کیوایم کے قائد الطاف حسین نے ادا کیا۔انہوں ماضی کے تمام اختلافات کو بھلا کر سندھ کے مستقل باشندوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے ،دیہی اور شہری تقسیم کو پیار ومحبت سے پاٹنے کی بھرپور کوشش کی۔انہوں نے ہر سطح پر سندھ کے حقوق کی آواز بلند کی بلکہ سندھ کی مکمل صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا۔ایم کیوایم نے کالاباغ ڈیم' تھل کینال جسے ایشو پر نہ صرف آواز بلند کی بلکہ ان مسائل پر ہڑتال،مظاہرے،سیمینارز،کانفرنسیں اور گرفتاریاں تک پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ خلوص دل اور نیک نیتی سے دیہی اور شہری تفریق ختم کرنا چاہتی ہے۔

کوٹہ سسٹم

کوٹہ سسٹم کا نام پہلی بار خواجہ ناظم الدین کی حکومت میں سنا گیا جب مشرقی پاکستان کی 56فیصد اور مغربی پاکستان کی 44فیصد آبادی کے درمیان سرکاری ملازمتوں میں موجود غیر متوازن تناسب کو منصفانہ بنانے کے لئے کوٹہ سسٹم کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔اس وقت جو فارمولا وضع کیا گیا اس میں مرکز کے زیر انتظام علاقوں اور ملک کے دارالحکومت کراچی کا کوٹہ آبادی

کے تناسب سے 2 فیصد مقرر کیا گیا۔ ایوب خان کے دور تک اس فارمولے کے تحت عملدرآمد ہوتا رہا۔ کوٹہ سسٹم کا تیسرا دور ون یونٹ کے خاتمے اور سابق صوبوں کی بحالی کے بعد شروع ہوا۔ اس مرحلے پر ایک بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ کراچی کی علیحدہ حیثیت جو قائداعظم کے زمانے سے چلی آرہی تھی ختم کر دی گئی اور اسے سندھ کا دارالحکومت بنا دیا گیا کیونکہ نیا دارالحکومت اسلام آباد اس کی جگہ لے چکا تھا۔ اس تبدیلی کے وقت ایک ستم ظریفی یہ کی گئی کہ کراچی کو سندھ میں ضم کر کے اسے صوبے کا جز تو بنا دیا گیا اور چیف کمشنر کی بجائے یہاں بھی ایک ڈویژنل کمشنر کا تقرر کر دیا گیا لیکن خواجہ ناظم الدین کے دور میں ملازمتوں کا جو 2 فیصد کوٹہ دیا گیا تھا وہ جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ کراچی صوبہ سندھ کا جزو اور اس کا دارالحکومت تو بن گیا مگر مرکزی ملازمتوں میں اس کا تناسب وہی رکھا گیا جو مشرقی پاکستان کی موجودگی اور اس وقت مختلف صوبوں کی آبادی کے تناسب کی بنیاد پر مقرر کیا گیا تھا۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کی آبادی کے تناسب سے کراچی کی آبادی کو اس کا حصہ دیا جاتا۔ امتیازی سلوک صرف کراچی کے ساتھ روا رکھا گیا کہ وہ سندھ کا دارالحکومت بھی رہا اور مرکزی سطح کی ملازمتوں میں سندھ کا علیحدہ اور کراچی کا علیحدہ کوٹہ بھی برقرار رہا۔ اس غیر منطقی اور غیر منصفانہ فیصلے میں مزید سنگینی اور پیچیدگی ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہوئی جب سندھ کو شہری اور دیہی حلقوں میں تقسیم کرنے کیلئے شہری اور دیہی کوٹہ نافذ کیا گیا جس کے تحت کراچی، حیدرآباد اور سکھر شہری علاقے قرار دیئے گئے۔ پیپلز پارٹی نے دیہی اور شہری کی بنیاد پر کوٹہ سسٹم کو جائز قرار دینے کیلئے یہ استدلال پیش کی کہ سندھ میں دیہی اور شہری آبادی کے درمیان تعلیم اور روزگار کے شعبہ میں وسائل کی تقسیم برابر نہیں لہذا سندھ کے دیہی علاقوں کو شہری علاقوں کے برابر لانے کیلئے سندھ میں 10 سال کیلئے شہری اور دیہی کوٹہ نافذ کیا جائے۔ 1973ء میں کوٹہ سسٹم کو آئین کے ذریعہ 10 سال کا تحفظ فراہم کرتے ہوئے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے قوم سے وعدہ کیا تھا: ''دیہی عوام کو شہری علاقوں کی طرح وہ سب بنیادی سہولتیں فراہم کرنا چاہتا ہوں جو شہریوں کو حاصل ہیں۔ مثلاً تعلیم، روزگار، اسپتال اور راستے

وغیرہ، 10 سال کے اندر اندر دیہی آبادی کو ترقی دینے کے بعد کوٹہ سسٹم ختم کر دیا جائے گا۔"

دیہی اور شہری' ترقی یافتہ اور پسماندہ علاقوں کا فرق دنیا کے ہر ملک میں موجود ہے، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی' جاپان، کوریا، چین اور روس میں سے کون سا ملک ہے جہاں یہ فرق موجود نہیں اور جہاں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی مرکزیت دارالحکومت یا دو تین بڑے شہروں تک محدود نہ ہو۔ مگر ان میں سے کوئی ملک ایسا نہیں جہاں داخلوں اور ملازمتوں میں شہری اور دیہی کا فرق روا رکھا جاتا ہو یہ فرق تو پاکستان کے باقی تین صوبوں میں بھی موجود نہیں، کوٹہ سسٹم کا یہ نظام اگر انصاف پر مبنی تھا تو پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے دیہی عوام کو اس انصاف سے کیوں محروم رکھا گیا سیدھی سی بات ہے کہ پیپلز پارٹی نے "شہری اور دیہی" کی گمراہ کن اصطلاحات میں اصل مقاصد اور محرکات کو چھپانے کی کوشش کی۔ بنیادی مقصد سندھ میں آباد اردو اور سندھی بولنے والوں کے درمیان امتیاز کی لکیر کھینچنا اور انہیں دو گروہوں میں تقسیم کرنا تھا۔ اس کا مطلب سرکاری طور پر پاکستان کے شہریوں کو بلا امتیاز اور مساوی حیثیت سے شہری تسلیم کرنے سے انکار اور انہیں لسانی، نسلی اور علاقائی دائروں میں تقسیم کرنا تھا۔ اس تقسیم کا مقصد سندھی اور اردو بولنے والے کو باہم شیر و شکر ہونے سے روکنا اور انہیں اپنی اپنی علیحدہ شناخت کو دائمی صورت میں باقی رکھنے پر مجبور کرنا تھا۔ کوٹہ سسٹم کو نافذ ہوئے 30 سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر سندھ کے غریب ہاری اور کسان آج بھی اچھے اور معیاری تعلیمی اداروں سے محروم ہیں۔ بے روزگاری پہلے سے زیادہ موجود ہے۔ اگر اسپتال کے نام پر عمارتیں تعمیر کر بھی دی گئیں ہیں تو وہاں ڈاکٹر اور طبی عملہ غائب ہے۔ اسپتال میں مریضوں کے لئے دوائیں موجود نہیں۔ سندھ میں آج بھی 90 فیصد لوگ بنیادی اور لازمی سہولتوں سے محروم ہیں، حد تو یہ ہے کہ انہیں پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں۔

دیہی اور شہری کی تقسیم سے سندھی اور اردو بولنے والے دونوں ہی طبقے ناانصافی کا شکار ہوئے۔ کوٹہ کی بنیاد تعلیمی ادارے کو بنانے کی بجائے جائے پیدائش رکھی گئی جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ وڈیروں کے بچوں نے تعلیم تو کراچی اور حیدر آباد کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں حاصل کی۔ بہترین

تعلیم سے مستفید ہوئے لیکن جائے پیدائش کا ڈومیسائل دکھا کر میڈیکل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے اور ملازمتیں حاصل کیں۔ مثال کے طور پر ضلع تھر کی آبادی 8 لاکھ ہے مگر وہاں کوئی لیڈی ڈاکٹر موجود نہیں حالانکہ تھر کے کوٹے پر وڈیروں کی اولادیں ہر سال ڈاکٹر بن کر فارغ التحصیل ہوتی ہیں۔ یہی حال اندرون سندھ کے دیگر کئی شہروں اور دیہاتوں کا ہے۔

کوٹہ سسٹم کی وجہ سے بھی سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان جو دوریاں اور بدگمانیاں پیدا ہوئیں تھیں۔ الطاف حسین نے اس بات کا احساس کرتے ہوئے سب سے پہلے ان دوریوں کو ختم کرنے کی سنجیدگی سے کوشش کی۔ انہوں نے کوٹہ سسٹم کے بارے میں کہا: ''اگر سندھ کو اس کے حقوق مل جائیں تو سندھ کے پاس اتنے وسائل ہوں گے کہ سندھ میں شہری اور دیہی کی بنیاد پر کسی بھی شعبہ میں کوٹہ سسٹم کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔'' ماضی میں بھی متحدہ قومی موومنٹ نے کوٹہ سسٹم کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ افہام و تفہیم کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان دسمبر 1988ء میں جو 58 شرائط پر تحریری معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے میں ایم کیو ایم نے کوٹہ سسٹم کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا:

> دیہی علاقوں میں زیادہ تعلیمی اور صحت کی بہم رسائی کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی تاکہ یکساں مواقع کی بہم رسائی کے ساتھ میرٹ سلیکشن کا واحد معیار قرار پائے۔ کوٹہ سسٹم کی تجویز کا مقصد غریب آبادی کو فائدہ پہنچانا تھا لیکن اس کا فائدہ جعلی ڈومیسائل سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والوں کو پہنچا جس کی وجہ سے ناراضگی پیدا ہوئی اس لئے اس پورے معاملے پر منتخب ارکان کی کمیٹی غور کرے گی تاکہ 1993ء تک عبوری دور کے لئے ایک دائمی اور پائیدار فامولا تشکیل دیا جاسکے۔

اسلامی جمہوری اتحاد سے جو معاہدہ ہوا اس میں بھی ایم کیو ایم نے سندھی بھائیوں کے جذبات اور احساسات کا خیال کرتے ہوئے کوٹہ سسٹم کے مسئلہ کو آئینی طریقہ کار کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی۔ ایم کیو ایم نے کوٹہ سسٹم کے مسئلہ کو معاہدے میں اس طرح شامل کیا۔

> وفاقی اور صوبائی سطح پر مہاجروں کا کوٹہ ان کی حقیقی آبادی کے مطابق مقرر کیا جائے۔

جب تک کوٹہ سسٹم پر نظر ثانی کی جائے موجودہ کوٹہ سسٹم پر وفاقی اور صوبائی سطح پر سختی سے اور منصفانہ طور پر عملدرآمد کو یقینی بنایا جائے۔

دیہی سندھ کی خوشحالی اور تعمیر و ترقی کا جو خواب ذوالفقار علی بھٹو نے سندھی عوام کو دکھایا تھا وہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ بھٹو سے دانستہ یا غیر دانستہ جو بھی غلطی ہوئی تھی اسے سندھ کے سیاسی اور معاشرتی تناظر میں جنرل ضیاء الحق اور میاں نواز شریف کو ہرگز نہیں دہرانا چاہیے تھا۔ اگر جنرل ضیاء الحق اور نواز شریف کے نزدیک دیہی علاقوں کی ترقی اور خوشحالی کوٹہ سسٹم میں مضمر تھی تو پھر کوٹہ سسٹم کو بلا تاخیر پنجاب سمیت سرحد اور بلوچستان میں بھی نافذ العمل کیا جانا چاہیے تھا۔ جنرل ضیاء الحق اور میاں نواز شریف نے سندھ میں کوٹہ سسٹم کو زندہ رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ سندھ کے خیر خواہ نہیں ہیں بلکہ وہ سازشی ہتھکنڈوں کے ذریعے سندھیوں اور مہاجروں کو آپس میں دست و گریباں کرنا چاہتے ہیں۔

لسانی بل

سندھ کو لسانی بنیاد پر تقسیم کرنے کی ابتدا ایوب خان کے دور میں اس وقت ہوئی جب سندھ کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بریگیڈیئر ٹکا خان نے سندھی زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر جبراً پابندی لگا دی جبکہ اس وقت سندھ میں اردو اور سندھی زبان کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ سندھی بخوشی اردو زبان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جو طلباء سندھی زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے ہوئے تھے اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا اور نہ ہی اصولی طور پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق تھا۔

بقول ڈاکٹر وفا راشدی کے ''سندھی اور اردو سگی بہنوں کی طرح رہتی بستی اور پھلتی اور پھولتی رہیں'' سندھ میں اردو اور سندھی زبان کے درمیان نفاق کے بیج مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ٹکا خان نے بوئے۔ مارشل لاء قانون کے تحت جب ٹکا خان نے سندھی ذریعہ تعلیم پر پابندی لگائی تو اس فیصلہ پر سندھ کے قوم پرستوں نے شدید احتجاج کیا۔ مگر مارشل لاء حکومت نے ان کے احتجاج اور جذبات کا کوئی احترام نہیں کیا۔ 1971ء میں سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو قوم

پرستوں نے پیپلز پارٹی پر دباؤ ڈالا کہ وہ ٹکا خان کے نافذ کردہ آرڈیننس کو منسوخ کرے۔ چنانچہ اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیپلز پارٹی نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے۔ ایک جانب سندھی قوم پرستوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو کم کرنے کے لئے وزیراعلیٰ سندھ ممتاز علی بھٹو نے 7 جولائی 1972ء کو سندھی زبان کو صوبے کی واحد سرکاری اور دفتری زبان بنانے کا بل سندھ اسمبلی میں پیش کیا تاکہ سندھی قوم پرستوں کو خاموش کیا جاسکے۔ دوسری جانب پیپلز پارٹی نے لسانی بل کا سہارا لیتے ہوئے سندھ کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی کوشش کی۔

سندھ اسمبلی میں حزب اختلاف نے لسانی بل کے خلاف جمعہ کو ہڑتال کی کال دی تو اس مسئلہ کو افہام وتفہیم سے حل کرنے کی بجائے پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما اور سندھ کے گورنر میر رسول بخش تالپور نے ہڑتال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ لوگ جمعہ کے علاوہ ہڑتال کر کے دکھائیں، جمعہ کو آدمی تعطیل ہوتی ہے۔" اس بیان کے بعد کراچی میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، مختلف علاقوں میں فسادات شروع ہوگئے، کراچی کے بیشتر علاقوں میں کرفیو لگا دیا گیا۔ یہ سلسلہ 22 دن تک جاری رہے۔ سندھ میں لسانی بنیاد پر فسادات کرنے کا کام بھی پیپلز پارٹی کے ہاتھوں انجام پایا۔ ان فسادات میں کراچی، حیدرآباد اور سکھر میں 57 افراد ہلاک ہوئے۔ جب حالات بہت بگڑ گئے تو مجبوراً ذوالفقار علی بھٹو نے اگست 1972ء میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی سربراہی میں ایک وفد کو اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔ اس ملاقات میں نواب مظفر حسین اور رئیس امروہوی بھی شامل تھے جبکہ حکومت کی طرف سے جے اے رحیم، محمود علی قصوری، عبدالحفیظ پیرزادہ، معراج محمد خان، رسول بخش تالپور اور حیات محمد شیر پاؤ شریک ہوئے۔ پیپلز پارٹی اور مہاجر وفد میں اتفاق رائے سے ایک سمجھوتہ ہوا جس کے مطابق

1۔ سندھ میں وزیراعلیٰ سندھی تو گورنر مہاجر ہوگا۔

2۔ چیف سیکریٹری سندھی تو آئی جی مہاجر ہوگا۔

3۔ وزیر سندھی تو وزارت کا سیکریٹری مہاجر ہوگا۔

4۔ 40 فیصد اور 60 فیصد شہری دیہی کوٹہ پر اتفاق ہوا۔
5۔ سندھ کے تعلیمی اداروں میں سندھی زبان اختیاری ہوگی۔
6۔ سندھی زبان بتدریج صوبائی سرکاری زبان بنائی جائے گی۔
7۔ ہنگاموں کے متاثرہ افراد کو معاوضے دیئے جائیں گے۔

اس معاہدے کی روح یہی تھی کہ سندھ کے دونوں مستقل باسیوں یعنی سندھی اور اردو بولنے والوں میں سے اگر ایک طبقہ سے وزیراعلیٰ ہوگا تو دوسرے طبقہ کا گورنر ہوگا۔ اگر ایک طبقہ کا وزیر ہوگا تو دوسرے طبقہ کا سیکریٹری ہوگا۔ یعنی کہ صوبائی حکومت میں دونوں طبقوں کو برابری کی بنیاد پر حقوق دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس اتفاق رائے کے بعد کراچی میں امن تو قائم ہوگیا مگر جو آگ پیپلز پارٹی لگا چکی تھی اس کی تپش کئی سالوں تک محسوس کی جاتی رہی۔ پیپلز پارٹی اور اردو بولنے والے وفد کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا اگر اس پر نیک نیتی سے عمل کیا جاتا تو شاید دیہی اور شہری کی تفریق پیدا نہ ہوتی۔ دونوں طبقے مل جل کر سندھ کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے مگر پیپلز پارٹی نے اپنے معاہدے کی کسی ایک شق پر عمل درآمد کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جس کی وجہ سے دیہی اور شہری کی تفریق بڑھتی ہی چلی گئی۔

ملیر ضلع کا قیام

ذوالفقار علی بھٹو کے پہلے دور حکومت میں جس طرح شہری سندھ میں لسانی بنیاد پر کچھ علاقوں کو الگ کر کے نئے انتخابی حلقے تشکیل دیئے گئے تھے اسی طرح پیپلز پارٹی کے تیسرے دور حکومت میں بھی لسانی بنیاد پر حلقہ بندی کر کے ضلع ملیر کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ملیر ضلع کے قیام کا مقصد شہری اور دیہی تقسیم کے ساتھ ساتھ ایم کیو ایم کے ووٹ بینک کو بھی تقسیم کرنا مقصود تھا۔ ملیر ضلع کا قیام درحقیقت پیپلز پارٹی کی مہاجر دشمنی، تنگ نظری، تعصبانہ سوچ اور لسانی ذہنیت کی کھل کر عکاسی کرتا ہے۔ ملیر ضلع کی حد بندی میں جو غیر حقیقی اور غیر مروجہ طریقہ کار اختیار کیا گیا اس نے

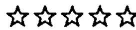
شکوک وشبہات کوتقویت دی جس نے صورتحال میں شدید کشیدگی پیدا کی اور بدگمانیوں میں اضافہ ہوا۔جس طرح غیر فطری انداز میں نیا ضلع تشکیل دیا گیا اس کا اولین مقصد اس ضلع میں مہاجروں کی نمائندگی ختم کر کے دیہی اور شہری تقسیم کو مزید بڑھانا تھا۔پیپلز پارٹی نے شہری اور دیہی کی بنیاد پر ملیر ضلع ہی تشکیل نہیں دیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے ملیر ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے قیام کا بھی اعلان کیا اور یوں پیپلز پارٹی نے نئی اتھارٹی قائم کر کے اسے کراچی سے الگ حیثیت دینے کی کوشش کی۔

ضلع شرقی آبادی کے لحاظ سے ملیر ضلع سے دس گنا بڑا ہے۔رقبہ کے لحاظ سے ضلع ملیر سے دس گناہ چھوٹا' رجسٹرڈ ووٹوں کی تعداد 1728988 ہے۔تعلیمی اداروں میں کوئی یونیورسٹی شامل نہیں جب کہ آبادی کے لحاظ سے اسکولوں اور کالجوں کی قلیل تعداد ہے۔ضلع ملیر آبادی کے لحاظ سے ضلع شرقی سے دس گناہ چھوٹا' رقبہ کے لحاظ سے دس گنا بڑا ہے رجسٹرڈ ووٹوں کی کل تعداد 187922 ہے۔ملیر ضلع میں پاکستان اسٹیل، لانڈھی انڈسٹریل ایریا، کورنگی صنعتی علاقہ، مشین ٹول فیکٹری، ایکسپورٹ پروسیسنگ زون، کورنگی فش ہاربر اور اس کی ذیلی صنعتیں اور مارشلنگ یارڈ' جناح ٹرمینل (قائداعظم ایئرپورٹ) بن قاسم کی بندرگاہ، نیشنل اور سپر ہائی وے، کنٹونمنٹ کا علاقہ، سفاری پارک کاچڑیا گھر اور سوک سینٹر شامل ہے۔تعلیمی اداروں میں کراچی یونیورسٹی، این ای ڈی یونیورسٹی، بے شمار کالجز اور اسکولوں کو شامل کیا گیا۔

پیپلز پارٹی کی ضلع ملیر بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی جنھوں نے ضلع ملیر تشکیل دیا۔ ان کے عزائم کیا ہیں اور اس منصوبے کے پس پردہ کون سے خفیہ ہاتھ پوشیدہ ہیں یہ سوالات اس لئے ذہن میں اٹھ رہے ہیں کہ 1993ء کے اوائل میں Twin era of Pakistan کے نام سے ایک کتاب امریکہ میں شائع ہوئی جس کے مصنف نے 2006 میں پاکستان کا جو تصوراتی نقشہ پیش کیا ہے اس نقشہ کے مطابق پورٹ قاسم جو کہ اب ملیر ضلع کا حصہ ہے اسے سندھو دیش کا حصہ دکھایا ہے۔ملیر ضلع میں جو علاقے شامل کیے گئے ہیں وہ Twin Era of

pakstan میں شائع شدہ نقشہ کے مطابق ہے۔اب اس نقطہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ 1993ء میں کتاب شائع ہوئی اور 1994ء میں کتاب میں شائع نقشہ کے مطابق ملیر ضلع قائم کیا جاتا ہے۔

پیپلز پارٹی نے اپنے قیام کے ساتھ ہی سندھ میں دیہی و شہری تقسیم کی کوششیں شروع کردی تھی۔پیپلز پارٹی کا ایک بنیادی ایجنڈا یہ رہا ہے کہ سندھ میں سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان تفریق اور تقسیم رکھی جائے اور انہیں ایک نہ ہونے دیا جائے۔سندھ کے مستقل باشندوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ رکھنے کیلئے پیپلز پارٹی نے ہمیشہ بدگمانیاں پیدا کیں۔دیہی وشہری تقسیم کے پیچھے پیپلز پارٹی کی یہ حکمت عملی پوشیدہ نظر آتی ہے کہ وہ کس خفیہ منصوبے کی تکمیل کی خاطر کراچی کو سندھ سے الگ کرنا چاہتی تھی۔



سندھ......اردو کا مولد

سرزمین سندھ ہزاروں سال سے قدیم تہذیب وتمدن کا گہوارہ، مختلف قوموں اور زبانوں کا مولد ومسکن رہی ہے۔ اردو زبان کی کہانی ہزاروں سال پیشتر اس وقت شروع ہوئی جب آریا قوم وسطی ایشیاء سے ہندوستان آئی۔ آرین قوم نے جہاں پہلا قدم رکھا۔ وہ علاقہ سندھ کا قدیم حصہ ملتان تھا۔ اس زمانے میں آریا قوموں کی زبان سنسکرت تھی۔ اردو زبان کا اصل سرچشمہ یہی آریائی سنسکرت ہے جو بعد میں پراکرت (ہندی) پھر برج بھاشا کے نام سے موسوم ہوئی۔ اردو کی جائے پیدائش کے بارے میں محققین ومورخین کی آراء مختلف ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے دکن کو، حامد حسن قادری نے دلی کو، مولوی عبدالحق نے گنگا جمنا کو، شیخ اکرام الحق نے ملتان کو اور پیر حسام الدین راشدی نے سندھ کو اردو کا مولد بتایا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری جیسے چوٹی کے محقق کے مطابق ''اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ اردو کی بنیاد سب سے پہلے وہ حملہ تھا جو شاہان اسلام نے ہندوستان پر کیا۔ اس خیال کی تائید میں محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ ''اردو زبان کا وجود اس زمانے سے ہے جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے''

محمد بن قاسم سے لیکر عہد شاہجہانی تک اردو مختلف صورتیں میں بدلتی رہی ہے یہ زبان سنسکرت، پراکرت، بھاشا، ہندی ریختہ کے ناموں سے گزر کر اس منزل پر پہنچی جب اس میں عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے بے شمار الفاظ ومحاورات شامل ہو گئے تو۔

ان تمام زبانوں کے روابط سے جس ایک زبان نے جنم لیا اس کا نام شاہجہاں کے عہد میں پہلے اردوئے معلیٰ پھر اردو ہو گیا۔ ناطق لکھنوی نے اردو کی پیدائش اور پرورش کے بارے میں خوبصورت انداز میں لکھا ''اردو کو ایک ایسا سرچشمہ تصور فرمائے جو شمالی ہند کے پہاڑوں سے جاری ہوا۔ دہلی میں آ کر دریا بنا۔ اس دریا سے بیسیوں شاخیں نکلیں' ایک بنگال کو گئی' ایک بہار کو' ایک اودھ اور ایک گجرات کو۔ یہاں یہ شاخ تمام دکن میں پھیل کر ایک سمندر بن گئی۔ اودھ میں جو شاخ پہنچی اس کے پانی کو تمام ہندوستان خصوصاً آگرہ اور دہلی کے ادیبوں اور شاعروں نے جمع ہو کر لکھنو میں صاف کیا اور صاف کر کے تمام ملک میں نہریں دوڑا دیں''

پیر حسام الدین راشدی نے اپنے مقالے میں سندھ کو اردو کا مولد بتایا ہے۔ اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں پیر حسام الدین کا یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے اس کی تصدیق مولانا سلیمان ندوی کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

''ہندوستان کی متعدد زبانوں کا پہلا گہوارہ سندھ ہے جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''

ڈاکٹر وفا راشدی اردو زبان کی سندھ میں پرورش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''سندھی اور اردو سگی بہنوں کی طرح رہتی' بستی' پھلتی اور پھولتی رہیں''

سندھ کے اولیائے کرام' صوفیائے کرام' علمی اور دینی شخصیات نے ہر دور میں حقیقت و معرفت' علم و عرفان اور شعر و ادب کا چراغ روشن کیا۔ اللہ کے ان نیک اور برگزیدہ بندوں نے بلا امتیاز' نسل و مقام سندھی' عربی اور اردو کی ترقی و ترویج اور تبلیغ و اشاعت میں نہایت اخلاص و ایثار کے ساتھ حصہ لیا۔ ان بزرگان دین نے اردو زبان میں بھی فکر و دانش' تخلیقات و نگارشات' علوم و فنون' نثر و شاعری میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ٹھٹھہ کے ممتاز علمی و ادبی خاندان سے تعلق رکھنے والے فارسی اور اردو کے شاعر عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی (1140-1040) اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے۔ اس زمانے میں سندھ کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ لیکن اردو بھی عوام میں رواج

پانے لگی تھی۔ مدرسوں اور مکتبوں بلکہ گھروں میں ابتدائی تعلیم عربی، فارسی کے علاوہ اردو بھی باقاعدہ رائج ہوگئی۔ اردو کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ کچھ ہی عرصے بعد اردو میں شعروشاعری کے علاوہ مضامین اور کتابیں لکھی جانے لگیں۔ ٹھٹھہ، بکھر، سیہون، بوبک، روہڑی، حیدرآباد جو اسلامی علوم وفنون اور فارسی ادبیات کے مراکز تھے اردو شعروادب کی نشوونما میں بھی پیش پیش تھے۔

اردو زبان اور شعروادب کی تبلیغ واشاعت میں جن شعرائے کرام کا حصہ رہا ان میں اکثریت صوفی شعراء کی رہی ہے۔ اردو کی ترقی وتوسیع کے اعتبار سے کلہوڑوں کا عہد اردو شعراء کے لئے اچھا دور تھا۔ اس دور میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی اورنگ آبادی (1668ء تا 1744) صوفی شاعر تھے۔ اسی زمانے میں شاہ مبارک آبرو خان آبرو' شیخ شرف الدین ممنون' شاہ حاتم' مرزا مظہر جان جاناں' خواجہ میر درد اور محمد رفیع سودا سب کے سب اہل شریعت وشیخ طریقت بزرگ تھے۔ ان ہی بزرگان دین کی بدولت اردو شاعری میں عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کے جذبات عارفانہ خیالات' صوفیانہ نظریات اور مذہبی رجحانات شامل ہوئے۔ سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی ہندی کے شاعر نہ تھے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو زبان پر ان کے احسانات دیگر شعراء سے کچھ کم نہیں ہیں۔ عربی' فارسی اور ہندی کے بے شمار الفاظ اور تراکیب جو کلام شاہ کی زینت ہیں' آج اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں'' شاہ کا رسالہ'' اس کی زندہ جاوید مثال ہے۔

عہد تالپور بھی اردو زبان وادب کی ترقی کا دور تھا۔ اسی دور میں شاہ عبدالقادر دہلوی نے اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ اس عہد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں اردو شاعری کی تمام اصناف کمال کو پہنچیں۔ میر تقی میر' میر درد اور نظیر اکبر آبادی اس زمانے کے بڑے شاعر تھے۔ انشاءاللہ خان انشاء نے اردو کی ترقی وتوسیع کے لئے نئے نئے تجارب اختیار کئے اور نئی نئی اصطلاحات سے اردو کو مالا مال کیا۔ عہد تالپور اردو زبان کی ترقی واشاعت میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔ اس عہد میں اردو زبان وادب کے فروغ میں امیران تالپور نے ذوق وشوق سے حصہ لیا' ان

کے سائے میں اردو کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔تالپوروں کا دربار فارسی اور اردو ادباء و شعراء کی انجمن سے کم نہ تھا۔ارباب سلطنت میں میر کرم علی خان، میر مراد علی خان، میر صوبدار خان میر، میر محمد نصیر خان جعفری، نواب ولی محمد خان ولی نے اردو نظم و نثر میں کتابیں لکھیں۔سید ثابت علی شاہ، عظیم ٹھٹھوی، ضیاء الدین ضیاء، غلام علی مائل وغیرہ نہ صرف فارسی بلکہ اردو کے بھی نامور شعراء گزرے ہیں۔مگر شاعر ہفت زبان سچل سرمست کا مقام ان میں بہت بلند تھا۔

عہد برطانیہ بھی اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج اور نشر و اشاعت کیلئے سازگار ثابت ہوا۔1834ء میں فارسی کے بجائے اردو کو ہندوستان سمیت سندھ میں بھی دفتری زبان قرار دیا گیا۔سندھ میں جا بجا اسکول اور کالج قائم کیے گئے۔ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات' تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت سے بہرہ ور ہونے کیلئے انگریزوں کے نزدیک اردو سے بہتر کوئی اور زبان اس کام کی صلاحیت نہ رکھتی تھی اس لئے انھوں نے ہندوستان میں اردو کو رواج دینے کا فیصلہ کیا۔سرسید کی تعلیمی تحریک سے سندھ کے ارباب علم و ادب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے انہوں نے بھی اردو کے ہر شعبہ میں جولانی طبع کے جوہر دکھائے اس زمانے میں سندھ کے اہل فکر و فن نے اردو میں بھی ناول، افسانوں، ڈراموں، کے علاوہ سیرت، سوانح، تذکرہ، تاریخ، تحقیق و تنقید کی کتابیں لکھیں۔ان میں سندھ کے چند ارباب شعراء میں فقیر قادر بخش بیدل، غلام شاہ لغاری' شاہ نقشبندی، مخدوم ابراہیم خلیل' امین ہالائی' حزب اللہ شاہ راشدی، مولانا عبید اللہ سندھی، فضل اللہ شاہ سائیں، عبدالغنی، میر عبدالحسین سانگی، زرگ خان لاشار، جمال الدین علوی، شمس الدین بلبل، اور مرزا قلیچ بیگ شامل تھے۔

تشکیل پاکستان کے ابتدائی دور میں انجمن ترقی اردو بورڈ، سندھی ادبی بورڈ کراچی نیز کراچی کے دیگر سرکاری و غیر سرکاری اشاعتی و طباعتی اداروں کے قیام اردو رسائل و اخبارات کے اجراء سے اردو کی نشر و اشاعت وسیع پیمانے پر ہوتی رہی ہے اردو کتب و جرائد رسائل و اخبارات کے بہت بڑے ذخیرے جمع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے اس طرح اردو سندھ کے ہر کوچہ د

بازار میں عام ہوگئی قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں میں منتقل ہونے والے اہل علم واہل قلم پاکستان کے تمام علاقوں میں پھیل گئے سندھ کے شہروں اور قصبوں میں سکونت اختیار کرنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے انکی آمد وسکونت سندھی اور اردو دونوں زبانوں کے لئے ایک نیک فال ثابت ہوئی۔ سندھ میں ہجرت کرنے والوں نے محبت ولگن سے سندھی زبان سیکھی اور اس کے علوم وادبیات سے آگاہی حاصل کی سندھ کے قدیم باشندوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے بھائیوں کو دلوں میں جگہیں دیں۔ سندھی اور اردو بولنے والوں کے میل جول' اخوت اور محبت کے نتیجے میں سندھ میں زبان اور ثقافت کو توانائی وشگفتگی ملی۔ نئی بہار آئی تو نئے پھول کھلے، ہر دل ہرا اور ہر روح شگفتہ ہوگئی۔

یگانگت ومحبت، اتحاد ویکجہتی' افہام وتفہیم کے سائے میں وادی مہران میں اردو زبان وادب نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سندھی' عربی اور فارسی کتابوں کے اردو زبان میں ترجمے کئے گئے اس طرح ان زبانوں کا لسانی وثقافتی رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ مزید مربوط ومضبوط ہو کر گلشن ادب اردو میں نیا رنگ لایا جہاں رنگ برنگ پھول کھلے۔ آج سندھ کا یہ ریگزار سندھی اور اردو زبان کے لالہ زار وگل زار کا روح پرور اور دلنواز سماں پیش کرتا ہے۔ جن ارباب نثر نے اپنے تحقیقاتی وتنقیدی مضامین ومقالات' تصنیفات وتالیفات سے سندھ میں اردو زبان وادب کو نئی توانائی اور زندگی بخشی ان میں اعجاز الحق قدوسی' پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر نبی بخش خان، شیخ ایاز' اے کے بروہی، ڈاکٹر شیخ ابراہیم خلیل، پروفیسر محبوب علی چنہ، کریم بخش خالد، ڈاکٹر عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر سفی احمد ہاشمی، آغا تاج محمد، ڈاکٹر خان رشید، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر شرف الدین، رشید احمد لاشاری، شیخ عبدالرزاق راز، ڈاکٹر ندیم ندوی، افسر صدیقی' پروفیسر آفاق صدیقی اور وفار راشد کے نام سندھ میں اردوادب کی تاریخ کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہے اس دور میں جن ارباب نظم نے جدید رجحانات اور نئے عصری تقاضوں کو اپنایا ان میں شیخ ابراہیم خلیل، تاج بلوچ، رزی جے

پوری، الیاس عشقی، شیخ عبدالرزاق راز، وغیرہ وہ شعرائے کرام ہیں جنہوں نے شوق و زوق سے فن وشعر و نکات سخن کی آبیاری کی۔

قیام پاکستان سے بہت پہلے سندھ میں اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان موجود تھا یہی وجہ ہے کہ سندھ میں اردو اور سندھی دو بہنوں کی طرح بستی اور پھلتی رہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار اس بات کے گواہ ہیں کہ 34-1933ء میں اردو اسکولوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی جس میں اردو پڑھنے والے سب ،زیر تعلیم رہے۔

نام اسکول	کل طلباء کی تعداد	اردو پڑھنے والے طلباء
سندھ مدرستہ الاسلام کراچی	779	274
کراچی اکیڈمی	282	125
سی ایم ایس ہائی اسکول کراچی	294	05
کچھی میمن مڈل اسکول کراچی	71	71
میونسپل اینگلو اردو اسکول کیماڑی	44	32

اس کے علاوہ پورے سندھ میں میونسپل بورڈوں کے زیر اہتمام 69 اردو اسکول قائم تھے جن میں کل 6318 طلباء زیر تعلیم تھے۔ نیز 67 اسکول میونسپل لوکل اتھارٹیز کے تحت چل رہے تھے جن میں طلباء کی تعداد 6256 تھی مزید دو اسکول ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ کی طرف سے قائم تھے جن میں 62 طلباء زیر تعلیم تھے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق 1941ء سے 1945ء تک سندھی اور اردو اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد مندرجہ ذیل تھی

سال	سندھی اسکول	تعداد طلبہ	اردو اسکول	تعداد طلبہ
1941ء	13	1477	16	1847
1942ء	13	1516	16	1940
1943ء	13	1419	16	1776

1944ء	13	1412	16	1711
1945ء	14	1565	16	1793

(حوالہ: مسلمانان سندھ کی تعلیم)

اردو زبان نے سندھ میں یگانگت ومحبت، اتحاد ویکجہتی، افہام وتفہیم کی فضا پیدا کی تو دوسری طرف سندھ کے اولیائے کرام، مجاہدین اسلام، عالم دین، ماہر تعلیم، محققین، ادباء اور شعراء نے اردو سے عقیدت رکھتے ہوئے ترقی وتوسیع میں تاریخی کردار ادا کیا۔ سندھ میں فارسی، عربی اور سندھی زبان کو جو مقام اور مرتبہ حاصل رہا، اس میں کہیں زیادہ عزت اور اہمیت سندھ کے بزرگان دین اولیائے کرام، شعراء اور ادباء نے اردو کو عطا کی ہے۔

سندھ میں اردو کی تاریخ کئی سو سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ سندھ کے اولیائے کرام صوفیائے کرام، علمی وادبی شخصیات، شعراء اور ادباء نے اردو زبان اور ادب کو سنوارنے، نکھارنے اور ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب کی تمام اصناف اور علوم وفنون کے تمام موضوعات پر مشتمل تخلیقات ونگارشات سے خوب مالا مال کیا۔ اردو کو یہ مقام اور مرتبہ عطا کرنے میں اردو دان طبقہ کے ساتھ ساتھ سندھ کے اہل قلم اور اہل ادب کی خدمات نمایاں رہی ہیں۔ ان تاریخی حقائق کے بعد کسی صوبے کو یہ دعویٰ کرنے کا قطعی حق نہیں ہے کہ اردو کی ترقی اور فروغ میں صرف اس کی خدمات ہیں۔



جواب آں غزل

اردو ہماری قومی اور تہذیبی زبان ہے اس بات کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ عربی کو چھوڑ کر اردو میں اسلام اور اس کے افکار و مسائل، مسلمانوں کی تہذیب اور تاریخ پر جس قدر زخیرہ موجود ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں ہے قرآن مجید کے تراجم ہوں یا تفاسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں ہوں یا سیرت اور سوانح، روزمرہ زندگی کے مذہبی مسائل ہوں یا اعلیٰ فکری مباعث ان تمام موضوعات پر اردو میں کتابیں بکثرت موجود ہیں اس کے علاوہ برصغیر و پاک و ہند کے ذہنی فکری، تعلیمی، علمی، اور تہذیبی تاریخ میں مسلمانوں کا جو حصہ ہے اس سب کی تفسیر بھی اردو میں ملتی ہے۔ کوئی شخص جو اس ملک کی تاریخ سیاست، افکار و خیالات، تحریکات، میلانات، اور رجحانات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے وہ اردو کے ذخیرے سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اردو اس اعتبار سے پاک و ہند کی قدیم اور جدید زبان میں سب سے ممتاز ہے۔

قیام پاکستان کی تحریک اور اس کے حصول کی جدو جہد میں بھی اردو کا بڑا حصہ ہے۔ دو قومی نظریہ کی ابتداء میں اردو اور ہندی کی کشمکش کا بھی بڑا حصہ ہے۔ سر سید احمد خان نے اس کشمکش کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ ''اس جھگڑے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہندو اور مسلمان اس ملک میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔'' مسلمانوں کی ذہنی بیداری اور آزادی کی جدو جہد میں اردو شعراء اور مصنفین نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ اردو ہماری قومی اور تہذیبی زبان ہی نہیں بلکہ صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے اسے عوام کی زبان کی حیثیت سے تبلیغ اور تعلیم دین کے لئے بھی

استعمال کیا۔ چنانچہ اردو کے ابتدائی دور میں جو نمونے ملتے ہیں وہ ملفوظات کی شکل میں ہوں، نثر یا نظم میں، مختصر تصانیف کی صورت میں وہ ان ہی بزرگوں کی یادگار ہیں۔ ان بزرگوں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی، حضرت عبدالوہاب فاروقی سچل سرمست اور امیر خسرو وغیرہ شامل ہیں۔

اردو کسی ایک قوم یا قومیت کی زبان نہیں بلکہ یہ پاکستان کی وہ واحد زبان ہے جو چاروں صوبوں میں بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ پاکستان میں پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی اور دیگر علاقائی زبانوں کی بھی اپنی تاریخی ہے بلکہ یہ زبانیں مقامی زبان کی حیثیت سے اپنے اپنے صوبوں میں بولی جاتی ہیں۔ اردو کی اپنی خوشبو اور مہک ہے اسی طرح پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور سرائیکی زبان کی بھی اپنی الگ الگ خوشبو اور اپنا اپنا علیحدہ رنگ ہے۔ ان سب زبانیں سے مل کر پھولوں کا وہ گلدستہ بنتا ہے جس کی مہک سے پورا ملک معطر اور خوبصورت نظر آتا ہے، مگر چند نادان دوستوں اور دانشوروں نے زبان کی بنیاد پر صوبوں اور صوبوں کے عوام میں نفاق، تفریق اور بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان دانشوروں میں ایک شخصیت حنیف رامے صاحب کی ہے جنہوں نے اردو کے خلاف زہر افشانی کر کے اردو اور پنجابی کا مسئلہ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی انہوں نے اپنی تصنیف میں اردو زبان اور اردو بولنے والوں کے بارے میں جو ہرزہ سرائی کی ہے اس کا جواب میں نے مستند اور مسلمہ تحقیق اور حقائق کے بعد تحریر کیا ہے۔ یہ جواب صرف اور صرف حنیف رامے اور ان جیسی سوچ رکھنے والے دیگر دانشوروں کے لئے ہے۔ پنجاب کی عوام، دانشور اور دیگر مکتبہ فکر کا حنیف رامے کی سوچ و فکر سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی ہم پنجاب کی عوام، دانشور، پروفیسر، اہل قلم اور دیگر مکتبہ فکر حضرات کی دل آزاری یا ایذا رسائی کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی کوئی متنازعہ بات لکھ کر بھائیوں میں بدگمانی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

حنیف رامے نے اپنی تصنیف ''پنجاب کا مقدمہ'' میں اردو بولنے والوں (مہاجروں) اور اردو زبان کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے اردو زبان کو پنجاب کی تہذیب و تمدن کی

تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اردو دان طبقہ کو انگریزوں کا رفیق ہونے کا بے بنیاد الزام لگاتے ہوئے لکھا ہے:

''انگریز نے ہم سے صرف پنجاب نہیں' پنجابی بھی چھین لی تھی۔ زبان چھن جانے کے بعد ہم لوگ پنجابی کہلا ہی نہ سکتے تھے ہم تو محض پنجاب کے باسی (Domicile) بن کر رہ گئے تھے۔ انگریز نے آتے ہی 1850ء میں پنجابی زبان کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یو پی اور اودھ سے بھیا فوج اور نوکرشاہی انگریز کی رفیق بن کر آئی تھی۔ اس کی مدد سے اس نے پنجابی قومیت کی بنیادیں ڈھادی تھیں پھر دیوناگری' فارسی اور گورمکھی رسم الخط کے حوالے سے اس نے پنجابی ہندو' پنجابی مسلم اور پنجابی سکھ کو تقسیم کر دیا تھا۔''

''انگریز نے پنجاب کے جذبہ مزاحمت کو کچلنے کے لئے پنجابی زبان کے بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم بنادیا تھا۔ اس بھیا فوج اور بھیا نوکرشاہی نے جو انگریز کے ساتھ پنجاب کو ختم کرنے آئی تھی' اپنی سہولت کی خاطر اس فیصلے کو نافذ کرنے کے لئے خصوصی زور لگایا تھا۔ انگریز کی ضرورت اور بھیا نوکرشاہی کی سہولت نے پنجاب کی ثقافت پر کاری ضرب لگائی۔''

''پنجاب میں عملاً مساوات نافذ تھی۔ ہڑپہ تہذیب کے ایک جیسے گلی محلے اور مکانات اس کا تاریخی ثبوت ہے۔ اس مساوات کا زندہ ثبوت پنجابی زبان ہے۔ درباری جی حضوری چھو کر نہیں گزری جو بحضور فیض گنجور' قبلہ و کعبہ' ابا حضور' بندہ پرور' آپ' جناب کے بغیر ایک قدم نہ چلنے والی اردو کا خاصہ ہے۔''

''پنجابیوں نے اردو زبان اپنالی اور اپنی تاریخ کو بھلا دیا۔ جب تک وہ

اپنی زبان بولتے اور اس میں سوچتے رہے وہ راجہ پورس کے جذبہ مزاحمت
کے وارث رہے لیکن جب سے اردو بولنے اور اس میں سوچنے لگے ہیں وہ
حملہ آوروں سے مرعوب ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"تاریخی طور پر پنجاب میں قیادت کا فقدان نہیں رہا۔ یہاں پورس سے
لے کر رنجیت سنگھ تک سیاسی قیادت بھی رہی ہے اور اس سرزمین نے
ہندومت کو شیو جی جیسے دیوتا بھی عطا کئے ہیں اور سکھ مذہب کے بانی
گورونانک اور احمدیت کے بانی مرزا غلام احمد بھی پیدا کئے ہیں۔

"پانچ کروڑ بے زبان پنجابی عوام کے نام:
اس معذرت کے ساتھ کہ میں نے یہ کتاب پنجابی میں نہیں لکھی مگر شاید
"پنجاب کا مقدمہ" مجھے اردو میں اس لئے پیش کرنا پڑا کہ پڑھے لکھے
پنجابیوں نے پنجابی کو چھوڑ دیا ہے"

"آج پنجابی ملکیت کے یہ دو آزاد اخبار (روزنامہ جنگ اور روزنامہ
نوائے وقت) جتنی اہمیت رکھتے ہیں تمام اخبارات ملکر بھی نہیں رکھتے۔
پنجاب سے باہر کے مہربان اسے بھی پنجابی غلبہ ہی گردانتے ہیں"

پنجاب کے ایک اور دانشور فخر زمان بھی اردو بولنے والوں اور اردو زبان کے خلاف
ہرزہ سرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"قائداعظم نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی یہ
جاگیرداروں کے سرغنہ لیاقت علی خان تھے جنہوں نے اردو کو سرکاری
زبان قرار دیا۔"

اردو بولنے والے لکھنؤ چلے جائیں جن کا نشان پان اور پاجامہ ہے اسے
پہننے والے بانکے کہلاتے تھے۔ یہ کلچر لکھنؤ کے کوٹھے اور پان کا کلچر ہے۔

متذکرہ اقتباسات سے پنجاب کے ان دانشوروں کی اخلاقیات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے جنہوں نے تاریخی حقائق اور تاریخی پس منظر سے نظر چراتے ہوئے غلط بیانی اور مکمل جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے اردو بولنے والوں اور اردو زبان کو ہدف تنقید کا نشانہ بنایا ہے بلکہ غیر مہذب اور غیر شائستہ زبان استعمال کی۔ یہاں مختصراً صرف ان الزامات کا جواب تحریر کروں گا جو براہ راست اردو بولنے والوں پر لگائے گئے۔ میری کوشش رہی ہے کہ ہر جواب مستند اور مسلمہ تحقیق اور حقائق کے مطابق ہو۔

اردو زبان دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ زبان عہد بہ عہد بتدریج مختلف مراحل سے گزر کر بین الاقوامی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ امریکہ، برطانیہ، روس، چین، جاپان، کینیڈا، فرانس، اٹلی، جرمنی، ترکی، انڈیا، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات وغیرہ غرض کہ دنیا بھر میں اردو بولی اور پڑھی جاتی ہے بلکہ ان ممالک کے کتاب خانوں میں اردو کتب و رسائل کے نادر و نایاب مطبوعات کے بہت بڑے ذخائر موجود ہیں۔ وہاں کی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اردو کے شعبے قائم ہیں۔ اردو زبان میں مختلف علوم و فنون سے متعلق علمی و تحقیقی کاموں کا سلسلہ جاری ہے۔ ان ملکوں میں نہ صرف نصابی سطح پر اردو درس و تدریس کا انتظام ہے بلکہ اردو کی اہم کتابوں اور مضامین کے ترجمے اور غیر ملکی ادبیات کو اردو میں منتقل کرنے کا باقاعدہ کام کیا جا رہا ہے۔

جنوبی ایشیائی ممالک نے گزشتہ چند سالوں میں الیکٹرونک میڈیا میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ان میں سے اکثر ممالک کی نشریات اردو زبان میں پیش کی جاتی ہیں۔ انگریزی زبان کے بعد اب اردو زبان کو الیکٹرونک میڈیا میں بھی بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ دنیا بھر میں کئی ملین انسان اردو نشریات سے مستفید ہو رہے ہیں۔ دنیا بھر کے تمام بڑے ممالک میں مقامی سطح پر بھی ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اردو میں پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا کی بھی اپنی ایک مسلمہ اہمیت ہے۔ اردو کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ امریکہ، برطانیہ، چین، کینیڈا، جرمنی، سمیت کئی یورپی اور بیشتر ایشیائی ممالک میں باقاعدگی سے معیاری اخبارات

اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں بلکہ کئی یورپی ممالک میں ہفت روزہ اور ماہانہ میگزین بھی بڑی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ کسی بھی زبان کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے کہ اسے بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جائے۔ اس زبان کو پڑھنے والے، لکھنے والے اور سننے والے سامعین بھی موجود ہوں۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے درمیان رابطہ کی زبان بھی اردو ہے دنیا بھر میں جہاں جہاں پاکستانی موجود ہیں قومی دن اور مذہبی تہوار کے موقع پر اردو زبان میں پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ برطانیہ جہاں سب سے زیادہ پنجابی اور کشمیری مقیم ہیں، وہاں مشاعرے، ادبی پروگرام اور کمیونٹی پروگرام اردو زبان میں ہوتے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کے کئی شہروں میں اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے اسکول اور کالج میں پڑھایا جاتا ہے۔ برطانیہ میں خاص طور پر بچوں کو اردو کی تعلیم دی جارہی ہے۔ الحمدللہ پاکستان کی قومی زبان اردو کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ دنیا کی چند بڑی اور مقبول زبانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بھارت کی معیشت کا ایک اہم ترین ستون اس کی فلم انڈسٹری ہے۔ انڈین فلم انڈسٹری میں ایک سال میں آٹھ سو سے ایک ہزار فلمیں بنتی ہیں جن میں اکثریت اردو فلموں کی ہوتی ہیں۔ جو بھارت کے علاوہ دنیا بھر میں نمائش کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ ایک سروے کے مطابق دنیا بھر میں بھارتی فلموں کو دیکھنے والوں کی تعداد 200 ملین سے بھی زیادہ ہے۔ 1999ء میں بھارتی حکومت کو فلموں کی برآمد کی مد میں 10 بلین حاصل ہوئے جبکہ اسی سال فلم انڈسٹری کے ذریعے 250 بلین ڈالر کا زرمبادلہ حاصل ہوا۔ بھارتی ٹیلی ویژن چینل، زی ٹی وی جس کی 130 ممالک میں نشریات دیکھی جاتی ہیں، اس کی ایک سال کی اوسط آمدنی 100 ملین ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔ دیگر ٹیلی ویژن چینل جو اردو میں پروگرام پیش کرتے ہیں ان کی آمدنی اس کے علاوہ ہے۔ دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں اردو گانوں کی کیسٹیں اور سی ڈی فروخت ہوتی ہیں۔ اس مد میں بھی بھارت کو کئی سو ملین ڈالر کا زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ بھارت کی فلم انڈسٹری کی دنیا بھر میں مقبولیت، ٹیلی ویژن چینل کی دنیا بھر میں نشریات اور بھارتی

گانوں کی کیسٹوں کی فروخت اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اردو زبان دنیا کی مقبول ترین زبان ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بھارت نے اردو کی بین الاقوامی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی فلم انڈسٹری اور ٹیلی ویژن چینل کو قبول عام بنانے کے لئے اردو زبان کا سہارالیا۔ یہاں اس بات کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ انڈین فلم انڈسٹری کا سالانہ بجٹ کئی ممالک کے سالانہ بجٹ سے بھی زیادہ ہے۔ ہمارے ملک کا المیہ یہ ہے کہ 56 سال گزر جانے کے باوجود ایک طبقہ اردو کو قومی زبان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔اس کی ترقی وترویج میں رکاوٹیں ڈالتا رہا ہے۔کئی سالوں کی انتھک کوششوں کی بدولت 2003ء میں پاکستان میں پہلی اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے جبکہ بھارت میں 6 اردو یونیورسٹیاں کام کررہی ہیں۔

کوئی بھی قوم اپنی زبان' تہذیب وثقافت سے پہچانی جاتی ہے۔یہی وجہ تھی کہ تخلیق پاکستان کے فورا بعد گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظم نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں دس لاکھ سے زائد عوام کے سامنے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ صرف اورصرف اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی مگر جس طرح قائداعظم کے اصولوں' ان کے احکامات و ہدایات سے انحراف کیا گیااورنوکرشاہی نے اپنے من پسند فیصلے کئے۔نوکرشاہی نے قائداعظم کے احکامات سے نافرمانی کرتے ہوئے اردو کو قومی زبان کا درجہ نہیں دیا۔ان عناصر نے قدم قدم پر قومی زبان کی ترقی و ترویج میں رکاوٹیں کھڑی کیں بلکہ دو فیصد مراعات یافتہ طبقہ نے اردو زبان کی ملی وقومی حیثیت سے بار بار انکار کیا۔اردو زبان کو نشانہ تنقید بنانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو صرف قومی زبان ہی نہیں بلکہ یہ پاکستان میں بسنے والی تمام قومیتوں اور چاروں صوبوں کے درمیان رابطے کی واحد زبان ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تکمیل پاکستان میں اردو زبان کے ناقابل فراموش کردار کا ذکر یوں کیا تھا ''قصر پاکستان کی بنیاد میں پہلی اینٹ اردو نے رکھی'' جبکہ ممتاز محقق ودانشور' ناطق لکھنوی نے اردو زبان کے بارے میں فرمایا تھا کہ'' اردو کو ایک ایسا سرچشمہ تصور فرمایئے جو

شمالی ہند کے پہاڑوں سے جاری ہوا۔ دہلی میں آ کر دریا بنا' اس دریا سے بیسیوں شاخیں نکلیں۔ ایک بنگال کو گئی' ایک بہار کو' ایک اودھ اور ایک گجرات کو' یہاں یہ شاخ مقام دکن میں پھیل کر ایک سمندر بن گئی۔ اودھ میں جو شاخ پہنچی اس کے پانی کو تمام ہندوستان خصوصاً آگرہ اور دہلی کے ادیبوں اور شاعروں نے جمع ہو کر لکھنو میں صاف کیا اور صاف کر کے تمام ملک میں نہریں دوڑا دیں''۔ اردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت اور اہمیت کے باوجود پنجاب کے جو دانشور اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکاری ہیں وہ اردو زبان سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''پنجابیوں نے اردو زبان اپنالی اور اپنی تاریخ کو بھلا دیا۔ جب تک وہ اپنی زبان بولتے اور اس میں سوچتے رہے وہ راجہ پورس کے جذبہ مزاحمت کے وارث رہے'' بانیان پاکستان اور قائداعظم کے بااعتماد رفیق کے بارے میں کہا'' جاگیرداروں کے سرغنہ لیاقت علی خان نے اردو کو سرکاری زبان قرار دلوایا'' اس طرح کی بات کرنے والے دانشوروں کو اپنی زبان کی گرامر اور رسم الخط نہ ہونے کا شدید احساس ہے اور اسی احساس کمتری کی وجہ سے دیوناگری اور گورمکھی زبان کو اپنی زبان کہہ رہے ہیں اور انہیں یہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔

> ''اس نے پنجابی قومیت کی بنیادیں ڈھادی تھیں پھر دیوناگری' فارسی اور گورمکھی رسم الخط کے حوالے سے اس نے پنجابی ہندو' پنجابی مسلم اور پنجابی سکھ کو تقسیم کر دیا تھا۔
>
> اس سرزمین نے ہندومت کے شیو جی جیسے دیوتا بھی عطا کئے ہیں۔ سکھ مذہب کے بانی گورونانک اور احمدیت کے بانی مرزا غلام احمد بھی پیدا کئے ہیں۔''

ہندو' سکھ اور احمدیوں پر فخر کرنے والے کیا اسلام کے علمبردار کہلانے کے حقدار ٹھہر سکتے ہیں؟ سکھ شاہی کی گورمکھی اور ہندوؤں کی دیوناگری پر فخر کرنے والے اس حقیقت سے شاید واقف نہیں کہ اردو زبان کے مقابلے میں گورمکھی پنجاب سے باہر چند ہزار لوگ ہی بولتے اور سمجھتے ہوں گے۔ گورمکھی اور دیوناگری کی بات کرنے والوں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ پنجاب کے

مسلمانوں کی قومی زبان تو فارسی اور اردو ہی تھی۔ پنجاب کے مسلمان تو اس پنجابی زبان سے قطعی ناواقف تھے جسے گورمکھی یا دیوناگری رسم الخط کہا جاتا ہے۔ حنیف رامے نے ''پنجاب کا مقدمہ'' اردو زبان میں لکھا کر از خود اردو کی علم گیر حیثیت کو تسلیم کرلیا ہے۔ جس کی مخالفت انہوں نے کتاب کے ابتدایہ سے لے کر اختتام تک کی ہے۔ اگر پنجابی زبان کی گرامر اور پنجابی رسم الخط ایسا ہے جو پنجاب کے مسلمان قیام پاکستان سے پہلے استعمال کرتے تھے اور وہ رسم الخط اب بھی مقبول عام ہے تو پھر رامے صاحب کو اصولی طور پر'' پنجاب کا مقدمہ'' پنجابی رسم الخط اور پنجابی گرامر میں لکھنا چاہیے تھا۔ فیض احمد فیض' حفیظ جالندھری' سعادت حسن منٹو' احمد فراز' ن۔م۔ راشد' ناصر کاظمی' منیر نیازی' کشور ناہید' قتیل شفائی اور حبیب جالب کا شمار اردو ادب کے ممتاز اور نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ یہ شعراء اور ادیب ہمارے ملک کا قومی اثاثہ ہیں ان شعراء حضرات کو پاکستان سمیت دنیا بھر میں جو عالمگیر شہرت اور عزت ملی وہ یقیناً ان کی اردو شاعری کی وجہ سے ملی۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں اردو زبان بولی اور پڑھی جاتی ہے وہاں وہاں ان ممتاز اور مایہ ناز شعراء کا کلام پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ اگر ان شعراء کی تمام شاعری پنجابی زبان میں ہوتی تو انہیں دنیا بھر میں وہ مقام اور مرتبہ ہرگز نہ ملتا جو آج انہیں حاصل ہے۔'' فیض احمد فیض' حفیظ جالندھری' احمد فراز' منیر نیازی' قتیل شفائی اور حبیب جالب کی شاعری میں سے اگر اردو شاعری نکال دی جائے تو ان کی شاعری میں باقی کیا رہ جائے گا؟''

حنیف رامے اور فخر زمان جیسے دانشوروں کو یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جب بھارت جیسا ملک اردو کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے تو آپ جیسے چند دانشور مل کر اردو کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ آپ اس خیال کو اپنے دل اور ذہن سے نکال دیں کہ اردو زبان کسی صوبے' کسی دانشور' کسی شاعر یا ادیب کی محتاج تھی۔ اردو پاکستان کی ضرورت تھی' ضرورت ہے اور ضرورت رہے گی۔ حنیف رامے اور فخر زمان اینڈ کمپنی کی الزام تراشی اور ایذا رسائی سے اردو زبان کی عالمگیر حیثیت میں ذرا برابر بھی کم نہیں آئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ان دانشوروں کو پاکستان بھر کے

سنجیدہ اور باشعور ادبی حلقہ میں جگ ہنسائی کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب کے جو دانشور ہندوستان کے سکھوں اور ہندوں کے ساتھ مل کر جس زبان اور رسم الخط کے فروغ کی بات کر رہے ہیں ان دانشوروں کو یاد رکھنا چاہیۓ کہ اس قوم میں مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے ظالم حکمران نے جنم لیا تھا۔ جس نے مسلمانوں پر انتہائی مظالم ڈھائے جسے کوئی بھی باضمیر اور باشعور انسان کبھی فراموش نہیں سکتا۔ پنجاب کا جو دانشور طبقہ ماضی کی تلخ تجربات کو بھلا کر سکھوں کے ساتھ مل کر گورمکھی زبان کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ اسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا وہ دور حکومت یاد رکھنا چاہیۓ جب سکھ مسلمانوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ اکبر کی بجائے گورو نانک کا نام لیں۔ ہر مسلمان کو ''سوردا بچہ'' کہتے تھے۔ اکثر مساجد میں سور اور کتے باندھے جاتے تھے۔ ہر سکھ قانوناً مجاز تھا کہ وہ مسجد میں زنا کر سکتا ہے۔ سکھ مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہو جاتے اور باورچی خانوں میں جا کر سالن کی پکتی ہوئی ہانڈیوں میں سور کی ہڈی ڈال کر تمام کھانا خراب کر دیتے تھے۔ مسلمان عورتوں کے ساتھ جو سلوک چاہتے تھے' کرتے تھے۔

اس پرآشوب دور میں صوبہ سندھ سکھ حکمرانوں کی دست برد سے محفوظ رہا۔ یہاں اخلاقیات کا ڈھانچہ اتنا مضبوط تھا کہ کسی کی ریشہ دوانیاں کامیاب نہ ہو سکیں۔ یہاں کے لوگ جہاد اور حریت پسندی کے جذبات سے سرشار تھے۔ جب حضرت شاہ اسماعیل سکھوں کے خلاف جہاد کی غرض سے سندھ سے گزرے تو ایک روحانی خانوادے کے سربراہ نے جہاد میں شمولیت چاہی' شاہ اسماعیل نے اس مجاہد بزرگ کے سر پر اپنی پگڑی اتار کر باندھ دی۔ اس دن سے اس خانوادہ کے سربراہ کو پیر پگارا کہا جانے لگا۔ سندھیوں کی دفاعی اور مزاحمتی جرات اور بہادری کا یہ حال تھا کہ رنجیت سکھ کے ناپاک قدموں سے سندھ محفوظ رہا۔ رنجیت سنگھ سندھ کو فتح کرنے کا تصور بھی نہ کر سکا۔ جو حضرات پنجاب میں رنجیت سنگھ کی قیادت پر فخر کرتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ:

''قیادت آسمانوں سے نازل نہیں ہوا کرتی' زمین سے اگتی ہے۔ پیغمبروں پر وحی بے شک آسمانوں سے نازل ہو جائے' یا وہ معراج کی صورت آسمانوں تک بلند

ہو جائیں بہر حال وہ بھی زمین ہی پر پیدا ہوتے ہیں تاریخی طور پر پنجاب میں قیادت کا
فقدان نہیں رہا۔ یہاں پورس سے لے کر رنجیت سنگھ تک سیاسی قیادت بھی رہی ہے۔''

انہیں رنجیت سنگھ کے 50 سالہ عہد اقتدار کو یاد رکھنا چاہئے جب رنجیت سنگھ نے پنجابی مسلمانوں کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ اس نے بے شمار مساجد کو مسمار کیا' انہیں بارود خانوں اور اصطبلوں کے طور پر استعمال کیا گیا۔ لاہور کی شاہی مسجد بھی بارود خانے اور اصطبل کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ لاہور میں مسجد مستی دروازہ' سنہری مسجد' مقبرہ جہانگیر' مقبرہ آصف جاہ' مقبرہ نور جہاں' مقبرہ شہزادہ پرویز' مسجد وزیر خان' مزار سید اسحاق' شاہ بدر کا محلہ' سید شاہ مشرق کا محلہ' قبور تکیہ انبلی والا' مقبرہ و مسجد مرزا خواجہ محمد سعید لاہوری' مقبرہ شیخ عبدالرزاق' روضہ خواجہ خاوند' مدرسہ و خانقاہ اسماعیل اور محلہ لنگر خان واقعہ مزنگ آبادی اور دیگر بہت سی عمارتوں کو مسمار کیا اور انہیں نقصان پہنچایا۔ انہیں بارود خانوں اور اصطبلوں کے طور پر استعمال کیا۔ اس دور میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی نہیں تھی حتیٰ کہ وہ اذان بھی نہیں دے سکتے تھے' ان سے بیگار لی جاتی تھی۔ معاشرتی طور پر انہیں نہایت ادنیٰ درجہ دے دیا گیا تھا۔ ہر سکھ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ 1848ء میں جب انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کیا تب مسلم رعایا کو سکھا شاہی سے نجات ملی انہوں نے اطمینان و سکون کا سانس لیا۔ اس کا ثبوت اس رپورٹ سے بھی ملتا ہے جو اپریل 1901ء میں لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ

''جو سختیاں مسلمانان ہند پر پہلے عہدوں میں اور خاص کر مسلمانان پنجاب پر سکھوں کے زمانے میں ہوئیں ان کی ابھی تک ہمارے بزرگ (جو اس وقت موجود تھے) گواہ ہیں' مسلمانوں کو چین سے بیدر ہونا تو درکنار نماز پڑھنے تک کی اجازت نہیں تھی۔ جہاں کسی مسلمان نے اذان دی سکھوں کا جھگڑا شروع ہو گیا اور پکڑ کر بے چارے مسلمانوں کے تکے اور بوٹیاں اڑا دیں۔ چمڑی ادھیڑ دی۔ غرضیکہ ایسے ایسے عذاب مسلمانوں کو پہنچے تھے جن کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہزار

ہزار شکر ہے خدا کی جناب کا کہ اس نے ہم ضعیف الخلقت لوگوں کو جن میں تھوڑا بہت ایمان ہے' ان سختیوں سے رہا کر کے ایسی عادل اور منصف حکومتوں کے ماتحت کر دیا ہے کہ جسے خود ہماری ترقی کا خیال رہتا ہے اور باوجود مختلف مذاہب ہونے کے ہمیں ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے"

10 جولائی 1900ء کو قادیانی فرقہ کے بانی مرزا غلام احمد نے بھی پنجاب میں سکھا شاہی کے مسلمانوں پر مظالم کے بارے میں لکھا تھا:

"مسلمانوں کو ابھی تک وہ زمانہ نہیں بھولا جب وہ سکھوں کے ہاتھوں ایک دہکتے ہوئے تنور میں مبتلا تھے اور ان کے دست تعدی سے نہ صرف مسلمانوں کی دنیا تباہ تھی بلکہ ان کے دین کی حالت اس سے بدتر تھی۔ دینی فرائض ادا کرنا تو درکنار بعض اذان کہنے پر جان سے مارے جاتے تھے۔ پھر 1875ء میں انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی کے دوران سکھوں نے انگریزوں کی بھرپور امداد کی اور انہوں نے دہلی اور اس کے گردونواح میں مسلمانوں کا جی بھر کر قتل عام کیا تھا۔ لاہور کے مسلمانوں کو 1935ء میں تاریخ کے یہ نہایت تلخ واقعات اچھی طرح یاد تھے اور ان دنوں ان کی سیاسی' معاشرتی اور معاشی حالت بھی نہایت خستہ تھی۔ بے شمار تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان بے روزگار تھے۔ ان کے لئے زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ آئے دن ریل گاڑی کے نیچے آ کر یا دریا میں ڈوب کر خودکشی کرتے تھے۔"

پنجاب کے باشندوں کو ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا خاص طور سے احسان مند رہنا چاہئے کہ انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کو پنجابی سکھ اور پنجابی ہندو کی جارحیت' استحصال اور غلامی سے آزاد کرایا۔ اگر کوئی "پنجابی قومیت" کے ڈھا جانے اور زمین بوس ہو جانے' پنجابی ہندو' پنجابی سکھ اور پنجابی مسلمان پر مشتمل پنجابی قوم پرستی کے بت کے ٹوٹنے کا غم کرتا ہے تو وہ درحقیقت دو قومی نظریہ سے انحراف اور انکار کر کے پاکستان کے وجود کو تسلیم کرنے

سے انکار کرتا ہے۔ کیونکہ پاکستان کی تخلیق دوقومی نظریہ کے بطن سے ہوئی تھی اس ہی دوقومی نظریہ کے تحت برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے مذہب' عقیدے' ثقافت وتہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔

گورمکھی زبان

سکھوں نے دیوناگری رسم الخط سے ایک رسم الخط اخذ کیا جسے گورمکھی رسم الخط بھی کہا جاتا ہے اس زبان کے بارے میں ادب میں کسی سمت اور جہت کا پتہ نہیں چلتا۔ حتیٰ کہ ہندوستان مین جن سکھ قلم کاروں کو شہرت ملی وہ بھی اردو زبان میں شاعری اور افسانوں کی وجہ سے ملی۔ جس زمانے میں پنجاب میں مکمل طور پر یونینسٹ پارٹی کی شکل میں ایک پنجابی حکومت موجود تھی' اس وقت بھی پنجاب کی سرکاری زبان پنجابی نہیں تھی۔ حنیف رامے اور فخر زمان کو اردو بولنے والوں پر تنقید کرنے کی بجائے پنجاب کی یونینسٹ حکومت اور اس کی باقیات کو تنقید کا نشانہ بنانا چاہئے تھا جنہوں نے پنجاب میں مکمل پنجابی حکومت کے باوجود صوبے میں پنجابی زبان کو قومی زبان کا درجہ نہیں دیا۔ جس زمانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب کا بااختیار حکمران تھا اس نے بھی گورمکھی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا تھا۔ اس دور میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ اس کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے۔

> رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں ایک گیانی جی سکھ ریاست میں فارسی کی جگہ گورمکھی کو سرکاری زبان بنوانا چاہتے تھے۔ سکھ گورمکھی سے اپنی فطری وابستگی کی بناء پر گیانی جی کے پروپیگنڈے سے متاثر ہورہے تھے۔ رنجیت سنگھ کو جب اس صورتحال سے آگاہ کیا گیا تو اس نے اپنے مخبروں اور درباریوں کی توقعات کے برعکس گیانی جی کو سزا دینے کی بجائے انہیں قلعہ میں شاہی ضیافت پر مدعو کرلیا۔ گیانی جی مہاراجہ کی طرف سے ناقابل تصور عزت افزائی کے نشے میں سرشار ہو کر دعوت میں شریک ہوئے۔

فراغت طعام کے بعد رنجیت سنگھ نے گیانی جی کے مطالبے کی نہ صرف تائید کی بلکہ ان کی جرات و ہمت پر مسرت کا اظہار بھی کیا لیکن اس سے قبل کہ وہ سپاس گزاری کے بعد قلعہ سے رخصت ہوتے رنجیت سنگھ نے عہد سلاطین اور شاہان مغلیہ کے فرامین دکھا کر گیانی جی کو حکم دیا کہ وہ کسی چھوٹے سے فرمان کا گورمکھی میں ترجمہ کریں۔ گیانی جی کوشش کے باوجود تعمیل حکم سے قاصر رہے تو رنجیت سنگھ نے گیانی جی کو برہنہ کر کے گدھے پر سوار کرا کے سارے شہر میں گشت کرایا اور رنجیت سنگھ کے حکم کے مطابق شہر کے نوجوان اور لڑکے گیانی جی کی شاہی سواری کے جلو میں یہ نعرے لگاتے رہے کہ ''یہ گورمکھی کو سرکاری زبان بنانے والے کی سزا ہے''

(حوالہ: سندھ کا مقدمہ۔ شکیل احمد ضیاء)

حنیف رامے کو اردو دان طبقہ سے یہ بھی شکایت ہے کہ انگریزوں نے آتے ہی 1850ء میں پنجابی زبان کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اردو دان طبقہ سے شکایت کرنے کی بجائے یہ گلہ ان انگریز حکمرانوں سے کرنا چاہئے تھا جس نے پنجاب کو برصغیر کا بازوئے ''شمشیرزن'' کا قابل فخر و عزت لقب دیا۔ جہاں تک سوال پنجابی زبان ختم کر کے اردو زبان کو سرکاری زبان بنانے کا ہے۔ اس بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ پنجاب کی سرکاری زبان پنجابی نہیں تھی بلکہ متحدہ ہندوستان کی سرکاری زبان اردو اور فارسی تھی جو تمام قومیتوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے حالات وکوائف' تہذیب وتمدن' ثقافت و معاشرت سے بہرہ ور ہونے اور وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے سے رابطے کے لئے اردو سے بہتر کوئی اور زبان اس کام کی صلاحیت نہ رکھی تھی اس لئے ہندوستان میں اردو زبان کی ضرورت اور صلاحیت کا اندازہ کرتے ہوئے 1834ء میں فارسی کی بجائے اردو کو دفتری زبان قرار دینے کا انقلابی فیصلہ کیا گیا۔ یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین رکھا جائے کہ اردو کو بلند و بالا اور بین الاقوامی مقام دلانے میں ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی خداداد صلاحیتوں اور شب و روز محنت کا دخل رہا ہے۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء جن میں اردو کے عناصر خمسہ شامل ہیں' انہوں نے اردو نثر کو بامحاورہ زبان' سلاست و

روانی، سادگی و دلکشی، حلاوت و لطافت سے ایک نئی زندگی بخشی۔ سرسید احمد خان کی ہی علمی و فکری کاوشوں کی بدولت جدید نثر اردو کا آغاز ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی، نواب محسن الملک اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے مخصوص انداز تحریر نے نثر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور مولانا راشد الخیری کے ناول، سلطان حیدر جوش کے افسانے، امانت لکھنوی کے ڈرامے، اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اردو نثر کی تمام مروجہ اصناف پر تخلیق، تحقیق، تنقید، ترجمہ اور تالیف کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ ناول نگاری، افسانہ خواں، ڈرامہ نویس، تزکرہ نگار، مورخ، محقق نقادان مشاہیر ادب اور اکابر فن میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ سلیمان ندوی، قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محی الدین قادری، نصیر الدین ہاشمی، عبدالقادر سروری، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، احتشام حسین، خواجہ حسن نظامی، مجنوں گورکھپوری، چراغ حسن حسرت، صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عندلیب شادانی کے نام تاریخ ادب اور فروغ اردو میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے۔ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان شعراء اور ادباء نے صرف اردو زبان کو بین الاقوامی مقام ہی عطا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اردو زبان کے ذریعہ مسلمانوں میں جذبہ آزادی، اور جذبہ حریت بیدار کیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، سید احمد بریلوی، نواب وقار الملک، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز اور حاجی شریعت اللہ وغیرہ نے مسلمانوں کی حمیت و غیرت کو جگایا۔ میر درد، میر تقی میر، داغ دہلوی، مومن خان مومن، مرزا اسد اللہ غالب، میر انیس، سید انشاء اللہ خان انشاء، شیخ امام بخش ناسخ اور نظیر اکبر آبادی جیسے شعراء نے نہ صرف اپنا خون جگر پلا کر اردو شاعری کو وہ مقام دیا کہ تاقیامت ان کا نام زندہ رہے گا۔ ان شعراء نے اپنے کلام میں جابجا برصغیر ہند کے مسلمانوں کی پستی و تنزلی پر دکھ و غم کا اظہار کیا اور کچھ کر گزرنے کی ان میں تحریک پیدا کی۔

کوٹھے اور پان کا کلچر

نامور دانشور فخر زمان نے اردو زبان کے بارے میں ''کوٹھے اور پان کا کلچر'' جیسے

الفاظ استعمال کر کے اردو دان طبقہ کی زبان، ثقافت، تہذیب اور کلچر کی تذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں پنجاب کے عوام، دانشوار، اہل قلم اور سیاستدانوں سے تہہ دل سے معذرت کے ساتھ صرف اور صرف فخر زمان کو اس بے ہودہ الزام کا جواب دینے سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر کسی پر پتھر پھینکنا ہرگز عقل مندی نہیں۔ پنجاب کے دانشور فخر زمان کو جواب سندھ کے نامور دانشور اور محقق پیر علی محمد راشدی کی کتاب ''فریاد سندھ'' کے اس اقتباس سے دینا چاہوں گا۔

''کسی ملک یا قوم کے اخلاق پر نکتہ چینی کرنا نہایت نازیبا حرکت ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور خراب بھی۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اکثریت کا رجحان طبیعت کس طرف زیادہ ہے اور اس کی اخلاقی احساسات کی کیفیت کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم انتہائی مجبوری کے عالم میں فقط اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ سب سے زیادہ بے ہودگی کہاں ہے۔ سندھ میں سب سے زیادہ طوائفیں کس صوبے نے بھیجی۔ طوائفوں کی باقاعدہ بستیاں اور طوائفوں کے کالج کس صوبے میں ہیں۔ سارے ہندوستان کی رنڈیوں اور طوائفوں کی مردم شماری کرائی جائے تو پھر بیٹھ کر دیکھا جائے کہ ان کی اکثریت کس صوبے سے آتی ہے۔ آخر میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ مشرق کا پیرس کس شہر کو پکارا جاتا ہے۔

پنجابیوں کے سندھ پر صرف دو احسان ہیں

1۔ پنجابی طوائفوں نے سندھ میں وارد ہو کر اپنی ٹھمریوں اور بھریوں سے زمینداروں اور خاندانوں کا خانہ خراب کیا۔

2۔ پنجابی پولیس افسران نے سندھی افسروں کو بھی اعلیٰ پیمانے پر رشوت خوری کا ہنر سکھایا۔ سندھ کو خود بھی لوٹا اور دوسروں سے بھی لٹوایا۔''

(حوالہ: سندھ دوراہے پر)

فخر زمان نے اردو کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے مزید فرمایا تھا کہ ''اردو خوشامدیوں اور جی حضوریوں کی زبان ہے'' ہم کسی بھی زبان کو تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہتے اور نہ ہی

کسی زبان اور تہذیب پر بے بنیاد الزام تراشی کر کے کسی کی زبان کی حیثیت اور مرتبہ کو کمتر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی زبان اپنی قوم وتہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ پنجاب کے جن دانشوروں نے اردو کے بارے میں خوشامدی اور جی حضوری کی بات کی ہے اس کا جواب تحریر کرتے ہوئے اتنا ہی کہوں گا کہ یہ تو زبان استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ زبان کا استعمال کب' کہاں اور کیسے کرتا ہے۔ فخر زمان کو یاد ہوگا کہ پنجاب کے جاگیردار' سیاستدان' مشائخ' اور سجادہ نشین اہل پنجاب کی نمائندگی کرتے ہوئے انگریز حکمرانوں کی خدمت میں عرض داشت پیش کرتے تھے اور ان عرض داشت میں انگریزوں کی خوشامد' چاپلوسی اور جی حضوری کے لئے' عرض فیض باریافتگان پابزسر پر سلطانی' ظل یزانی' آیت دولت جاودانی' عدل وانصاف اور جہانبانی' منبع اعلیٰ حضرت شہنشاہ عالی جاہ' عالم پناہ' سلیمان زمان' جمشید جہاں' جناب معلی القاب فیض ماب' صاحب استقلال' بیدار مغز اور عالی ودماغ حاکم' رعایا بہ ادب ونیاز پایۂ تخت اعلیٰ حضرت شہنشاہ جہاں پناہ منبع فیوض وبرکات کو بوسہ دیتے ہوئے' جیسے الفاظ اور زبان استعمال کی جاتی تھی۔

فخر زمان کا یہ بھی خواہش ہے کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان نہیں ہونا چاہئے۔ اگر اردو زبان کی جگہ کوئی دوسری زبان چاروں صوبوں میں بولی اور پڑھی جاتی اور چاروں صوبوں کی عوام میں رابطے کا واحد ذریعہ ہوتی تو آپ کو اور آپ جیسے دانشوروں کو اردو زبان کی قومی حیثیت ختم کرنے کا یوں مطالبہ نہیں کرنا پڑتا بلکہ یہ کام آپ کب کا کر چکے ہوتے جس طرح ماضی میں عوامی رائے عامہ کی اجازت کے بغیر کراچی سے دارالحکومت کو اسلام آباد منتقل کیا گیا اور پھر جس طرح چھوٹے صوبوں کے احتجاج اور مخالفت کے باوجود ون یونٹ قائم کیا۔ آپکی یہ مجبوری ہے کہ اردو زبان کے سوا پاکستان میں ایسی کوئی زبان موجود نہیں جو اس کی جگہ لے سکے۔ لہٰذا اردو زبان کو قومی زبان کی حیثیت سے قبول کرنا آپ جیسے دانشورں کی مجبوری ہے۔ مگر ہر محب وطن پاکستانی اردو بولنے پر فخر کرتا ہے۔



ضمیمہ جات

اقبال کے خطوط

Dr. Sir Mohd Iqbal Kt.
M.A., Ph.D
Barrister-at-Law

Lahore
4th March 1934.

My dear Mr Thompson

I have just received your review of my book. It is excellent and I am grateful to you for the very kind things you have said of me. But you have made one mistake which I hasten to point out as I consider it rather serious. You call me (a) protagonist of the scheme called "Pakistan". Now Pakistan is not my scheme. The one that I suggested in my address is the creation of a Muslim Province—i. e. a province having an overwhelming population of Muslims in the North west of India. This new province will be, according to my scheme, a part of the proposed Indian Federation. Pakistan scheme proposes a separate federation of Muslim Provinces directly related to England as a separate dominion. This scheme originated in Cambridge. The authors of this scheme believe that we Muslim Round Tablers have sacrificed the Muslim nation on the altar of Hindu or the so called Indian Nationalism.

Yours sincerely,

Mohammad Iqbal.

---

* آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ جان تھامسن (Edward John Thompson) اور اقبال کے مابین ۳۴-۱۹۳۳ء کے دوران خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ای۔ جے۔ تھامسن کے بیٹے پروفیسر ای۔ پی۔ تھامسن نے ۱۹۷۸ء میں اپنے دورۂ بھارت کے دوران یہ خطوط شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر عرفان حبیب کے حوالے کر دیئے اور ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ان کی اشاعت کی اجازت بھی دے دی۔ چنانچہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے پروفیسر ایس۔ حسن۔ احمد نے ان خطوط پر اپنا تبصرہ شامل کر کے انہیں کتابی صورت میں ۱۹۷۹ء میں علیگڑھ سے شائع کر دیا۔ ان خطوط کے عکس Facsimile بھی ہمراہ ہیں۔

6th March, 1934.

My dear Raghib,

I think it best to write to Fazil Rahmat-ullah and I will do so. But you should ask Mr. Shafi Daudi to draft a letter and send it on to me. It should be signed by both of us.

I hope you will send me your detailed views about democracy and constitution as soon as possible.

I am enclosin g two copies of Edword Thompson's (a well- known literary man in England) review of my book. It is interesting in many ways and you may like to publish it in your paper. Please send the other copy to the Star of India (Calcutta).

Please also note that the author of this review confuses my scheme with "Pakistan". I propose to create a Muslim province within the India Federation, the Pakistan scheme proposes a separate federation of muslim provinces in the North West of India outside the Indian Federation and directly related to England.

Do not fail to point it out in your introductory comments and draw the attention of the editor of Star of India also to this point.

Hoping you are well.

Yours sincerely,

Mohammed Iqbal,
Lahore

۶ مارچ ۱۹۳۴ء

عزیز من راغب!

میرا خیال ہے یہ بات زیادہ مناسب ہو گی کہ میں فاضل رحمت اللہ سے سلسلہ جنبانی کروں اور یہی کروں گا۔ لیکن آپ شفیع داؤدی صاحب سے فرمائیں کہ وہ اپنا خط تحریر فرما کر مجھے ارسال کر دیں اس خط پر ہم دونوں کے دستخط ہوں گے۔

مجھے توقع ہے کہ آپ مجھے، جمہوریت اور آئین کے بارے میں اپنے خیالات سے جلد از جلد آگاہ کریں گے۔

Edword Thom Son

میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈورڈ تھامسن کا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ ایڈورڈ تھامسن انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت ہیں۔ یہ تبصرہ، مختلف وجوہ کی بنا پر؛ دلچسپ ہے اور شاید یہ تبصرہ آپ کے جریدہ میں اشاعت کے لیے مناسب ہی رہے۔ دوسری کاپی "اسٹار آف انڈیا" (کلکتہ) کو روانہ کر دیجئے۔

براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ اس تبصرہ کا مصنف اس مغالطہ کا شکار ہے کہ جیسے میری تجویز پاکستان کی اسکیم سے تعلق رکھتی ہے۔

جہاں تک میری تجویز کا تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے جبکہ پاکستان اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال و مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علیحدہ ہو اور انگلستان سے براہِ راست وابستہ ہو۔

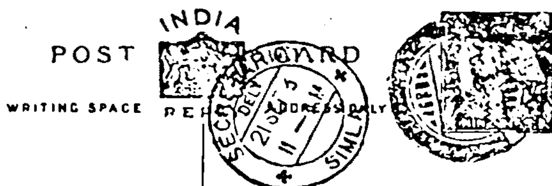
آپ اپنے تعارفی کلمات میں اس نکتہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ "اسٹار آف انڈیا" کے مدیر کی توجہ بھی اس نکتہ کی جانب منعطف کروا دیجئے گا۔

خدا کرے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

[illegible]



M. Rashid Ahsan Esq. M.A
10, D Block,
J. C. Barrack,
Cart Rd.,
Simla

ڈیر راغب صاحب —

آپ کا خط ابھی ملا ہے - میں بھی خدا کے فضل سے
اچھا ہوں - چند روز تک بھوپال جاؤں گا - مسلم کانفرنس اور لیگ کے
متعلق جو طرز عمل آپ چاہیں اختیار کریں - میں خود اُن سے علیحدہ ہوں
اگرچہ باقاعدہ استعفےٰ نہیں دیا ہے - آپ کا خط میں نے انجمن خدام الدین
کے ہاں بھجوا دیا ہے - وہ آپ کو مطلوبہ کاپیاں بھجوا دیں گے - ایک اس
سے پہلے آپ کو بھجوا چکے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے وہ کاپی آپ تک نہیں پہنچی فقط

محمد اقبال - ۵ فروری ۳۶ء

لاہور

غنی

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد؟ — صید را سودائے صیّادی کہ داد؟

آں برہمن زادگانِ زندہ دل — لالۂ احمر ز روئے شاں خجل!

تیز بین و پختہ کار و سخت کوش — از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش!

اصلِ شاں از خاکِ دامنگیرِ ماست! — مطلعِ ایں اختراں کشمیرِ ماست!

خاکِ ما را بے شرر دانی اگر — بر درونِ خود یکے بکشا نظر!

ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست؟ — ایں دمِ بادِ بہاری از کجاست؟

ایں ہماں باد است کز تاثیرِ او
کوہسارِ ما بگیرد رنگ و بو!

ہیچ می دانی کہ روزے در وُلر — موجۂ می گفت با موجِ دگر

وُلر۔ دریاچہ معروف در کشمیر

کتابیات

نام کتاب	مصنف
پاکستان کیوں ٹوٹا	ڈاکٹر صفدر محمود
سندھی وڈیرے	وکیل انجم
سیاستدانوں کی قلابازیاں	وکیل انجم
روداد چمن	پیر علی محمد راشدی
آوازحق (کالم)	الطاف حسین
مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء	زاہد چوہدری
پاکستان اور فوج	عبداللہ ملک
پاکستانی سیاست	ڈاکٹر حیدر رضا صدیقی
کراچی تاریخ کے آئینے میں	محمد عثمان رموہی
پاکستانی فوج کی ابتداء	عبداللہ ملک
سیاست کے فرعون	وکیل انجم
تحریک پاکستان میں علماء کا سیاسی وعلمی کردار	ڈاکٹر ایچ بی خان
مسلمانان سندھ کی تعلیم	سید مصطفیٰ علی بریلوی
اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ	ڈاکٹر وفا راشدی
سندھ نگر	پروفیسر ایم انوار رومان
سندھ ساگر	اعتزاز احسن
اسٹیبلشمنٹ کی سہ جہتی حکمت عملی	الطاف حسین

نام کتاب	مصنف
آزادی کے مجاہد	جنگ پبلشرز
مقدمہ	الطاف حسین کا تاریخی انٹرویو
میرا بھائی	فاطمہ جناح
سید الاحرار	سید اشتیاق اظہر
تحریک پاکستان کی تاثراتی تاریخ	حسنین کاظمی
سندھ دوراہے پر	رشید جمال
ممدوٹ سے وٹو تک	احمد سلیم
اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار	ڈاکٹر طاہر منیر
دس پھول ایک کانٹا	خواجہ افتخار
ایک قدم آگے، دو قدم پیچھے	بیرسٹر ظہور بٹ
پاکستان کی ضرورت کالا باغ ڈیم	پروفیسر ایم اے صوفی
سندھ کے نسلی مسائل	شہزاد منظر
وادی سندھ کی تہذیب اور سندھ پر عربوں کے حملے	حافظ حقانی جہاں قادری
نظم اردو	علامہ ناطق لکھنوی
سفر زندگی	الطاف حسین
سندھ۔خاموشی کی آواز	ڈاکٹر مبارک علی
متحدہ پاکستان کے 20 سال	تفضل حسین
سندھ۔مسئلہ خود مختاری کا آغاز	زاہد چوہدری
بھگت سنگھ	احمد سلیم
سارا ملک منصور	احمد سلیم
لبرٹی (جنوری 1998)	انور شیخ

شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب
پاکستان کے دیہہ خدا	اے۔آر۔شبلی
سندھیوں پر ستم کب تک	قمر بھٹی
• مہاجر قومیت	جاوید احمد صدیقی
کراچی ازم	شبلی پبلی کیشنز
جنگ آزادی 1857	خورشید مصطفیٰ رضوی
زندہ لوگ	خالد اطہر
پنجاب مغلوں کے بعد زوال میں	چوہدری وزیر احمد
اقبال کے آخری دو سال	ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی
مارشل لاء سے مارشل لاء تک	سید نور احمد
باقیات اقبال	رضیہ فرحت بانو
سندھ تاریخ کے آئینے میں	اکیف ڈی ایف
ریاست اور طبقات (کتابی سلسلہ نمبر 3)	حمزہ علوی
• کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں	پروفیسر عزیز الدین
• اردو قومی یکجہتی اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
• سندھ خاموشی کی آواز	ڈاکٹر مبارک علی
ہاری رپورٹ	مسعود کھدر پوش
• اردو اور سندھ کے لسانی روابط	شرف الدین اصلاحی
• کراچی میں اردو	صفیہ نور چانڈیو
• ولی خان اور قرارداد پاکستان	محمد فاروق قریشی
• سندھ کی بمبئی سے علیحدگی	جی ایم سید

نام کتاب	مصنف
جدید اردو ادبیات	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
پاکستان کی نظریاتی تاریخ	محمد آصف ملک
پاکستان کیسے بنا	زاہد چوہدری
مولانا احتشام الدین کی آپ بیتی	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری
پاکستان کی تعمیر نو	صفدر حسن صدیقی
ایجنسیوں کی حکومت	اظہر سہیل
تاریخ پاکستان و ہند	ممتاز ارم حسین
تحریک آزادی کشمیر اور جماعت احمدیہ	شیخ عبدالماجد
تحریک آزادی میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر معین الدین عقیل
شہید ملت لیاقت علی خان کے فرمودات	
مسئلہ کراچی اسباب و حل	رشید جمال
منزل پاکستان	حسنین کاظمی
خطبات اقبال	رضیہ فرحت بانو
باقیات اقبال	سید عبدالواحد معینی
سرود رفتہ	غلام رسول مہر۔ صدیق علی دلاوری
ذکر اقبال	عبدالمجید سالک
اسکندر مرزا ایک صدر کا عروج و زوال	احمد سلیم
پاکستان: تاریخ و سیاست	ڈاکٹر صفدر محمود
جاوید نامہ	محمد اقبال
اقبال۔ جہان دیگر	محمد فرید الحق
کراچی پیپر	اقبال یوسف

نام کتاب	مصنف
• پنجاب کا مقدمہ	محمد حنیف رامے
تحریک پاکستان میں پنجاب کا کردار	ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری
عہد ساز خواتین	صفیہ ملک
اماں حوا سے اماں کونسلر تک	عارفہ صبح خان
کالا باغ ڈیم	لطیف خان زئی
• سندھ کا مقدمہ	شکیل احمد ضیاء
پانی کی تقسیم اور پاکستان کا مستقبل	فاخر ملک
تحریک آزادی میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر معین الدین عقیل
Struggle for new sindh	G.M Syed
Tradegy of Errors	Lt. Gen (R) Kamal Matinuddin
Language & Politics in Pakistan	Tariq Rahman
Muhajirs of Pakistan	Rashid Jamal
Muslim Politics in Sindh	M. Qasim Somro
Pakistan Almanac 2002	Royal Book Company